معروف کتاب 'Lost Islamic History' کا اردو ترجمہ

فراس الخطیب

گمشدہ اسلامی تاریخ

مسلم تہذیب کے ماضی کی بازیافت

گمشدہ اسلامی تاریخ

گمشدہ اسلامی تاریخ

مسلم تہذیب کے ماضی کی بازیافت

فراس الخطیب

ترجمہ

ارشد رازی

البلاغ پبلی کیشنز

N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۲۵

اشاعت : فروری ۲۰۲۲ء
ناشر : اَلبلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت : ۲۵۰ روپئے

Name of Book : **Gumshuda Islāmi Tārikh:Muslim Tahzeeb ke Māzi ki Bāzyāft** {Urdu translation of 'Lost Islamic History'}
Author : Firas Alkhateeb
Translated by : Arshad Rāzi
Published by : **Al-Balāgh Publications**
Flat No.10, N-1, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025
M. 9971477664
E-mail: abpublications@gmail.com

ISBN : 978-81-956088-3-6

یہ کتاب میری ماں ثنا، بیوی حدیل

اور میری بہن ہدا کے نام

جو میرے لیے اہم ترین لوگ ہیں

بسم الله الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

من سلك طريقا يبتغي فيه علما سلك الله به طريقا إلى الجنة

جو شخص حصولِ علم کی راہ پر گامزن ہو تو اللہ اُس کے لیے جنت کی جانب ایک راستہ کھول دیتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ

فہرست

پیش لفظ

اس کتاب کا مقصد ساتویں صدی کے اوائل میں اسلام کے آغاز سے لے کر دورِ جدید تک، تہذیب کی تاریخ کا عمومی جائزہ پیش کرنا ہے۔ بلاشبہ مسلم تاریخ کو اس کی وسعت اور گہرائی سمیت مفصل اور صحت کے ساتھ بیان کرنا ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس طرح کا کام شاید کبھی ایک جلد میں سمویا نہیں جا سکتا۔ زیرِ نظر کوشش سے میرا مقصد قاری کو مسلم تاریخ کے عمومی بیانیے سے روشناس کروانا ہے۔ یہ کتاب ماہرین یا اسلامی تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسے عام قاری کے لیے ہے جو اس مضمون سے کچھ شناسائی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں امید کرتا ہوں یہ کتاب بہت سے لوگوں کے لیے نقطۂ آغاز ثابت ہوگی جہاں سے مسلم تاریخ و تہذیب کے بھرپور مطالعہ کے امکان پیدا ہوں گے۔ چونکہ یہ ایک تعارفی مواد ہے چنانچہ اس میں نئی تحقیق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا زیادہ تر مواد دوسروں کی تحقیق سے استفادہ ہے۔ زیرِ استعمال رہنے والی کتابیں کتابیات میں دی گئی ہیں اور مضمون کے زیادہ گہرے مطالعہ کا آغاز بن سکتی ہیں۔

میں نے اس کتاب کا منصوبہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں شروع کیا۔ تب میں نے ہائی سکول طالب علموں کو اسلامی تاریخ پڑھانا شروع کی تھی۔ امریکی تعلیمی نظام کی ساخت کی وجہ سے (جو ہیومینٹیز (Humanities) میں عموماً بھی بہت ہلکا ہے) مسلم تہذیب پر میرے زیادہ تر

طالب علموں کی فہم بہت ہی بنیادی نوعیت کی تھی۔ ان کی درسی کتب میں زیادہ تر زور قدیم یونان اور روم پر تھا اور پھر تاریک ادوار کے بعد احیاء العلوم اور روشن خیالی کے ادوار میں سے گزرتے ہوئے بات یورپ کے عروج تک آجاتی تھی۔ اس طرح مسلم تہذیب اور دیگر غیر مغربی تہذیبوں کا ذکر نہ ہونے کے برابر تھا۔ زیادہ تر درسی کتب میں ایک مختصر حصہ آپؐ اور آدھا صفحہ مشرقی یورپ میں عثمانی سلطنت کے لیے وقف کرتے ہوئے چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ کو نمٹا دیا گیا تھا۔

اپنی کلاس کو پڑھاتے ہوئے میرا مقصد طالب علموں کو مسلم تاریخ کے سرمائے سے آگاہ کرنا تھا جس تک ان کی رسائی کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنی تدریس کے دوران نصاب کی اس کمی کو پیش نظر رکھا۔ میرا مقصد تھا کہ تاریخِ یورپ کو تاریخِ عالم کے طور پر پیش کرنے کا کوئی متبادل بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے مسلم تہذیب کے ابھرنے اور انسانیت کے لیے اس کی خدمات کے بیان پر توجہ دی۔ جب مجھے مثبت ردِعمل ملا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میرے طالب علموں میں سے زیادہ تر مختلف مسلم ممالک سے آنے والے تارکین وطن کے بچے تھے۔ میری اس کاوش سے انھیں اپنی تاریخ سے تعلق کا احساس ہوا۔ قدرتی بات ہے کہ ان کے لیے جان لاک اور نپولین کے مقابلے میں ابوحنیفہؒ اور یوسف بن تاشفین جیسی شخصیات کے ساتھ نسبت وابستہ کرنا زیادہ آسان تھا۔

یوں یہ کتاب ''گمشدہ اسلامی تاریخ'' میرے تدریسی نوٹس میں سے نکلی۔ چونکہ انگریزی میں ہائی سکول کی سطح پر اسلامی تاریخ پر درسی کتاب دستیاب نہ تھی چنانچہ یہ کتاب موجود خلا کو جزواً پر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگر میری کلاس سے باہر موجود لوگ بھی اس مواد سے آشنا ہو سکیں جو ان کے ہائی سکول کے تاریخی کورس میں نہیں تھا تو اس کتاب کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

2014ء میں اس کی اولین اشاعت کے بعد سے میں نے خود بھی، بالخصوص اسلامی علوم کا، بغور مطالعہ کیا ہے۔ دراصل اسی دوسرے ایڈیشن کے لیے ہم نے مواد پر نظر ثانی کی ہے اور اسلامی فکر کی تاریخ اور پیش رفت پر ایک باب کا اضافہ کیا ہے۔ مسلم تہذیب کی روح رواں یعنی اسلامی اصول قانون، الٰہیات اور روحانیت ہیں اور اس پر زیرِ نظر کتاب میں وقف چند صفحات سے کہیں طویل بحث ہونی چاہیے لیکن مجھے امید ہے کہ اس میں شامل نیا باب اسلامی علوم پر کچھ روشنی ضرور ڈالے گا۔

کتاب کے اس حصے کے لیے میں شیخ امین کھلواڈیا کا اور دار القاسم کے دیگر اساتذہ کا مشکور ہوں جن کی معاونت کے بغیر میری اسلام فہم ابتدائی درجہ سے آگے نہ بڑھتی۔ مجھے ہرسٹ پبلیکیشنز کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے کتاب کے اصل اور نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن کے لکھنے اور شائع کروانے میں معاونت فراہم کی۔
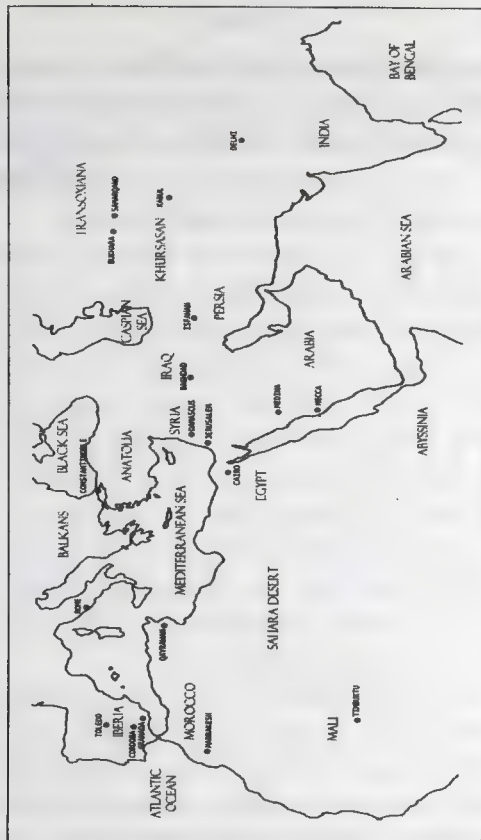
پہلا باب

عرب قبل از اسلام

حجاز کی خشک اور پہاڑی سرزمین کا ماحول کچھ ایسا حیات افزا نہیں ہے۔ جزیرہ نما عرب کے مغربی حصے میں واقع اس خطے کی تعریف بیان کرنا ہو تو دو لفظ ہی کافی ہیں یعنی گرم اور خشک۔ موسم گرما میں یہاں درجہ حرارت ہمیشہ سو درجہ فارن ہائیٹ سے اوپر چلا جاتا ہے اور بارش وغیرہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ مشرق کی طرف بڑھیں تو یہ سرزمین ریت کے ان گنت ٹیلوں سے پٹی نظر آتی ہے۔ یہ علاقہ سبزے یا مستقبل آبادی سے عاری ہے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن یہی وہ بنجر اور بانجھ سرزمین ہے جہاں ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک نئی تحریک ابھری؛ ایک ایسی تحریک جس نے جزیرہ نمائے عرب کے اندر، اور باہر بھی، تاریخ کا رخ بدل دینا تھا۔

جغرافیہ

جزیرہ نما عرب ایشیا کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے اور اس نے دو ملین مربع کلومیٹر کا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ اس خطے کا جغرافیائی وقوع اس اعتبار سے منفرد ہے کہ تین براعظموں یعنی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ محلِ وقوع کی اہمیت کے باوجود اسے بیرونی دنیا نے زیادہ تر نظر انداز کیے رکھا۔ قدیم مصریوں نے صحرائے عرب میں مہم جوئی کرنے کی بجائے اپنی سلطنت کو زرخیز ہلالی اور نوبیا کی

طرف پھیلایا۔ تین سو قبل از مسیح میں ایران اور ہندوستان کی طرف بڑھتا سکندرِ اعظم اس کے پاس سے گزر گیا۔ عظیم رومن سلطنت نے قبل از مسیح کے تیسرے عشرے میں براستہ یمن یہاں گھسنے کی کوشش کی لیکن یہاں کے سخت ماحول میں نہ ڈھل سکی اور جزیرہ نما عرب ان کی سلطنت کا حصہ نہ بنا۔

جزیرہ نما عرب کو نظر انداز کرنے پر شاید ہی کسی کو الزام دیا جا سکے۔ اس کی آب و ہوا تو یہاں کے باسی خانہ بدوشوں کے لیے بھی شاذ ہی مہربان ہوتی ہے۔ خزاں میں مون سون کی ہوائیں جزیرہ نما کے مشرقی ساحلوں پر موسمی بارش لاتی ہیں لیکن تیزی سے بلند ہوتی سطح زمین ان کا زور کم کر دیتی ہے۔ ان کا اثر صحرائے عرب کے اندرون میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بحیرہ روم کی بارشیں شاید ہی کبھی اس کی شمالی سرحدوں پر برستی ہیں۔ اس لیے صحرائے عرب کا زیادہ تر حصہ سارا سال خشک رہتا ہے۔ اس پورے خطے میں گرمی سے تڑختے دریائی راستے ملتے ہیں۔ انھیں وادیاں کہا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی مانے کہ یہ بہتے دریاؤں کے آثار ہوں۔ جب بادل آتے اور بارشیں ہوتی ہیں تو یہ وادیاں تیز رو اور طاقتور پانی کی گزرگاہیں بن جاتی ہیں۔ اس بے آب سرزمین میں کسی نہ کسی طور اگ آنے والی موسمی نباتاتی حیات کے لیے یہ پانی ناگزیر ہے۔ جب نم ناکی کا یہ دور ختم ہوتا ہے تو وادیاں دوبارہ معمول پر آ جاتی ہیں؛ یہ خشک ہو جاتی ہیں اور بطور آبی گزرگاہ ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ البتہ نخلستان نسبتاً دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ ریت کے وسیع سمندروں میں گھرے زرخیز زمینوں کے چھوٹے چھوٹے قطعات ہیں۔ نخلستان چھوٹی موٹی آبادی کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہاں مسافر اور قافلے بھی عارضی پڑاؤ ڈال کر تازہ دم ہوتے تھے۔ لیکن نخلستانوں کے محدود وسائل کسی بڑے اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد نہیں بن سکتے تھے۔

اہلِ عرب

تہذیبوں کی تشکیل میں ان کے جغرافیائی ماحول کا کردار فیصلہ کن حد تک اہم ہوتا ہے۔ اس قاعدے سے اہلِ عرب بھی مستثنیٰ نہیں۔ عربوں کی طرزِ حیات کے ہر پہلو پر اپنے کرخت ماحول کی انمٹ چھاپ تھی۔ چونکہ صحرا میں کسی جمی جمائی مستقل تہذیب کی سہار نہ تھی چنانچہ عرب اپنے ریوڑوں کی

ضروریات پوری کرنے کی غرض سے ہروقت زرخیزی کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ لفظ ''عرب'' کی اصل کے ایک نظریے کی رو سے تو اس کا مصدر ہی ایک سامی لفظ ہے جو'' آوارہ گرد'' یا ''خانہ بدوش'' کا ہم معنی ہے۔ عرب سالہا سال گرمیوں کے مہینے کسی نخلستان میں یا ایسے کنوؤں کے اطراف میں گزارتے جہاں ضرورت بھر پانی میسر آسکتا تھا۔ اس دوران وہ پانی کی اور دیگر ضروریات کو ہر ممکن حد تک کم رکھتے۔ گرمیوں کی حدت جھیل چکتے تو جنوب کی طرف نقل مکانی کرتے یمن سے قریب ہو جاتے۔ یہ خزاں کی بارشیں ان کے ریوڑوں کے لیے روئیدگی مہیا کرتیں۔ عرب اپنے خیمے گاڑ کر عارضی ٹھکانے بناتے اور سرما کا سارا موسم ان کی بھیڑیں بکریاں اور اونٹ خوب چرتے۔ بارشوں کے مہینے گزرتے اور گرما کے آثار نظر آتے تو یہ دوبارہ اپنے نخلستانوں اور کنوؤں کی طرف لوٹ جاتے جہاں ایک اور سخت موسم ان کا منتظر ہوتا۔ یہ کرخت اور بے رحم چکر نامعلوم زمانوں سے عرب خانہ بدوشوں کا معمول چلا آرہا تھا۔ صحرائے عرب کی وسعتوں میں مقیم بدو عرب آج بھی اسی طرح کے حالات سے دوچار ہیں۔

قبل از اسلام کے عرب میں مہمان نوازی ایسی اہم تھی کہ کسی بھی عرب کے مہمان کو تین روز تک مکمل تحفظ کی ضمانت ہوتی تھی؛ اس دوران مہمان کے لیے اپنے آنے کی غرض و غایت بتانا بھی ضروری نہ تھا۔ پیغمبرؐ نے اس روایت کو اپنے اس فرمان سے اور بھی تقویت دی کہ تین دن تک مہمان کا حق مہمانداری ہے۔

صحرا ایسی جگہ نہیں کہ اکیلے زندگی گزاری جا سکے۔ عربوں کی بقا کو اتنے خطرات لاحق ہوتے تھے کہ برادری کا تعاون ناگزیر تھا۔ قیامت خیز گرمی اور قحط زندگی کو لاحق اولین خطرات تھے جن سے بچنے کے لیے سب سے پہلے رشتہ داروں سے مدد ملتی تھی۔ خاندانوں سے توقع کی جاتی تھی کہ ان کے افراد ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے اور وسائل مل جل کر استعمال کریں گے۔ خالص انفرادیت کا تصور کسی طور قابل قبول نہ تھا۔ اصل میں تو خاندان (اور اس کی توسیع یعنی قبیلہ) عرب معاشرے کی

اہم ترین اکائی سمجھا جاتا تھا۔ خاندانوں کے گروہ اکٹھے سفر کرتے تھے اور انھیں ایک قبیلہ (یا برادری) سمجھا جاتا تھا۔ بہت سی برادریوں کے حلقے سے قبیلہ بنتا تھا جس کا سربراہ شیخ کہلاتا تھا۔ قبل از اسلام کی دنیا میں قبائلی تشخص اور وابستگی کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں تھا۔ تحفظ، مدد اور اقتصادی مواقع کی ضمانت فقط قبائلی وابستگی میں تھی۔ اپنے کسی بھی فرد کے دفاع میں پورا قبیلہ جنگ پر آمادہ ہو جاتا۔ اسلام سے پہلے کے عرب میں قبائلی جنگیں معمول کی بات تھیں۔ چراگاہوں کے اور ریوڑوں کے جھگڑے تباہ کن قبائلی جنگوں کا باعث بنتے۔ ایسے جھگڑے سالوں چلتے اور طرفین کا بھاری جانی نقصان ہوتا۔ فطرت اور انسان دونوں کے خلاف کشاکش عرب طرزِ حیات کا مستقل اور جاری وساری عنصر تھا۔

ایسی خانہ بدوش قبائلی معاشرت میں فن کارانہ اظہار بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے پاس اتنا وقت اور وسائل نہیں تھے کہ وہ قدیم مصریوں اور یونانیوں کی طرح مجسمہ سازی یا تصویر کشی کے کارنامے دکھا سکتے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن صحراؤں کی ریت بھی تلاش جمال کی انسانی خواہش کو دبا نہ سکی۔ البتہ اس تلاش اور جستجو نے عربوں کے ہاں ایک نئی شکل اپنائی اور زبان میں اپنا اظہار پایا۔ عربی بجائے خود فنکارانہ اظہار کی ایک شکل ہے اور اس اعتبار سے دوسری کوئی زبان اس کی ہمسر نہیں۔ عربی میں لفظ اور جملے کی ساخت دونوں سیال ہیں اور، اسی لیے، کوئی شخص کسی ایک خیال کو کئی ایک طرح سے پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ عربوں کی شاعری بجائے خود ایک فن بن گئی۔ ان کے عظیم فن پاروں میں طویل رزمیہ نظمیں سرفہرست ہیں۔ شاعر اپنے قبیلے کی عظمت اور میدانِ جنگ میں اس کی شجاعت بیان کرتے تھے۔ ان میں سے عمدہ ترین فن پاروں کو کئی طرح سے خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ لوگ انھیں زبانی یاد کر لیتے اور نسلوں تک سناتے تھے۔ قبل اسلام کے سات عظیم ترین فن پاروں کو معلقات کہا جاتا تھا یعنی وہ جنھیں لٹکایا گیا۔ معلقات کہنے کی وجہ یہ تھی کہ انھیں کعبہ کی دیواروں پر لٹکایا گیا تھا۔ یوں کہہ لیجیے کہ اس شاعری کی عظمت کے اعتراف میں عربوں نے انھیں اپنے دلوں میں آویزاں کر لیا تھا۔ ایسی ترقی یافتہ شاعری کرنے والے عرب جزیرہ نما میں تحریر کا ہنر کمیاب تھا۔ چھٹی صدی تک زبان کی تحریری شکل یقیناً وجود میں آچکی تھی لیکن اسے بہت کم لوگ سیکھتے تھے۔ عرب زبانی یاد کر لینے کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ ہزاروں اشعار پر مشتمل قصائد ذہن میں محفوظ کر لیتے اور پھر نسل در نسل سناتے چلے جاتے۔

ساتویں صدی میں ظہور اسلام کے بعد زبانی یاد کرنے کی اس روایت کو نہایت اہم ثابت ہونا تھا۔

مذہب کی بات کی جائے تو قبل اسلام کے عربوں کی غالب تعداد کثرت پرستوں کی تھی۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ نے مکہ کی وادی میں خدائے واحد کی عبادت کے لیے کعبہ تعمیر کیا۔ سادہ مستطیل عمارت کی تعمیر کے لیے وہی بنیاد استعمال کی گئی جو پہلے انسان حضرت آدمؑ نے بنائی تھی۔ عربوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنا لیا اور حضرت اسمٰعیلؑ نے انھیں اس عبادت گاہ سے توحید کا پیغام دیا۔ تاہم صدیوں کے دوران یے میں حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد نے توحیدی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ لکڑی اور پتھر کے بت تراش کر خدا کی صفات ان کے ساتھ مختص کر دی گئیں۔ بعد ازاں صفات کی نمائندگی کرنے والے یہ بت بجائے خود دیوتا بن گئے۔ حضرت محمدؐ کے زمانے تک کعبے میں 360 بت رکھے جا چکے تھے۔ تاہم عربوں کے حافظے سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا پیغام پوری طور پر محو نہیں ہوا تھا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے خدا کو بھی مانتے تھے اور عربی میں اسے اللہ کہتے تھے۔ لیکن وہ اسے دیگر بہت سے دیوتاؤں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ عقائد کا یہ نظام اُس خالص توحید سے بہت دور تھا جس کی تعلیم ان دو پیغمبروں نے دی تھی۔ ان کے عقائد میں شمال کے بابلی مذاہب کے اثرات نمایاں تھے۔ جزیرہ نما عرب میں عیسائی اور یہودی آبادیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ بھی مذکورہ بالا پیغمبروں کی تعظیم کرتے تھے۔ لیکن عربوں کے ساتھ وہ سوائے اس تعظیم و تکریم کے بہت کم باتوں پر متفق تھے۔ ادھر ادھر بکھرے یہودی اور عیسائی کثرت پرست عربوں میں جذب ہونے سے بچتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود کو اپنی آبادیاں بنا کر خارجی اثرات سے محفوظ رکھنے کی روایت اپنالی تھی۔

عرب کے ہمسائے

ترقی یافتہ تہذیبوں سے دور جزیرہ نما عرب کے صحراؤں کے اندرون میں آباد ہونے کے باوجود عرب اپنے ہمسایوں سے پوری طرح الگ تھلگ نہیں تھے۔ اس جزیرہ نما کی شمالی سرحدوں کے ساتھ لگتے علاقوں میں رومن علاقائی سپر پاور بن چکے تھے۔ صوبہ شام و فلسطین میں رومنوں نے کئی یہودی

بغاوتیں کچلی تھیں اور وہاں اپنا کنٹرول برقرار رکھا تھا۔ بدو عربوں کے لیے ان کی موجودگی یوں اہم تھی کہ انھیں تجارت کے لیے شمال میں زیادہ طاقتور اور خوشحال ہمسائیگی میسر آگئی تھی۔ تاجر بڑی باقاعدگی سے جزیرہ نما کے مغربی حصے کے سفر کرتے۔ وہ جنوب میں واقع یمن سے لے کر شمال میں شام تک آتے جاتے۔ ان کے سامان تجارت میں ہندوستان اور اٹلی جیسے دور دراز کے ممالک کی اشیاء ہوتی تھیں۔ رومنوں نے زرخیز ہلال کے جانے پہچانے اور کم دوست موسموں والے خطوں پر قناعت کر لی تھی اور دور دراز ملکوں کی تجارت بدو عربوں پر چھوڑ دی تھی۔

عرب کے شمال مشرق میں سطح مرتفع ایران واقع ہے۔ ایران میں تیسری صدی عیسوی میں ساسانی عہد شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اہل فارس اور رومنوں کے درمیان صدیوں تک جاری رہنے والی کشاکش کا آغاز ہوا جس نے عربوں کو بھی متاثر کیا۔ ان دو عظیم طاقتوں کی درمیانی سرحد آگے پیچھے ہوتی رہی لیکن بالعموم جزیرہ نما عرب کے شمال میں صحرائے شام کے اندر ہی رہی۔ دونوں طاقتوں نے اپنی اپنی بالادستی کے لیے عرب قبائل کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ بالعموم یہ قبائل وہ تھے جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ ان طاقتوں کے تنازعہ سے فائدہ اٹھانے کو بے تاب عرب قبائل نے دو کنفیڈریشنیں بنائیں اور متحارب قوتوں کو اپنی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ غسانیوں نے آج کے اردن، شام اور فلسطین پر مشتمل بادشاہت قائم کی اور رومن سلطنت کے لیے بطور بفر (buffer) کام کرنے لگے۔ اسی طرح کی ایک سلطنت بنولخم نے قائم کی جو زیادہ تر عراق کے جنوبی علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس نے ایرانی سلطنت کے مفادات کا تحفظ کیا۔ دونوں عرب بادشاہتوں پر اپنے سرپرستوں کے اثرات بہت گہرے تھے۔ دونوں بڑی سلطنتیں اپنی ان خدمت گزار ریاستوں کو اپنے اپنے دشمن کے خلاف کھڑا رکھنے کے لیے ہر طرح کی مدد دیتی تھیں۔ دو بڑی سلطنتوں کی اس مستقل حالتِ جنگ کے نتیجے میں بالآخر ان چاروں حکومتوں کو ختم ہو جانا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل تک رومن اور ایرانی دونوں سلطنتیں کھوکھلی ہو گئیں اور فقط ظاہری فوجی آن بان باقی رہ گئی۔ جنگ کے اثرات غسانی اور بنولخم کی بادشاہتوں پر بھی پڑے۔ اس لیے کہ بڑوں کی لڑائی میں ان کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم زیادہ تر عرب قبائل نے خود کو بڑی طاقتوں کی اس خارجی لڑائی سے بچائے

رکھا۔ انھیں کسی سلطنت کی شکست یا فتح میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی وہ کسی کو جتوانے میں مدد دینا چاہتے تھے۔ وہ ان دونوں متحارب سلطنتوں کے ساتھ تجارت کے ذریعے مال بناتے تھے۔

جزیرہ نما عرب کے جنوب میں حبشہ کی طاقت اکسومی (Aksumi) سلطنت تھی۔ آج اس علاقے کو ایتھوپیا کہا جاتا ہے۔ حبشہ کے بلند پہاڑوں میں مرتکز یہ ریاست اندرون افریقہ کی حکومتوں کو بحرِ ہند کے تجارتی رستے اور جزیرہ نما عرب کے جنوبی علاقوں سے ملاتی تھی۔ تجارتی رستوں کا سنگم ہونے کی وجہ سے اکسومی سلطنت کا عربوں پر بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اکسومیوں اور عربوں کی تجارت زیادہ تر یمن میں ہوا کرتی تھی۔ رومنوں کی طرح اکسومی بھی عیسائی تھے اور ایرانیوں کے ساتھ ان کے بھی تنازے چل رہے تھے۔ دونوں ریاستوں کی خواہش تھی کہ تجارتی رستہ قابو میں رکھیں۔ یہی ان کے درمیان وجہ تنازعہ تھا۔ دونوں مقامی قبائل کو اپنا اپنا ماتحت حلیف بنانے کی کوششوں میں رہتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی کی دنیا میں دور دراز کے علاقوں نے ایک دوسرے کو زیادہ شدت سے متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں کہیں کہ گلوبلائزیشن کا عمل تیز ہونے لگا تھا۔ عرب بھی اپنے ہمسایوں سے لاتعلق نہیں تھے۔ جزیرہ نما عرب سے باہر ہونے والے واقعات انھیں بھی متاثر کرنے لگے تھے۔ تین طاقتور ریاستوں کے سنگم پر رہنے کا مطلب یہ تھا کہ عالمی سیاست سے باخبر رہا جائے اور ان کے باہمی تنازعات سے فائدہ اٹھانے کا ہنر سیکھا جائے۔

جغرافیائی محلِ وقوع کی تمام نزاکت کے باوجود اپنے صحرا کے اندرون میں عرب خود کو محفوظ خیال کرتے تھے۔ خود عربوں کو ادراک تھا کہ دنیا سے کتنے الگ تھلگ ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے جزیرہ نما کو جزیرۃ العرب یعنی عربوں کا جزیرہ کہتے تھے۔ عربوں کا دنیا سے کٹا ہونا ان کے لیے خاصا مفید ثابت ہوا۔ سخت آب وہوا کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ گرد و پیش کی ریاستوں میں سے کوئی حملہ آور ہو کر یہاں قابض ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ عربوں کی صحرا نوردی کے روایتی چکر اور طرزِ حیات دونوں پر خطے کی سیاست اور جنگ وجدل کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔

اسی محفوظ اور مامون ماحول میں ایک تحریک ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ابھری جسے

گردوپیش کی ریاستوں کے لیے اہم مضمرات کی حامل ہوتا تھا۔ ان مضمرات کی زد میں بالآخر سارے عالم کو آنا تھا۔ اس نے عربوں کا مقدر ہمیشہ کے لیے بدل دینا تھا۔ اس تحریک نے عربوں کی بعض منفرد خصوصیات کو بنیاد بنا کر ان سے استفادہ کرتے ہوئے انھیں محض صحرانشیں بدوؤں کی سطح سے بہت اوپر لے جانا تھا۔ اس تحریک نے عربوں کی ان معاشرتی خامیوں کو دور کرنا تھا جو ان کے محض متصادم اور صحرانشیں بدو ہو جانے کی بڑی وجوہات تھیں۔ جزیرہ نما عرب کے جغرافیے، آب وہوا، تمدن اور سیاست نے باہم متعامل ہو کر ایک خاص طرح کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس ماحول کے طفیل اسلام بہت تیزی سے ابھرتی ہوئی ایک عالمی طاقت بن گیا کہ تاریخ عالم کی کوئی اور تحریک، مذہب یا سلطنت اس رفتار کا مقابلہ نہیں کرتی۔ اس نے صحرائے عرب سے بگولہ کی طرح نکلنا تھا، خستہ حال رومن اور ایرانی سلطنتوں کو زیرِ تسلط لانا تھا، علاقوں پر علاقے فتح کرتے اور کئی طرح کی اقوام پر غلبہ حاصل کرتے بالآخر آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں سپین سے ہندوستان تک پھیلی سلطنت کو تشکیل دینا تھا۔ یہ اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ بقائے حیات کی جدوجہد میں غرق اوائل ساتویں صدی عیسوی کے عرب سلطنت اور تہذیب سازی کے ان کارناموں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ سب کام ایک شخصیت کی آمد کے طفیل ہوا جو ایک انقلابی پیغام کے ساتھ آئے۔ انھوںؐ نے عربوں کے ساتھ نئی منزل کا وعدہ کیا؛ یہ وعدہ عربوں کو صحرائے عرب سے باہر کی وسعتوں پر غلبے کی منزل کا وعدہ تھا۔ یہ نئے آنے والے حضرت محمدؐ تھے۔

دوسرا باب

حیاتِ محمد ﷺ

حضرت محمدؐ مکہ میں 570ء میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ جزیرہ نما عرب کے قلب میں واقع مذہبی اور تجارتی مرکز مکہ پر قبیلہ قریش کی اجارہ داری تھی۔ بنو ہاشم اسی قبیلے کی ایک شاخ تھا۔ بحیرہ احمر سے کوئی اسی کلومیٹر اندر واقع مکہ شمال میں رومنوں اور جنوب میں یمن کو ملانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس تجارتی شاہراہ پر ہونے کے اپنے فوائد بہرحال تھے۔ لیکن مکہ اس شاہراہ کے سروں پر واقع شہروں سے بہت فاصلے پر تھا۔ اس کے اطراف میں سینکڑوں کلومیٹر تک صحرا ہی صحرا تھا۔ اسی لیے ایک وادی میں واقع مکہ پر بیرونی اثر ورسوخ کبھی نہ رہا تھا۔ اپنی اس حیثیت میں مکہ بین الاقوامی رابطوں کا حامل بھی تھا اور باقی دنیا سے الگ تھلگ بھی۔ لیکن اگر مذہب کی بات کی جائے تو مکہ پورے عرب جزیرہ نما کا مقام رجوع تھا۔ کعبہ یہاں واقع تھا اور یہیں سارے عرب سے لوگ سالانہ حج کے لیے آتے تھے۔ یوں ایک طرف مکہ اتنا دور دراز تھا کہ اس پر بازنطینیوں یا ایرانیوں کی گرفت نہیں ہو سکتی تھی اور دوسری طرف ایسے مرکزی مقام کا حامل تھا کہ سارے عربوں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اسلام پھیلنے کے مرحلے پر آیا تو ان امور نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اوائل عمری

حضرت محمدؐ کی حیات کے ابتدائی سال بڑی سختیوں اور صدموں کے سال تھے۔ انؐ کے والد حضرت

عبداللہ بغرض تجارت سفر میں تھے کہ مکہ کے شمال میں واقع قصبے یثرب میں فوت ہو گئے۔ یہ واقعہ آپؐ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ آپؐ چھ برس کے تھے کہ والدہ حضرت آمنہ بھی فوت ہو گئیں۔ تب حضرت محمدؐ کی ذمہ داری آپؐ کے معزز دادا حضرت عبدالمطلب پر آپڑی۔ دو سال کے بعد عبدالمطلب بھی فوت ہو گئے اور آپؐ اپنے چچا حضرت ابوطالب کے ساتھ رہنے لگے۔ مالدار قبیلہ قریش میں سے ہونے کے باوجود آپؐ کی پرورش ناز و نعم سے نہیں ہوئی۔ آپؐ یتیم تھے اور قریش کی قدرے کمتر سمجھی جانے والی شاخ قریش میں سے ہونے کی وجہ سے حکمران طبقے کا حصہ بھی نہیں تھے۔ تاہم وہؐ کئی بار اپنے چچا کے ساتھ تجارتی سفر پر شام تک گئے۔ اس طرح وہؐ عربوں کی زمانوں قدیم بدوی روایات سے آشنا ہوئے۔ بطور تاجر نیک نام ہونے کے باعث وہؐ ''صادق اور امین'' یعنی ''سچا'' اور ''قابلِ اعتبار'' کے نام سے پکارے جانے لگے۔ یوں قریش بھی انؐ کی عزت کرتے تھے۔ انؐ کے پاس نقدی اور مال تجارت بطور امانت رکھوائے جاتے تھے۔ انھوںؐ نے کئی بار تنازعات کو بطور ثالث سلجھایا۔

بیس برس کے ہوتے ہوئے آپؐ تجارتی امور میں ماہر ہو چکے تھے اور حضرت خدیجہؓ نام کی ایک بیوہ کی طرف سے تجارتی معاملات طے کرنے لگے تھے۔ بالآخر اپنی ایمانداری اور قابلِ بھروسا ہونے کے باعث وہؐ حضرت خدیجہؓ کی نظروں میں آگئے۔ آپؐ پچیس برس کے تھے کہ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو شادی کی پیش کش کر دی۔ حضرت خدیجہؓ سے برسوں چھوٹے ہونے کے باوجود آپؐ نے یہ تجویز مان لی۔

ایک کثرت پرست معاشرت میں زندگی گزارنے کے باوجود آپؐ نوعمری میں بھی قریش کے مذہب سے گریزاں رہے۔ زیادہ تر عربوں کی یادداشت میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے اصل توحیدی پیغام کی موہوم سی یاد باقی تھی۔ لیکن اسے قرار واقعی اہمیت دینے والے بہت کم تھے اور انھیں حنافہ (واحد حنیف) کہا جاتا تھا۔ اس اصطلاح کا لفظی مطلب ہے خدائے واحد کو ماننے والے۔ ان لوگوں نے پتھر اور لکڑی سے بنے سینکڑوں خداؤں کی پرستش سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت محمدؐ ان لوگوں میں سے ایک تھے۔ معاشرے میں پوری طرح رائج بت پرستی میں حصہ لینے کی بجائے انھوںؐ نے الگ تھلگ ہو جانے کا رستہ اپنایا۔ انھوںؐ نے عادت بنالی کہ مکہ سے پانچ کلومیٹر دور ایک پہاڑی

کی چوٹی پر واقع غار میں چلے جاتے۔ اس غار کے اندر خاموش اکیلے بیٹھے وہ مکہ کے معاشرے اور مذہب پر غور وفکر کیا کرتے۔

پہلی وحی

610 عیسوی میں غار کے اندر بیٹھے حضرت محمدؐ ایک نئی واردات سے گزرے۔ ایک فرشتہ اچانک انؐ کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے انھیںؐ کہا کہ ''پڑھ''۔ آپؐ نے جواباً کہا کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ مکہ کے زیادہ تر لوگوں کی طرح حضرت محمدؐ بھی ناخواندہ تھے۔ فرشتے نے دوبارہ انؐ سے پڑھنے کا تقاضا کیا۔ حضرت محمدؐ نے جواباً دوبارہ کہا کہ وہؐ پڑھ نہیں سکتے۔ فرشتے نے تیسری بار بھی انؐ سے پڑھنے کو کہا۔ اب بھی حضرت محمدؐ نے اس حوالہ سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ تب فرشتے نے انھیںؐ قرآن کی وہ آیات پڑھ کر سنائیں جنھیں پہلی وحی کہا جاتا ہے:

''پڑھ اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا،
پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے،
پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے،
جس نے علم سکھایا قلم سے انسان کو
وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔'' (قرآن96)

حضرت محمدؐ نے فرشتے کے پیچھے پیچھے ان الفاظ کو دہرایا۔ تب فرشتے نے بتایا کہ وہ جبرائیل فرشتہ ہے جسے اللہ نے بھیجا ہے اور آپؐ اللہ کے پیغمبرؐ ہیں۔ حضرت محمدؐ ڈرے سہمے فوراً گھر کو چلے گئے۔ انھیںؐ سمجھ نہ آئی کہ اس واقعے کو کیا سمجھیں۔ حضرت خدیجہؓ غار میں ہونے والے وقوعے پر ایمان لائیں اور آپؐ کو تسلی دی۔ انھوں نے اپنے عم زاد سے ذکر کیا جو یہودی اور عیسائی صحائف سے واقف تھے کہ جو کچھ ہوا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس نے فوراً مان لیا کہ حضرت محمدؐ اپنے زمانے میں اسی طرح اللہ کے پیغمبر ہیں جیسے ان سے پہلے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ تھے۔ اپنی بیوی اور اس کے عم زاد کی تسلی کے بعد حضرت محمدؐ نے بھی خدا کے پیغمبر ہونے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یوں بطور پیغمبر انؐ کی

زندگی کا آغاز ہوا۔

حضرت خدیجہؓ ہی اولین شخصیت تھیں جنھیں غار سے لوٹنے کے بعد آپؐ کی نبوت کا پتہ چلا اور وہی سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لائیں۔ آپؐ نے جلد ہی اپنے قریبی لوگوں کو اس نئے مذہب کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ آپؐ کے قریبی ساتھی حضرت ابو بکرؓ، نو عمر چچازاد حضرت علیؓ اور گھریلو ملازم حضرت زیدؓ سب آپؐ کی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو فوراً نبی مان لیا۔ ان لوگوں نے یہی پیغام اپنے اپنے قریبی لوگوں کو دیا اور اس طرح آپؐ پر ایمان لانے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ مکی معاشرہ کثرت پرستوں کا معاشرہ تھا۔ اگر بہت سے بتوں کی جگہ ایک خدا کو دینے کی بات خطرہ سمجھی گئی تو عین فطری امر تھا۔ اسی لیے اپنے اولین مہینوں اور سالوں میں اسلام کو ماننے والوں کی حیثیت ایک خفیہ اور خوفزدہ گروہ کی سی تھی۔ انھیں مکی معاشرے کے ردِعمل کا خوف تھا۔ انھیں مسلم قرار دیا گیا یعنی وہ جنھوں نے تسلیم کر لیا اور مان لیا۔ لفظ مسلم عربی لفظ اسلام سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے خدا اور اس کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر لینا۔

اب وحی مسلسل آ رہی تھی اور اسلام کے بنیادی مرکزی خیالات واضح شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ جونھی وحی اترتی چھوٹے سے گروہ کے ہر فرد کو تعلیم کر دی جاتی۔ اب تک کی تعلیمات کا محور توحید تھا۔ توحید کا تصور مکہ میں عام کثرت پرستی سے قطعاً متصادم تھا۔ حضرت محمدؐ کا پیغام تھا کہ خدا صرف ایک ہے، مکہ والے جن بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ پتھر اور لکڑی کی بے کار مورتوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ کسی کا نفع یا نقصان نہیں کر سکتے۔ ان آیات میں ایک روز حساب کا بھی بتایا گیا تھا جب تمام ارواح اپنے اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے خدا کے روبرو لائی جائیں گی۔ خدا پر ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں کو بطور اجر ہمیشہ رہنے والی جنت میں بھیجا جائے گا۔ اس کے برعکس کرنے والوں کا مقام دوزخ ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔ اسلام فقط الٰہیاتی عقائد اور حیات بعد از موت تک محدود نہیں رہا۔ نازل ہونے والی اولین آیات میں بھی عربوں کی معاشی زندگی کی عام برائیوں کی مذمت کی گئی۔ تجارتی شاہراہوں سے آنے والی دولت کے ارتکاز نے واضح طور پر کئی طبقات بنا دیے تھے۔ دولتمند اپنی دولت سے مزید تجارتی قافلے تیار کرتے جو ان کے لیے

اور دولت لاتے۔ اس عمل میں غریب غربت کی طرف دھکیل دیے جاتے۔ اگر ان کا تعلق کسی طاقتور قبیلے یا برادری سے نہ ہوتا تو ان کی عسرت اور شدید ہو جاتی۔ قرآن نے بتایا کہ غریب طبقے سے ایسی بے اعتنائی سماجی نظام کے لیے تباہ کن ہو گی۔ اور اس طرح کے اعمال پر دوسری دنیا میں سخت سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگرچہ معاشرتی نظم و ضبط کے قوانین برسوں کے بعد متعارف کروائے گئے لیکن شروع سے ہی آثار نظر آنے لگے تھے کہ حضرت محمدؐ کی آمد صرف مذہبی عقائد کی درستگی کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ خود معاشرے کی اصلاح بھی کریں گے۔

پہلے پہل اترنے والی آیات میں یہی ایک خیال بار بار دہرایا گیا۔ مکہ میں نازل ہونے والی آیات اور سورتیں، جو بالعموم قرآن کے آخر میں ملتی ہیں، اپنے مزاج میں قطعی اور مختصر ہیں۔ ان میں مطلب کی بات بڑے حتمی انداز میں کی گئی ہے۔ ان آیات نے نومولود مسلم برادری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ شہر کی باقی آبادی ابھی تک اس گروہ سے بے خبر تھی۔ ایمان لانے والے لوگ جب آپس میں ملتے تو وحی ہونے والی تازہ آیات پر بات کرتے اور ایک دوسرے کو ان کی تعلیم دیتے۔ جب وہ غیر مسلم اکثریت میں ہوتے تو اپنے نئے عقائد اور اسلام لانے کو چھپاتے۔ ظاہر ہے کہ ان نئے عقائد نے مکی معاشرتی نظام کے لیے خطرہ بن جانا تھا۔ معاشرتی، اقتصادی اور قبائلی مساوات کا خیال ہی قریش کے طاقتور اور دولتمند لوگوں کے لیے سوہانِ روح تھا۔ صاحبان اقتدار کسی بھی معاشرتی انقلاب کو شاذ ہی خوش آمدید کہتے ہیں۔

اگر حضرت محمدؐ نے معاشرے میں کسی تبدیلی کی وکالت نہ کی ہوتی تو بھی نئے عقائد کثرت پرستوں کے معاشرتی اور اقتصادی مرتبے سے متصادم تھے۔ کعبہ کی بدولت مکہ پورے جزیرہ نما کے عربوں کا مذہبی مرکز بنا رہا تھا۔ سال میں ایک بار سارے علاقہ سے عرب حج اور کعبہ میں موجود سینکڑوں بتوں کی تعظیم کے لیے مکہ آتے تھے۔ اہلِ قریش کے لیے یہ اجتماع بڑے کاروباری فوائد لاتا۔ تجارت کو حج کی قدرتی ذیلی پیداوار کہا جاتا ہے۔ اتنے دور دراز علاقوں سے اتنے زیادہ لوگ ایک ہی وقت میں مکہ آتے تو یہاں ایک منڈی لگ جاتی اور یہ سارے عرب کا مذہبی سیاسی اور اقتصادی مرکز بن جاتا۔ اس سارے معاملے کا اہتمام کرنے والے یعنی قریش خوب منافع کماتے۔ حضرت محمدؐ کے پیغام میں

بتوں کی نفی تھی اور خدا کی وحدانیت پر زور تھا۔ بت نہ ہوتے تو حج بھی نہ ہوتا اور حج نہ ہوتا تو کاروبار نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ قریش کے لیے یہ سارا منظرنامہ ہرگز خوش کن نہیں تھا۔ حضرت محمدؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے قبیلے کے سرداروں کے سامنے اس نئے مذہب کی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ تب تک مسلم برادری اتنی قلیل اور کمزور تھی کہ صاحبان اقتدار کے ساتھ کھلم کھلا نظریاتی اختلاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگر یہ دیکھیں کہ پہلے پہل اسلام لانے والوں کی اکثریت معاشرے کے سب سے نچلے طبقات سے تھی تو معاملہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ابتدائی زمانے کی مسلم برادری زیادہ تر غلاموں، نوکروں اور دیگر غرباء پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کو متوجہ کرنے اور ایک برادری بنانے میں نئے مذہب کی اس تعلیم کا ہاتھ تھا کہ اللہ کے نزدیک سب انسانوں کا درجہ مساوی ہے اور عزت وقعت کا معیار مال و دولت اور سماجی مرتبہ نہیں ہے۔

ابتلاء و آزمائش

بالآخر مسلم برادری اتنی بڑی ہوگئی کہ باقی اہلِ قریش کے لیے انھیں نظرانداز کرنا مشکل ہو گیا۔ اس سے پہلے مسلمان اپنی عبادات کے لیے قصبے کے مضافات میں کسی جگہ اکٹھے ہو جایا کرتے تھے لیکن جماعت کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ان کے نظر میں آنے کے امکانات بھی بڑھنے لگے۔ پھر عین یہی ہوا کہ بت پرستوں کے ایک گروہ نے مسلمانوں کی جماعت کو عبادت کرتے دیکھ لیا۔ مسلمانوں اور ان کی عبادت کی تضحیک بت پرستوں کا سب سے پہلا وار تھا۔ اول اول تو اہلِ قریش نے خود کو یوں تسلی دی کہ یہ چند سر پھروں کا ایک گروہ ہے جس کی تضحیک کرنا ہی کافی ہے۔ جب تک معاملے کی حقیقی نوعیت کا ادراک نہ ہوا ان کا طرزِ عمل یہی رہا۔ وحدانیت، معاشرتی انصاف، مساوات اور اللہ کے قوانین کا اتباع جیسے خیالات اہلِ قریش کے لیے خطرناک تھے۔ بہت سے قریشی رہنماؤں کا خیال تھا کہ اس نئی مذہبی اور معاشرتی تحریک کا حل یہی ہے کہ اس کے رہنما حضرت محمدؐ سے نجات حاصل کی جائے۔

لیکن عرب معاشرت میں تب بھی ایک ڈھانچہ اور قوانین موجود تھے۔ حضرت محمدؐ یتیم تھے لیکن اپنے چچا حضرت ابوطالب کی پناہ میں تھے جو قریش کی شاخ بنو ہاشم کے سربراہ تھے۔ حضرت ابوطالب

نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن شخصی وقار اور عرب معاشرتی اقتدار کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حفاظت کریں۔ اس کے علاوہ زمانوں قدیم عرب رسوم ورواج کا تقاضا تھا کہ اگر حضرت محمدؐ کو قتل کر دیا جاتا ہے تو ان کی برادری کو قاتلوں سے بدلہ لینے کی اجازت ہوگی۔ یوں اندیشہ تھا کہ مکہ کی گلیوں میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ خود حضرت محمدؐ کو تو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا تھا لیکن ان کے ماننے والوں کو اس طرح کا تحفظ حاصل نہیں تھا۔ ان میں سے کئی کسی فرد یا خاندان کی پناہ میں نہیں تھے۔ چنانچہ قریش نے مزید لوگوں کو اس مذہب میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے کمزور لوگوں پر ظلم وستم شروع کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہراساں کیا جانے لگا اور ان سے وہ شہری حقوق چھین لیے گئے جو عام کثرت پرستوں کو حاصل تھے۔ حضرت محمدؐ کو تو تحفظ حاصل تھا لیکن دوسروں پر ہونے والا ظلم روکنے میں آپؐ بے بس تھے۔

قریش نے اس طرح کے انتظامات بھی کیے کہ یہ نیا مذہب مکہ سے باہر نہ پھیل جائے۔ اس صورتحال میں مسلمانوں میں سے کچھ حبشہ ہجرت کر گئے جہاں کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے انھیں تحفظ دیا۔ قریش نے اپنے ایلچی اس کے پاس بھیجے تا کہ وہ بادشاہ کو اپنی پناہ ختم کر کے مسلمانوں کو واپس بھیجنے پر قائل کر سکیں۔ پھر جب نجاشی نے حضرت محمدؐ کے عم زاد حضرت جعفرؓ سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ سے متعلق قرآنی آیات کی تلاوت سنی تو اس نے اپنے ہم خیال موحدین کو ان کے حال پر چھوڑنے سے انکار کر دیا اور قریش انھیں واپس مکہ نہ لا سکے۔ لیکن اگر مسلمان مکہ سے نکل کر دور دراز علاقوں کو ہجرت نہ بھی کرتے تو اسلام کا مکہ سے باہر پھیلاؤ روکنا مشکل تھا۔ ہر سال ہزاروں عرب مکہ آتے تھے۔ اگر ان میں سے تھوڑے سے بھی حضرت محمدؐ کا نیا پیغام سن لیتے اور اسے پھیلنے سے روکنے میں قریش کی ناکامی دیکھ لیتے تو بطور ایک ممتاز قبیلے کے قریش کے مرتبے کو زوال آنے لگتا۔ ایک اور صورت یہ تھی کہ مکہ آنے والے حضرت محمدؐ کے پیغام پر ایمان لے آتے، واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ وطن کو لے جاتے اور یوں اسلام مکہ سے باہر پھیلنے لگتا۔ اس طرح بھی اسلام کے پھیلاؤ کو روکنا ممکن نہ رہتا۔

ان خدشات کے باعث اہل قریش نے اسلام کو روکنے کے لیے ہر حد تک جانے کا فیصلہ کیا۔

پہلی وحی کے سات سال بعد 617ء میں اہلِ قریش نے فیصلہ کیا کہ بنو ہاشم یعنی آپؐ کی برادری کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ بنو ہاشم کے ساتھ کسی بھی طرح کا لین دین نہ رکھا جائے اور نہ ہی کوئی رشتہ ناتا کیا جائے۔ انھیں مکہ سے نکال کر ایک بنجر وادی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس فیصلے نے مسلمانوں پر بڑے تباہ کن اثرات ڈالے۔ اس اقدام سے مسلمانوں کو بھوک، معاشرتی تنہائی اور اقتصادی بدحالی کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمان تو ایک طرف بنو ہاشم کے حضرت ابو طالب جیسے وہ لوگ بھی بری طرح متاثر ہوے جو اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے کچھ مسلمان جو بنو ہاشم میں سے نہیں تھے، بائیکاٹ کے قواعد وضوابط میں سے رعایتیں اور راستے نکال کر بنو ہاشم کو تھوڑی بہت ضرورت کی اشیاء مہیا کرتے رہے۔ اس عمل نے ان لوگوں کو بھی خاصا ذاتی نقصان پہنچایا۔ اس بائیکاٹ نے مسلمانوں کو بڑا کمزور کر دیا۔ اس میں بنو ہاشم یا دیگر برادریوں کے مسلمانوں کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ بائیکاٹ بھی حضرت محمدؐ کو تبلیغ سے نہ روک سکا۔ بائیکاٹ کرنے والوں نے اسے غیر موثر پایا تو یہ ایک سال سے کچھ اوپر جاری رہنے کے بعد رفتہ رفتہ خود ہی ختم ہو گیا۔ قریش کی کوششوں کے باوجود اسلام لانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس بائیکاٹ نے ثابت کر دیا کہ اس نوخیز برادری کے اندر اخوت کا جذبہ بڑا مضبوط ہے۔ بنو ہاشم سے باہر کے مسلمان بھی اپنے زیرِ عتاب بھائی بہنوں کی مدد کے لیے مالی نقصان برداشت کرنے اور اپنی سلامتی خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو گئے۔ یہیں اسلام کا ایک بنیادی اصول ظہور میں آیا کہ مذہب کے ساتھ وفاداری کو قبائلی وفاداری پر فوقیت حاصل ہے۔

مسلم برادری پر بائیکاٹ کے منفی اثرات مرتب ہوے بغیر نہ رہ سکے۔ سالوں تک مناسب خوراک اور رہائش کے نہ ہونے اور جسمانی بے آرامی نے اپنا رنگ دکھایا۔ آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ 619ء میں فوت ہوئیں۔ ان کی آخری علالت میں بائیکاٹ کے باعث آنے والے مصائب کا کردار بھی تھا۔ انھوں نے اسلام سب سے پہلے قبول کیا تھا اور اہلِ قریش کی دشمنی میں آپؐ کے ساتھ کھڑی رہیں۔ انھوں نے رسول اللہؐ کو دعوتِ اسلام کے ابتدائی سالوں میں اخلاقی اور جذباتی سہارا دیا۔ آپؐ کو تب ان کی معاونت کی شدید ضرورت بھی تھی۔ آپؐ کے لیے یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ لیکن ابھی

انھیں ایک اور صدمہ بھی اٹھانا تھا۔ اس کے جلد بعد انؐ کے معاون اور محافظ چچا حضرت ابو طالب بھی بیمار ہوے اور فوت ہو گئے۔ اگر چہ انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن دیگر بنو ہاشم کے ساتھ ابتلاؤں سے گزرنے کے باوجود آپؐ کی حفاظت سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حضرت ابو طالب کی وفات فقط آپؐ کا ذاتی اور جذباتی نقصان نہیں تھا بلکہ مسلم برادری کے لیے بھی اس کے مضمرات بڑے افسوسناک تھے۔ حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد قریشی سرداروں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ نہ صرف ان کی زبان زیادہ تیز ہو گئی تھی بلکہ وہ جسمانی آزار سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابو طالب جیسے کسی رہنما کے بغیر آپؐ اور مسلم برادری کو اہلِ قریش سے محفوظ رکھنا مشکل تھا۔ مکہ سے محبت کے باوجود آپؐ کوئی اور شہر تلاش کرنے لگے تھے جو انھیں قبول کرے اور جہاں انھیں تبلیغ اسلام پر قریش جیسی سخت دشمنی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آپؐ کی نظر انتخاب طائف پر پڑی۔ مکہ کے جنوب مشرق میں کوئی ساٹھ کلومیٹر پر واقع اس قصبے پر ایک قبیلے بنو ثقیف کا غلبہ تھا۔ انھوںؐ نے طائف جا کر وہاں کے تین رہنماؤں سے ملاقات کی جو آپس میں بھائی تھے۔ ان تینوں نے اسلام قبول کرنے اور آپؐ کو کسی بھی طرح کا تحفظ دینے سے انکار کر دیا۔ مزید خرابی تب ہوئی جب وہ مکہ واپسی کے لیے شہر سے نکلے تو اہلِ طائف کا ایک ہجوم آپؐ کے گرد جمع ہو گیا۔ وہ آپؐ کو برا بھلا کہتے اور پتھر برساتے رہے۔ حتیٰ کہ آپؐ شہر کی حدود سے نکلے تو لہولہان ہو چکے تھے۔ اسلامی روایات کے مطابق اس وقت جبرائیلؑ فرشتہ آیا۔ اس نے آپؐ سے پوچھا کہ اگر آپؐ چاہیں تو شہر طائف کو اللہ کے پیغمبرؐ سے بدسلوکی پر دو پہاڑوں کے درمیان تباہ کر دیا جائے۔ آپؐ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ امید ہے ان کی اولاد میں سے کوئی صاحبِ ایمان ہو جائے۔ آنے والی صدیوں میں اس واقعہ نے آپؐ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مابین روحانی تعلق قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جب خاندان میں معاونت کرنے والے نہ رہے، ہمسایہ قبائل نے مسترد کر دیا اور پیروکاروں کو نظروں کے سامنے تکلیفیں دی جانے لگیں تو آپؐ نے درست فیصلہ کیا کہ اسلام کو مٹنے سے بچانے کے لیے کسی اور علاقے کو ہجرت کرنا لازم ہو گیا ہے۔ آپؐ کو لگا کہ مکہ سے شمال میں 300 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع نخلستان یثرب مناسب ترین جگہ ہو سکتی ہے۔ وہاں کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج

میں غلبے کی کشاکش جاری رہتی تھی جو610ء میں بڑی ہلاکت انگیز ہوگئی تھی۔ وہاں کئی یہودی قبائل بھی آباد تھے جن کی مقامی قبائل سے نہیں بنتی تھی۔ یوں صورتحال اور بھی گھمبیر ہوگئی تھی۔ یثرب کے لوگوں میں شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ آپؐ پر بھروسا اور اعتبار کیا جاسکتا ہے۔620ء میں یثرب کے کئی ممتاز لوگ مکہ آئے اور آپؐ سے درخواست گزار ہوئے کہ بطور رہنما اور ثالث یثرب میں آباد ہو جائیں۔ حضرت محمدؐ نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ آپؐ نے اپنے ماننے والوں سے بھی کہا کہ قریش کے جبر سے بچنے کے لیےان کے ساتھ یثرب چلیں۔ آپؐ مکہ سے یثرب جانے والے آخری لوگوں میں سے تھے۔ آپؐ 622ء میں اپنے قریبی ساتھی حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکہ سے نکلے اور یثرب چلے گئے۔ اہلِ قریش آپؐ کی جان لینے کا منصوبہ بنا چکے تھے لیکن آپؐ بال بال بچ نکلے۔ یثرب کو جلد ہی مدینہ منورہ کا نام دے دیا گیا۔ اب آپؐ اہلِ قریش سے دور اسلام کی کھل کر تبلیغ کر سکتے تھے اور ان کے ظلم سے بھی محفوظ تھے۔

مدینہ

آپؐ کا مکہ سے مدینہ آنا ہجرت کہلاتا ہے۔ یہ سفر اسلامی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ آج بھی یہ سال اسلامی کیلنڈر کا آغاز مانا جاتا ہے۔ یہاں مسلمان مرکزی معاشرتی دھارے سے باہر رکھی گئی ایک چھوٹی سی برادری نہیں تھے اور نہ ہی حضرت محمدؐ کو معاشرے کی مسترد شدہ شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ مسلم برادری نے اس شہر کو پہلی اسلامی ریاست بنانا تھا اور حضرت محمدؐ کو اس کا رہنما بننا تھا۔ قیام مدینہ کے دس سالوں میں حضرت محمدؐ نے ایسی مثالیں قائم کرنا تھیں جن کا حوالہ مسلم سیاست، معاشرتی نظم و ضبط اور اقتصاد میں سینکڑوں سالوں تک دیا جانا تھا۔ لیکن مدینہ میں قیام کے اپنے چیلنج بہرحال موجود تھے۔ سب سے بڑا چیلنج مدینہ میں آبادی کی بدلی ہوئی نوعیت تھی۔ اب یہاں نئے آنے والوں یعنی مہاجرین اور اصل بسنے والوں یعنی انصار کی مخلوط آبادی بستی تھی۔ خود مہاجرین بھی کسی ایک قبیلے پر مشتمل نہیں تھے۔ مکہ کی کوئی بھی پوری برادری مسلمان نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ مہاجرین میں بڑے متنوع لوگ شامل تھے جنھیں کسی قبیلے یا برادری کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی۔ اس کے برعکس انصار کا تعلق یا تو اوس سے تھا یا خزرج سے۔ اور یہ دونوں مدینے کے باہم متحارب قبائل تھے۔ مدینے کے

بہت سے لوگ ان میں سے کسی قبیلے کے نہیں تھے۔ یہ افریقہ، ایران اور بازنطینی سلطنت جیسے دور دراز علاقوں سے آئے تھے۔ بہت سے مسلمانوں کے لیے طے کرنا مسئلہ بن رہا تھا کہ ان کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہوں گی۔ اس مسئلہ پر جناب رسولؐ اللہ نے واضح کر دیا کہ قبل اسلام کی وفاداریاں گزرے زمانوں کی بات ہے۔ اب ان وفاداریوں پر اُمت کے ساتھ وفاداری کو فوقیت ہوگی۔ خواہ ان کا تعلق قریش سے تھا، اوس وخزرج سے تھا یا اہلِ یہود سے تھا۔ آپؐ کے نزدیک سب مسلمان برابر تھے۔

جو کوئی بھی مسلمان ہو گیا وہ بھائی چارے پر مبنی ایک نئی برادری کا رکن بن گیا جو آباؤ اجداد کے اشتراک کی بجائے عقیدے کے اشتراک پر وجود میں آئی تھی۔

یہودی اہلِ ایمان کے ساتھ مل کر ایک برادری بناتے ہیں۔ یہودیوں کے لیے ان کا مذہب اور مسلمانوں کے لیے ان کا۔ اس کا اطلاق دونوں فریقین پر ہوتا ہے اور ان پر بھی جن کے ساتھ یہ کسی معاہدے میں ہیں۔ سوائے اس کے جو غداری کرتا ہے یا غلط کرتا ہے اس لیے اس نے اپنے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ غلط کیا ہے (میثاق مدینہ)

مدینہ میں حضرت محمدؐ کا یہ نیا سیاسی اور معاشرتی بندوبست ایک متن میں قانون کی شکل میں درج کیا گیا اور اسے میثاق مدینہ کا نام دیا گیا۔ اس نئے آئین میں کھل کر لکھا گیا کہ حضرت محمدؐ کے زیرِ اقتدار مدینہ اسلامی قوانین کے تحت بطور ریاست چلے گا۔ پوری امت ایک سیاسی وحدت کے طور پر عمل کرے گی۔ شہر کے امور میں حتمی تصفیہ کار حضرت محمدؐ ہوں گے۔ بدلے اور غیرت کے قدیم عرب رواج کی جگہ اسلامی قانون پر مبنی منظم نظام انصاف کام کرے گا۔ اس میثاق میں نخلستان کے یہودیوں کو اپنے مذہب پر عمل کی اجازت دی گئی لیکن انھیں حضرت محمدؐ کی سیاسی حاکمیت کو قبول کرنا تھا اور قریش کے حملے کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر حضرت محمدؐ کا دفاع کرنا تھا۔ حضرت محمدؐ کے تشکیل کردہ اس نومولود سیاسی وجود کو صدیوں تک آنے والی مسلم حکومتوں کے لیے، بالخصوص غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے، بطور نمونہ کام آنا تھا۔

مسلم برادری کے حالات بدلے تو آنے والی وحی کی ماہیت اور نوعیت بھی بدل گئی۔ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات اور سورتیں مکہ والی سے طویل ہیں۔ ان میں عبادات، ٹیکس، وراثت اور غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات جیسے موضوعات زیادہ مفصل بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن نے ایک اسلامی ریاست کو چلانے کے حوالے سے قوانین دیے جن کی ماہیت و نوعیت عمومی تھی، بوقت جزئیات کی وضاحت حضرت محمدؐ خود کر دیا کرتے تھے۔ آپؐ کے الفاظ اور افعال حدیث کہلاتے ہیں۔ خدا کے وحی کردہ احکام کے بعد یہ اسلامی شریعت کا بنیادی ترین ماخذ ہے۔ لیکن قرآن کا تعلق فقط معاشرتی نظم وضبط اور قانون سے نہیں تھا۔ بہت سی مدنی آیات میں پہلے گزر گئے پیغمبروں کا تذکرہ بھی ہے۔ آپؐ کے ماننے والوں کو حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی کہانیاں مفصل سنا کر واضح کر دیا کہ انبیاء کے اسی سلسلے میں آخری حضرت محمدؐ ہیں۔ اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ آپؐ کا پیغام پرانے پیغمبروں سے اصلاً مختلف نہیں ہے۔

ان میں سے زیادہ تر کے مخاطب مدینہ کے یہودی تھے۔ بادی النظر میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا بہت کچھ مشترک تھا۔ دونوں کثرت پرستوں کی اس سرزمین میں توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ دونوں کے محترم انبیاء ایک ہی تھے اور اسلام کے ابتدائی دور میں تو مسلمان یروشلم ہی کی طرف سجدہ کرتے تھے جو یہود کے سجدوں کا رخ بھی تھا۔ یہود کے صحائف میں ایک مسیحا کا ذکر ملتا ہے اور ان کے نزدیک حضرت محمدؐ ہی وہ شخصیت تھے جن کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن دیگر بہت سوں نے انھیں مسترد کر دیا۔ یہود اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ وہ عقیدہ اور نسل دونوں طرح سے خود کو برگزیدہ اور خدا کے چنیدہ خیال کرتے ہیں۔ جب حضرت محمدؐ نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کا تعلق خواہ کسی بھی نسل سے ہو، باہم برابر ہیں تو یہود کو اپنے بعض عزیز عقائد خطرے میں نظر آئے۔ ان میں سے کچھ غالباً انھیں واقعتاً پیغمبر ہی مانتے تھے لیکن عبرانی الاصل نہ ہونے کے باعث اپنے صحائف کو لفظی معنوں میں ماننے والوں کو ان کی پیغمبری سے انکار تھا۔ خود کو خدا کے برگزیدہ اور چنیدہ بندے خیال کرنے والے یہودیوں اور مسلمانوں کی مساوات کی قائل مسلمان برادری کے درمیان سوچ کا اختلاف خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔

جنگیں

مسلمانوں کے مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آنے سے بھی قریش کے ساتھ تنازعہ ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں ابھی تک اپنے سابقہ بھائی بندوں کی بدسلوکی پر تلخی موجود تھی اور انصار بھی اپنے نئے مسلمان بھائیوں پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینے کو بے تاب تھے۔ لیکن ابھی پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت نہیں دی تھی۔ جنگ و جدل بہرحال کوئی کھیل نہیں اور بالخصوص جزیرہ نما عرب میں جہاں صدیوں سے غیرت اور انتقام کے پیچیدہ قواعد پر بڑی سختی سے عمل ہوتا چلا آ رہا تھا۔ پھر قرآن میں انسانی زندگی کی حرمت پر زور دیا گیا ہے اور بلاوجہ جان لینے کو قبیح ترین افعال میں رکھا گیا ہے۔ اسی لیے مسلمان سالوں تک اہلِ مکہ کے جبر و ظلم کا شکار رہنے کے باوجود ان کے خلاف فوجی کارروائی سے ہچکچاتے رہے۔

ابھی حضرت محمدؐ کو مدینہ آئے، بہت عرصہ نہیں ہوا تھا کہ صورتحال بدل گئی۔ انھوںؐ نے مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی آنے والا ایک نیا پیغام سنایا کہ ''ان کو اجازت (جنگ کرنے کی) دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ بے شک خدا انھیں، فتح دینے پر قادر ہے۔ (یہ وہ لوگ) ہیں جنھیں ان کے گھربار سے بغیر کسی حق کے بے دخل کیا گیا، صرف اس بنا پر کہ وہ کہتے ہیں: 'ہمارا مالک اللہ ہے۔'' (قرآن 22:39-40) ان آیات سے حضرت محمدؐ کو ماننے والوں پر واضح ہو گیا کہ جنگ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ جب مسلمانوں کو دبایا جائے تو یہ فریضہ بن جاتی ہے۔ ان آیات سے دنیا میں اسلام کے کردار کا ایک اور پہلو بھی آشکار ہوتا ہے، وہ یہ کہ اسلام محض ان دیکھے حقائق کے متعلق چند اعتقادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مکمل طرزِ حیات ہے جس نے عبادات سے لے کر خارجہ تعلقات اور الٰہیات تک کا احاطہ کر رکھا ہے۔ قرآن میں بیان ہونے والے دیگر احکامات کی طرح مسلمان اس نئے حکم کو بجا لانے اور اپنی حیثیت ثابت کرنے کے لیے بہت بے تاب تھے۔

یہ موقع 624ء میں آیا جب مسلم برادری نے 300 آدمیوں پر مشتمل ایک فوج ترتیب دی اور اسے مدینے کے پاس گزرتے قریش کے ایک قافلے کا راستہ روکنے کے لیے بھیج دیا۔ مسلمان اس قافلے تک تو نہ پہنچ سکے البتہ ان کا سامنا نسبتاً خاصی بڑی فوج سے ہو گیا جو قریش نے اپنے قافلے کی

حفاظت کے لیے بھیجی تھی۔ جنگِ بدر مدینہ سے جنوب مغرب کی طرف 100 کلومیٹر کے فاصلے پر ہوئی۔ پہلی بار مسلمانوں کو اپنے اوپر ظلم کرنے والوں سے مسلح ہو کر دوبدو ہونے کا موقع ملا تھا۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود مسلمانوں نے حضرت محمدؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی قیادت میں لڑتے ہوئے مکہ والوں کے پاؤں اکھاڑ دیے اور ان میں سے کئی قیدی بنا لیے۔ جنگِ بدر کئی طرح سے مدینہ کی مسلم برادری کے لیے اہم ثابت ہوئی۔ یوں مسلمان فوجی اور سیاسی اعتبار سے ایک طاقت مان لیے گئے۔ ساتھ ساتھ باقی عرب دنیا میں قریش کا مرتبہ کم ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ اہلِ قریش اس طرح کی ذلت کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے اگلے سال ایک زیادہ بڑی فوج کھڑی کی۔ اس کا مقصد مدینہ والوں کو اتنا ہراساں کرنا تھا کہ حضرت محمدؐ کی نئی نئی حاصل ہونے والی تکریم کم کی جائے اور لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا جائے کہ حضرت محمدؐ اپنے لوگوں کی حفاظت کس حد تک کر سکتے ہیں۔ اس فوج نے مدینہ سے چند کلومیٹر دور احد نامی ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں سے وہ مدینہ کے مضافات کے مکینوں کو خوفزدہ کر سکتی تھی۔

میثاقِ مدینہ کی رو سے حضرت محمدؐ شہر اور اس کے باشندوں کی حفاظت کے پابند تھے چنانچہ ایک فوج منظم کرنا اور اہلِ مکہ کا مقابلہ کرنا ان کی مجبوری تھی۔ لیکن شہر والوں میں سے کچھ اس منصوبے کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مدینہ کے مضافات والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور فوج کو شہر کے اندر رکھ کر شہر کی حفاظت کی جائے۔ مدینہ کے یہودی قبائل بھی ان لوگوں کے ساتھ مل گئے۔ ان قبائل نے شہر سے باہر جا کر ایک زیادہ طاقتور فوج کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپؐ مجبور ہو گئے کہ اپنی توقع سے کہیں کم فوج لے کر مدینہ سے نکلیں اور قریش سے جنگ کریں۔

اس جنگ کے نتائج مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھے۔ بعد میں مسلمان ہو کر شام میں مسلمان فوجوں کی قیادت کرنے والے باصلاحیت قائد حضرت خالدؓ بن ولید کی کمان میں قریش نے مسلمانوں کو پسپا کیا اور انھیں دھکیلتے ہوئے احد کی ڈھلوانوں تک لے آئے۔ جنگِ بدر کے ہیرو حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا گیا تھا اور ان کی لاش کو مسخ کیا گیا۔ ایک وقت پر حضرت محمدؐ کے گرد صرف چند مسلمان رہ گئے اور قریش نے انھیں گھیر لیا۔ وہؐ دوبدو لڑائی میں زخمی بھی ہوئے۔ میدانِ جنگ میں مسلم فوج کو

شکست دے کر قریش نے سوچا کہ حضرت محمدؐ کی قدر و وقعت ضرورت کے مطابق کم ہو گئی۔ یہ مقصد پورا ہونے کے بعد وہ مکہ واپس چلے گئے۔

قریش کی امیدوں کے برعکس جنگِ احد سے نہ تو اسلام ختم ہوا اور نہ ہی پیغمبرؐ کے اقتدار میں کچھ فرق آیا۔ لیکن اس نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تناؤ کا آغاز کیا۔ اس لیے کہ یہودیوں نے میدانِ جنگ سے گریز کرتے ہوئے میثاقِ مدینہ کا پاس نہیں کیا تھا۔ واضح ہو چکا تھا کہ مسلمانوں اور اہلِ قریش میں سے کوئی بھی دوسرے کو میدانِ جنگ میں حتمی اور فیصلہ کن شکست نہیں دے سکتا۔ چنانچہ، ایک بار پھر، دونوں نے خطے میں آباد بہت سے قبائل کو اپنے اپنے ساتھ ملانا چاہا تاکہ ایک کا پلڑا دوسرے کے مقابلے میں بھاری ہو جائے۔ اہلِ قریش کو مدینہ کے یہودی قبائل سے خاص طور پر بڑی امیدیں تھیں۔ وہ بھی حضرت محمدؐ کو اپنے درمیان سے نکالنا چاہتے تھے۔ پیغمبرؐ کی ہجرت کے سات سال بعد مکہ والوں نے شمال کی طرف سے شہر کا محاصرہ کر لیا اور شہر کے جنوبی مضافات میں آباد یہودی قبیلے بنو قریظہ سے مدد مانگی۔

یہ صورتحال یہودیوں کے لیے جوئے کی سی تھی جسے اپنے حسابوں وہ جیت سکتے تھے۔ محاصرہ کامیاب ہوتا نظر آتا تھا۔ وہ قریش کا ساتھ دے کر حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ کے لیے صاف کر سکتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ قریش اور ان کے یہودی حلیف دونوں ناکام رہے۔ ایک ایرانی مہاجر حضرت سلمانؓ کے مشورے پر آپؐ نے محاصرے کا مقابلہ کرنے کے لیے شہر کے گرد ایک خندق کھودی۔ یہ لڑائی، جسے جنگِ خندق کا نام دیا گیا، اہلِ قریش کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ وہ مدینہ میں حضرت محمدؐ کے اقتدار کو معمولی سا نقصان بھی نہ پہنچا سکے لیکن بنو قریظہ کے ساتھ زیادہ برا ہوا۔ انھوں نے میثاق کی شرائط توڑی تھیں اور شرائط کے مطابق سزا کے حق دار تھے۔ اس معاہدہ شکن قبیلے کو سزا دینے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا گیا۔ طے پایا کہ محاصرہ میں حصہ لینے والے مردوں کو موت کی سزا دی جائے اور عورتوں اور بچوں کو شہر سے نکال دیا جائے۔ حضرت محمدؐ نے مدینے کے یہودیوں کے متعلق اس اقدام سے ایک اہم معیار قائم کیا۔ انھوںؐ نے واضح کیا کہ ایک مسلم ریاست میں غیر مسلموں کی موجودگی پر اسلامی قانون کو کوئی اعتراض نہیں۔ سالوں سے مدینہ کے یہودیوں کو برداشت کیا جا رہا

تھا۔ لیکن جب وہ معاہدے کی شرائط کے مطابق زندگی گزارنے میں ناکام رہے اور اسلامی ریاست کے لیے خطرہ بن گئے تو انھیں سزا سنانا ضروری ہو گیا۔ ہر دیگر عمل کی طرح حضرت محمدؐ نے بنو قریظہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی آنے والے سینکڑوں سال کے لیے طے کر دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کس طرح کے ہوں گے۔

فتح

مدینہ میں اپنا مقام مستحکم کر لینے کے بعد بالآخر حضرت محمدؐ اس قابل ہو گئے کہ قریش کے ساتھ برابری کی سطح پر معاملات طے کر سکیں۔ مسلم ریاست کے استحکام پر اعتماد فتح مبین کے وعدے والی وحی سے تحریک پا کر حضرت محمدؐ 628ء میں 1500 افراد کی فوج لے کر مکہ روانہ ہوئے۔ لیکن یہ فوج ایسی نہ تھی کہ جنگ پر تلی کھڑی ہو۔ انھوں نے حج کے دو پارچوں والے لباس پہنے ہوئے تھے اور صرف سفر میں رکھی جانے والی تلواریں لگائے ہوئے تھے۔ زرہ بکتر، گھوڑسوار دستے یا جنگی علم جیسی چیزیں ان کے پاس نہیں تھیں۔ حضرت محمدؐ کو امید تھی کہ انھیں حج کے لیے مکہ میں داخلے اور کعبہ تک رسائی کے لیے جنگ نہیں لڑنا پڑے گی۔ انھوںؐ نے مکہ کی حدود پر واقع حدیبیہ میں پڑاؤ ڈالا اور مکہ کی مقدس سرزمین میں داخلے کے لیے قریش کی اجازت کا انتظار کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ مسلمانوں کی اس دلیری پر ہکا بکا تھے۔ مکہ سے فرار ہونے کے صرف چھ سال کے بعد انھوں نے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے دیتے تو وہ دیگر عرب قبائل کو کمزور نظر آتے کہ ایک نیم مسلح فوج کو شہر میں داخل ہونے سے نہ روک سکے۔ دوسری طرف مکہ میں ان کا اصل کام ہی حجاج کو سہولیات فراہم کرنا تھا اور وہ اپنے اس فرض میں بہت سنجیدہ چلے آرہے تھے۔ بالآخر انھوں نے حضرت محمدؐ کے ساتھ ایک معاہدے پر بات چیت شروع کی۔ وہ مان گئے کہ اگلے سال قریش کے لوگ شہر کو تین دن کے لیے خالی کر دیں گے تاکہ حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھی حج کر لیں۔ لیکن اس سال حضرت محمدؐ کو اپنے آبائی شہر میں داخل ہوئے بغیر مدینہ لوٹنا ہوگا علاوہ ازیں ایک جنگ بندی کا معاہدہ بھی ہوا۔ دس سال تک مکہ اور مدینہ کے لوگ

اوران کے حلیف قبائل جنگ نہیں لڑیں گے۔ کچھ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کی شرائط پر کھلی بے اطمینانی تھی۔ انھیں مکہ میں فوری رسائی یا، حتیٰ کہ، قریش پر کامل فتح کی امید تھی۔

لیکن اس معاہدے کے باعث فوری خطرات اور تنازعے کی طرف سے فراغت ملی۔ یوں حضرت محمدؐ کو موقع ملا کہ اسلام کو مدینہ کی حدود سے باہر تک پھیلا سکیں۔ اندرونی کشاکش اور بیرونی حملے کے خوف سے چھٹکارا پا کر حضرت محمدؐ کے پاس جزیرہ نما عرب کے طول وعرض بلکہ اس سے بھی پرے شمال میں ایرانی اور بازنطینی سلطنت تک اپنے مبلغین بھیجنے کے مواقع موجود تھے۔ بدو قبیلے بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے اور پیغمبرؐ کے حلیف بن گئے۔ حتیٰ کہ مکہ میں بھی کچھ لوگوں نے مذہب بدلا۔ حدیبیہ کے بعد عربوں کے دو عظیم فوجی کمانڈر حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص مکہ سے نکلے اور مدینہ آ گئے۔ اس معاہدے نے مسلمانوں کو اپنے مقدس ترین مقام تک فوری رسائی تو نہ دی لیکن اس کے طفیل اسلام پورے جزیرہ نما میں دن دوگنی رات چوگنی رفتار سے پھیلنے لگا۔ مکہ میں کٹر اسلام دشمنوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ فقط چند سال پہلے وہ اسلام کو ختم کرنے کی امید لگائے ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں معاہدے کے تقدس کا بھی پوری طرح خیال نہیں رکھا گیا۔ معاہدے کی تکمیل کے صرف دو سال کے بعد قریش کے ایک حلیف قبیلے نے مکہ کی سرحدوں پر آباد حضرت محمدؐ کے ایک حلیف قبیلے پر اچانک حملہ کر دیا۔ یہ واقعہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھا جس کے تحت دس سال تک کوئی جنگ نہیں ہونا تھی۔ جب معاہدہ ٹوٹ گیا تو حضرت محمدؐ پورے جزیرہ نما سے اپنے حلیف قبائل کو بلا کر مکہ پر مہم جوئی کر سکتے تھے۔ لیکن اس بار انھیں پرامن زیارتیوں کی طرح سفر نہیں کرنا تھا۔ بالآخر حضرت محمدؐ جنگ کے اہل ہو گئے تھے۔ پورے جزیرہ نما میں ہزاروں مسلمان ان کے حکم کے تابع تھے۔ بہت سے غیر مسلم بھی کچھ معاہدوں کی رو سے ان کی طرف سے لڑنے کے پابند تھے۔ مکہ والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ عسکری ذرائع سے پیغمبرؐ کو کسی صورت شکست نہیں دے سکتے تھے۔ اس بار اہلِ مکہ کو درجنوں متحدہ عرب قبائل کا سامنا تھا جو عرب کی تاریخ میں پہلی بار اکٹھے ہوئے تھے۔ حضرت محمدؐ اور قریش کے درمیان بات چیت ناکام ہوئی اور سارے عرب سے 10,000 افراد پر منتخب لشکر مقدس شہر مکہ کی طرف بڑھا۔

اہلِ مکہ میں سے زیادہ تر نے جان لیا کہ مزاحمت بے سود ہوگی۔ سوائے چند چھوٹی موٹی جھڑپوں کے حضرت محمدؐ کی فوج بغیر خون بہائے شہر میں داخل ہوگئی۔ حضرت محمدؐ کی اپنی جائے پیدائش کو فاتحانہ واپسی ان کے ماننے والوں کے لیے کثرت پرستی پر اسلام اور باطل پر حق کی فتح تھی۔ کعبہ کے گرد موجود سینکڑوں بت توڑ ڈالے گئے اور عبادت گاہ کو صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے پاک کر دیا گیا۔ مکہ کے سردار ابوسفیان سمیت مکہ کے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی مکمل فتح ان کے دیوتاؤں کے محض ان گھڑت مورتیاں ہونے کے باعث ہوئی تھی۔ انھوں نے حضرت محمدؐ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا۔ انھیں حضرت محمدؐ کے سامنے جنھیں جبراً شہر سے نکالا گیا اور جن سے جنگ کی گئی۔ لیکن حضرت محمدؐ نے بطور فاتح بڑی نرمی کا سلوک کیا۔ مکہ کے زیادہ تر باشندوں کو کوئی ضرر نہ پہنچا۔ یہ قبائلی جنگوں کے عادی لوگوں کے لیے بڑی بات تھی جن میں خون آشامی کے خوفناک مظاہر دیکھنے کو ملتے تھے۔ پیغمبرؐ نے ایک بار مثال قائم کر دی کہ انؐ کی رسالت سے ایک نئے عہد کا آغاز ہو رہا ہے جس کے قواعد اور طور طریقے سابقہ ادوار سے الگ ہیں۔ قبل اسلام کے زمانے یعنی دورِ جاہلیت کو ہمیشہ کے لیے ماضی میں چھوڑ دیا جانا تھا۔

فتح مکہ سے چند سال قبل کی حیاتِ حضرت محمدؐ کو ذہن میں رکھیں تو اس کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ فقط آٹھ سال پہلے وہؐ آدھی رات کو اپنے خون کے پیاسوں سے چھپ کر نکلے تھے۔ پھر وہؐ ہزاروں کی فوج لے کر بطور فاتح اپنے آبائی شہر لوٹے۔ اتنی جلدی اقتدار حاصل کر لینے اور پرانی قبائلی دشمنیاں ختم کروا کر اتنے بہت سے مختلف لوگوں کو اسلامی علم تلے جمع کر لینا معجزانہ کارنامہ تھا اور بہت سوں کے نزدیک انؐ کی نبوت کے آثار میں سے ایک تھا۔ ابتدائی سالوں میں اہلِ مکہ کے ظلم سہنے والے اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے دونوں طرح کے لوگوں کا ایمان تھا کہ اسلام میں کچھ ضرور ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کو خدا کی رہنمائی اور پشت پناہی حاصل ہے اور، اسی لیے، اس کے سچے دین کو باقی دنیا تک پہنچانا ان کا خاص مقصدِ حیات ہونا چاہیے۔ دنیا کی کارگاہ میں مسلمان خود کو جس انداز میں دیکھتے رہے ہیں، اس کی تشکیل اسی اندازِ فکر و نظر نے کی تھی۔

نبوت کا اختتام

مکہ فتح ہوا تو حضرت محمدؐ ساٹھ برس کے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے وہ عمر رسیدہ شمار ہونے لگے تھے۔ قرآن کی صورت متشکل ہونے والی مسلسل وحی الٰہی اور احادیث نبوی کی صورت میں اسلام کے اصول متعین ہو چکے تھے۔ یہ اصول ارکانِ دین سے عبادات کے طریقوں اور اسلامی طرزِ حکومت تک ہر چیز کا احاطہ کرتے تھے۔ ایک نئے معاشرتی نظام کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس نظام نے قبائلیت اور قومیت کو پیچھے چھوڑ کر قوانین الٰہی کے تحت قائم ہوئی اسلامی وحدت پر زور دیا۔ اپنے آخری خطبے میں حضرت محمدؐ نے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ''تم سب حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا کی اولاد ہو جنھیں مٹی سے پیدا کیا گیا۔ خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر برتری نہیں سوائے اس کے کہ اگر وہ زیادہ خدا رسیدہ ہو۔'' حضرت محمدؐ کے اس مذہبی اور معاشرتی پیغام کے اندر ایک سیاسی پیغام بھی تھا جس نے سارے جزیرہ نما عرب پر محیط اسلامی سلطنت کو جنم دیا۔ اپنی تاریخ میں عرب پہلی بار متحد ہوئے تھے۔ آپؐ نے اسلامی اثرات کو جنوب میں بازنطینی اور ایرانی سرحدوں پر بسنے والے قبائل تک پہنچا دیا۔ ان اثرات سے یہ دو عظیم سلطنتیں بے خبر نہ تھیں اور وہ جلد ہی اس میں مضمر خطرات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگیں۔ مکہ فتح کرنے کے بعد حضرت محمدؐ پھر مدینہ واپس چلے گئے جسے انھوںؐ نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ بہرحال جب اوس و خزرج نے انھیںؐ مدینہ آنے کی دعوت دی تھی تو انھوںؐ نے وعدہ کیا تھا کہ وہؐ امت کی قیادت اسی نخلستان سے کریں گے۔ یہاں انھوںؐ نے ایک ایسی جماعت تیار کرنا شروع کی جسے انؐ کے وصال کے بعد بھی باقی رہنا تھا۔ اب آپؐ ایک حقیقی مسلمان کے فرائض پر زیادہ تفصیلی گفتگو کرنے لگے تھے۔ اسی دور میں انھوںؐ نے قرآن کی حفاظت پر بھی کام کیا۔ 632ء کے اوائل میں انھوںؐ نے بغرض حج مکہ کا سفر کیا۔ انھوںؐ نے اپنے ہزاروں ماننے والوں کے سامنے خطبہ دیا جو اپنے مقام و مرتبہ سے قطع نظر سادہ سفید عبائیں پہنے ہوئے تھے اور باہم مساوات کو محسوس کر رہے تھے۔ انھوںؐ نے اپنے ماننے والوں کو تاکید کی کہ ظلم سے باز رہیں، عورتوں کے ساتھ عزت اور محبت سے پیش آئیں۔ ہزاروں سال سے عرب معاشرت پر داغ چلی آنے والی پرانی قبائلی دشمنیوں کو بھول جائیں۔ اس الوداعی خطبے میں انؐ کے پیغامِ نبوت کا خلاصہ سمویا

ہوا تھا۔ اسے ہر اعتبار سے ایک مکمل انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ آپؐ کے ساتھیوں کو کامل یقین تھا کہ دنیا میں ایک نئے نظام کا ظہور ہو رہا ہے جس کی بنیاد قوانینِ الٰہی اور آپؐ کے اسوہ حسنہ پر اٹھائی گئی ہے۔

حج کے بعد آپؐ مدینہ لوٹ آئے۔ یہاں انھوںؐ نے اسلام کی اشاعت کے تسلسل کے لیے اقدامات کیے۔ یمن اور عرب کے مشرقی کنارے پر بسنے والے نومسلموں کی تربیت کے لیے صاحبِ علم لوگ بھیجے۔ رسولؐ اللہ کے قریب رہنے والے لوگوں کا مسکن یعنی مدینہ اسلامی علوم کا محور بن گیا۔ پیغمبرؐ کے بعد اسلامی دنیا یہاں کے عالموں سے استفادہ کرتی رہی۔ بازنطینیوں کے خلاف ایک مہم تیار کی گئی۔ جنگ کی اسلامی اخلاقیات، جس سے آنے والے مسلمانوں نے آئندہ صدیوں میں استفادہ کرنا تھا، مرتب کی گئیں۔

اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت محمدؐ کو خدا کے پیغمبر کا کردار ادا کرنا تھا۔ لوگوں تک خدا کا کلام یعنی قرآن پہنچانا تھا اور مسلمانوں کو تعلیمات پر عمل کر کے دکھانا تھا۔ بطور رسولؐ خدا کا کام کرتے ہوئے آپؐ کو تیئس برس ہو گئے تھے۔ حضورؐ نے خدا کی طرف سے تفویض کردہ مشن مکمل کر دیا تھا۔ قرآن کو حتمی شکل دی جا چکی تھی۔ اسے کپڑے، چمڑے اور ہڈیوں پر لکھا جا چکا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے بہت سے ساتھیوں نے اسے زبانی یاد کر لیا تھا۔ عرب میں قبل اسلام سے طویل منظوم کلام زبانی یاد کرنے کی روایت نے عربوں کو قرآن مقدس حافظے میں محفوظ کرنے اور رکھنے کا اہل کر دیا تھا۔ حضرت محمدؐ کے اقوال و اعمال کے بیان کو بھی اہمیت دی گئی۔ انھیںؐ سینہ بہ سینہ پورے عرب میں پھیلا دیا گیا۔ اسلامی روایات کے مطابق قرآن کی آخری نازل ہونے والی آیات میں سے ایک میں آپؐ سے یوں خطاب کیا گیا ہے، ''آج ہم نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے منظور کر لیا ہے۔ (قرآن 5:3)۔

632ء کے اوائل میں حضرت محمدؐ بیمار ہو گئے۔ انھیںؐ شدید سر درد اور بخار تھا۔ وہ اپنے چچازاد حضرت علیؓ اور چچا حضرت عباسؓ کے سہارے چلتے تھے۔ جب وہ مسجد میں پنج وقتہ نماز کی امامت نہ کروا سکے تو انھوںؐ نے اپنے دوست اور صحابی حضرت ابوبکرؓ سے امامت کروانے کا کہہ دیا۔ انھوںؐ نے زندگی کے آخری ایام اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں گزارے جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی

تھیں۔آپؐ مسجد سے ملحق گھر کی دیوار پر سے دیکھ سکتے تھے کہ انؐ کی عدم موجودگی میں بھی امت نماز پڑھ رہی ہے۔ بلاشبہ انؐ کے ساتھیوں کے لیے یہ لمحات بڑے جذباتی تھے۔ان لوگوں نے آپؐ کے ساتھ مکہ میں بڑے مشکل دن گزارے تھے۔ بڑی تندو تیز جنگوں میں حصہ لیا تھا اور بالآخر ایک قطرہ خون بہائے بغیر مکہ فتح کر لیا تھا۔ انھوںؐ نے اپنے آخری ایام حضرت عائشہؓ کی گود میں سر رکھ کر آرام کرتے گزارے۔ خاندان کے لوگوں اور دوستوں میں سے زیادہ قریبی اپنے رہنما کے صحت یاب ہونے کی امید میں ان سے ملتے رہتے لیکن اسلام کے مرکزی اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ خالص توحید پر کسی طرح کا سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ حضرت محمدؐ کی تعلیم تھی کہ انسان، جانور، درخت حتیٰ کہ فرشتے بھی مخلوق ہیں اور سب کو بالآخر مرنا ہے۔ ہمیشہ رہنے والی ذات فقط اللہ کی ہے۔انھوںؐ نے زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی کے لیے حضرت محمدؐ سے رجوع کیا تھا۔ انؐ کی گفتگو میں موت کا بڑھتا ہوا ذکر اور امامت کے لیے کھڑے ہونے میں دشواری یقیناً مسلمانوں کے لیے بھاری صدمات تھے۔ چنانچہ جہاں وہ انؐ کی رحلت کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے وہاں وہ یہ بھی مانتے تھے کہ اسلام انؐ کے بعد بھی ہمیشہ رہے گا۔ حضرت محمدؐ کے پیروکاروں کی آپؐ کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی تھی کیونکہ وہ انھیںؐ قبل اسلام کی کثرت پرستی اور قبائلی جنگ وجدل سے نکال کر لائے تھے۔ وہ انؐ کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انؐ کے ماننے والے مسجد میں انؐ کی صحت یابی کی خبر کے منتظر تھے، جب انھوںؐ نے 8 جون 632ء کو حضرت عائشہؓ کی گود میں سر رکھے آخری سانس لی۔ اس طرح 23 سال پر محیط اسلامی تاریخ کا پہلا دور ختم ہوا۔

تیسرا باب

خلفائے راشدین

پیغمبرؐ کی رحلت پر مدینہ کی گلیوں میں بڑی جذباتی کیفیت تھی۔ مسلمانوں کے لیے اس حقیقت سے سمجھوتہ مشکل تھا کہ آپؐ اس دنیا میں نہیں رہے۔ کچھ مسلمانوں نے تو شروع میں اس خبر کی صداقت سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن آپؐ کی رحلت کے ساتھ ہی جانشینی کا سوال بھی سامنے آیا۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ حضرت محمدؐ نے مسلم برادری کی سیاسی اور مذہبی رہنمائی کی تھی۔ خدا کے ساتھ ان کے براہِ راست تعلق کا مطلب تھا کہ معاشرہ اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی رہنمائی میں چل رہا ہے۔ اب جبکہ خدا سے تعلق کا وہ واسطہ نہیں رہا تھا تو آپؐ کے قائم کردہ معاشرے کا کیا بنے گا؟ اور بالخصوص یہ کہ آپؐ کے بعد امت کا رہنما کون ہوگا؟

حضرت محمدؐ کی تدفین سے بھی پہلے مکی مہاجرین کے ممتاز افراد کا ایک گروہ اور مدینہ کے لوگ قیادت کے سوال پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ سوال یہ تھا کہ اس نوعمر مسلم ریاست کی قیادت کسے سونپی جائے۔ اس مسئلے پر اختلافات کی شدت سے خطرہ ہو چلا تھا کہ امت تقسیم نہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کسی طرف سے دو ریاستی حل کی تجویز بھی آئی ہو۔ ایک ریاست جسے اہلِ مدینہ چلائیں اور دوسری اہلِ مکہ کی ہو۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو متحدہ مسلم ریاست کا سربراہ نامزد کر دیا جس کا صدر مقام مدینہ طے پایا۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب فطری تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد اسلام

لانے والے دوسرے شخص حضرت ابوبکرؓ تھے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کے سفر میں بھی وہی حضرت محمدؐ کے ساتھی تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں حضرت محمدؐ نے انھیں اپنی جگہ امامت کے لیے بھی چنا تھا۔ اگر چہ ان کا تعلق اہلِ مکہ سے تھا لیکن مہاجرین یا انصار میں سے کسی کو ان کی اہلیت پر اختلاف نہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ

حضرت ابوبکرؓ نے 631ء میں خلیفۃ الرسول کا لقب اختیار کیا یعنی رسولؐ کا جانشین۔ اس لقب کا اختصار خلیفہ ہے۔ خلیفہ کا مطلب نیا پیغمبر نہیں تھا۔ قرآن میں بالکل واضح ہے کہ حضرت محمدؐ آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اس کی بجائے خلیفہ کا کردار ایک سیاسی رہنما کا تھا جسے ریاستِ مدینہ کے سربراہ کی حیثیت سے حضرت محمدؐ کی قائم کردہ مثالوں پر عمل کرنا تھا۔ چنانچہ خلیفہ سے توقع تھی کہ وہ ایک مدبر رہنما ہوگا۔ مسلم ریاست کے معاملات مستعدی سے چلائے گا اور لوگوں کو اسلام کی تعلیمات پر بہترین صلاحیتوں کے مطابق چلنے پر مائل کرے گا۔ ان کاموں میں حضرت ابوبکرؓ کی مثال کو بعد میں آنے والے خلفاء کے لیے مثال بننا تھا جس پر ان کی کارکردگی کو جانچا جانا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمدؐ کے سیاسی اہداف کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ایک فوجی مہم بازنطینیوں کے ساتھ لڑائی کے لیے جنوبی شام کی طرف بھیجی۔ یہ مہم فریقین کے درمیان پہلے ہونے والے ایک تصادم کے جواب میں تھی۔ اس مہم سے ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد بھی مسلم امت اپنے سیاسی اہداف ترک نہیں کرے گی۔ لیکن یہ سب اتنا اہم نہیں تھا جتنا خطرہ مدینہ کے مشرق میں واقع ریگستان سے تھا۔ وہاں اسلام میں نئے داخل ہونے والے بعض بدوی قبائل اسلام سے پھر رہے تھے یعنی مرتد ہو رہے تھے۔ ان کی منطق بڑی سادہ تھی کہ ان کی بیعت حضرت محمدؐ کے ہاتھ پر تھی اور، انؐ کے رحلت فرما جانے کے بعد، اب وہ اس کے پابند نہیں رہے تھے۔ مدینہ میں قائم حکومت سے ان کی قطع تعلق کی خواہش منظم حکومت کے خلاف عربوں کی روایتی ناپسندیدگی بھی ہو سکتی تھی۔ صدیوں سے عرب آزادانہ آوارہ خرامی کرتے چلے آرہے تھے اور انھیں تابع رکھنے یا کسی طرح کے محاصل کا تقاضا کرنے والی مرکزی حکومت کی عادت نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ حضرت محمدؐ کی زندگی میں

انھوں نے اس طرح کا انتظام کرا ہتاً یا کینہ رکھتے ہوے مجبوراً قبول کرلیا ہو لیکن حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قبول کرنے کو تیار نہ ہوں۔ منظم حکومت کے خلاف ان کی نفرت کے ساتھ ہی ساتھ نبوت کے بہت سے دعویدار بھی سامنے آ گئے جن میں سے نمایاں ترین مسیلمہ تھا جسے بعد کے اسلامی ذرائع نے مسیلمہ کذاب کے نام سے یاد کیا۔

کسی بچے کو، عورت کو یا بوڑھے کو قتل نہ کرو۔ درختوں اور بالخصوص پھل دار درختوں کو نقصان نہ پہنچاؤ اور نہ ہی جلاؤ۔ دشمن کے ریوڑوں کو ذبح نہ کرو جب تک ان کی ضرورت نہ ہو۔ تمھارا گزر ایسے لوگوں میں ہوگا جو خانقاہی زندگی کے لیے وقف ہو چکے، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جنگی قواعد جو حضرت ابوبکرؓ نے فوج کو دیے

ان قبائل نے زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کر دیا جو اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے نئے پیغمبروں کو تسلیم کرلیا۔ ان امور کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ نے انھیں دائرۂ اسلام سے خارج اور دین کے لیے خطرہ قرار دیا۔ اگر گروہوں کو فیصلہ کرنے دیا جائے کہ وہ اسلام کا کون سا پہلو اختیار کرنا پسند کرتے ہیں یا انھیں خود کو پیغمبر کہلانے اور اپنی اپنی مرضی کا مذہب وضع کرنے دیا جائے تو پھر سینکڑوں اشکال بنیں گی اور اسلام کا تقدس ختم ہو جائے گا۔ بلاشبہ قرآن میں بیان کردہ گزشتہ اُمتوں کے احوال بھی حضرت ابوبکرؓ کے ذہن میں ہوں گے جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوے مذاہب کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ خدا نے ان لوگوں کو سرزنش کی تھی کہ ان گناہوں پر روزِ حساب انھیں سزا دی جائے گی۔ مسلمان برادری کے ایک خدا ترس شخص ہونے کے حوالے سے حضرت ابوبکرؓ اس انجام سے بہرصورت بچنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھیں فوجی کارروائی کرنا پڑی۔ انھوں نے باغیوں کو کچلنے کے لیے ایک فوج حضرت خالدؓ بن ولید کی سربراہی میں بھیجی۔ جزیرہ نما عرب میں حضرت خالدؓ ایک معروف کمانڈر تھے۔ اسلام لانے سے پہلے اور بعد میں ان کی زیرِ قیادت لڑنے والی کسی فوج کو شکست نہیں ہوئی تھی۔ صحرائی جنگی چالوں اور گھڑسوار دستوں کے استعمال پر اپنی دسترس کے باعث

وہ اس مہم کی قیادت کے لیے بہترین انتخاب تھے۔

مدینہ کو باغیوں کے کسی ممکنہ حملے سے محفوظ بنانے کے بعد وہ فوج کو لے کر مشرق رخ بڑھے جہاں زیادہ تر باغی قبائل موجود تھے۔ مسیلمہ کی فوج کسی طرح بھی حضرت خالدؓ بن ولید کی فوج کے جوڑ کی نہ تھی چنانچہ اس کی فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور اسے کچل دیا گیا۔ خود مسیلمہ مارا گیا۔ خلیفہ کی وفادار فوجیں ایک ایک کر کے سارے جزیرہ نما میں پھیل گئیں۔ قبائل کو دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی۔ جنھوں نے بغاوت جاری رکھی ان کے خلاف جنگ کی گئی۔ 633ء تک ارتداد کی جنگیں ختم ہو گئیں اور سارے جزیرہ نمائے عرب کو ایک متحد اسلامی سلطنت کی شکل دے دی گئی۔

اسلام درپیش اولین سیاسی چیلنج سے سرخرو نکل آیا تھا۔ یہ چیلنج پیغمبرؐ اسلام کی رحلت کے بعد اسلام اور اس کی سیاسی قیادت سے وفاداری کے سوال پر سامنے آیا تھا۔

ارتداد کی ان جنگوں سے مسلم دنیا کے مستقبل کے حوالے سے ایک اہم نظیر قائم ہوئی۔ اول تو یہ بات صاف ہوئی کہ اسلام کی روحانی وحدت کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ جھوٹے نبیوں اور انحراف کو قطعی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلامی عقائد کی رو سے جن سابقہ امتوں نے اللہ کا پیغام قبول کرنے کے بعد اس سے انحراف کیا انھیں راستی پر لانے کے لیے مزید پیغمبر بھجوائے گئے۔ لیکن حضرت محمدؐ کی نبوت کے حتمی اور آخری ہونے کا مطلب تھا کہ اگر مسلمان منحرف ہوتے ہیں تو انھیں کوئی پیغمبر آ کر سیدھا نہیں کرے گا۔ اسلام اپنے پیغمبر کی زندگی میں جس طرح کا تھا، بعد میں اسی طرح کا رکھنا اشد ضروری تھا اور اس حوالے سے کسی غلطی کی گنجائش نہ تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی مہمات سے عیاں ہو گیا کہ اسلام کے الوہی پیغام کی حفاظت کے لیے مسلمان مسلح کارروائی سے گریز نہ کریں گے۔ دوسرے ان مہمات نے مسلم دنیا کی سیاسی وحدت کو، کم از کم وقتی طور پر، یقینی بنا دیا۔ مسلم دنیا میں صرف ایک رہنما کی گنجائش موجود تھی۔

جزیرہ نما عرب ساسانی اور بازنطینی دو عالمی طاقتوں کے درمیان واقع تھا۔ بین الاقوامی اکھاڑے میں بقاء کے لیے ان کی وحدت ضروری تھی۔ ارتداد کے خلاف جنگوں میں واضح کر دیا گیا تھا کہ مسلم ریاست ایک ہو گی اور ان کا رہنما بھی ایک ہی مسلمان یعنی خلیفہ ہو گا۔ تیسری اور شاید اہم ترین بات

یہ تھی کہ مرکزی حکومت کے مقتدر ہونے کی توثیق کر دی گئی تھی۔ عرب قبائل کے لیے وحدت اور سینکڑوں میل دور واقع مرکزی حکومت کی قبولیت ایک نامانوس اور اجنبی خیال تھا۔ ارتداد کی جنگوں نے ایک نیا اندازِ فکر بھی قائم کر دیا کہ آنے والی (مثالی) اسلامی تاریخ میں عربوں کا خانہ بدوش ماضی سے قطع تعلق رکھا جائے گا اور عدم مرکزیت سے گریز کیا جائے گا۔ عرب اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ اس تبدیلی کی عکاسی ان کے طرزِ حکومت سے بھی ہونا چاہیے تھی۔

اسلامی ریاست کے تسلسل کو تقویت دینے کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اس اعتبار سے بھی اہم تھی کہ قرآن کو تحریری شکل دے کر محفوظ کیا گیا۔ پیغمبرؐ کی زندگی میں بھی بہت سے کاتب مقرر تھے کہ وہ ہر تازہ وحی کے اترتے ہی اسے تحریر کر لیا کریں۔ ان مسودوں کو ایک کتابی شکل میں مدون نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ ٹکڑوں کی صورت میں مدینہ میں بکھرے ہوئے تھے۔ عرب میں لکھنا اور پڑھنا کم لوگ جانتے تھے اور یہ زبانی یاد کر لینے والوں کا معاشرہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ نے تجویز دی کہ مسودات کو اکٹھا کیا جائے اور صحت کے لیے معتبر صحابہ رسولؐ کو حفظ حصوں کے ساتھ ملا کر دیکھ لیا جائے اور پھر ایک مرکزی جگہ محفوظ کر لیا جائے۔ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ خدانخواستہ جنھیں قرآن یاد ہے کہیں وہ مر گئے تو کیا صورت ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ تجویز مان لی اور یوں قرآن کے مسودات مدینے میں جمع کر لیے گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت 632ء سے 634ء تک صرف دو سال کی تھی۔ حضرت محمدؐ کے بعد کے ان دو سالوں میں وہ مسلم ریاست کو استحکام دینے اور اس اہل بنانے میں کامیاب رہے کہ وہ شمال کی سامراجی قوتوں کے روز افزوں زوال سے فائدہ اٹھا سکے۔ ان دو سالوں میں اس امر کے نظائر بھی قائم کیے گئے کہ پیغمبرؐ کے بعد مسلم معاشرے اور اسلامی عقیدے کو برقرار رکھنے میں خلیفہ کا کردار کیا ہو گا۔ اپنے جانشین کا تقرر کرنے کے طریقہ میں انھوں نے آخری نظیر قائم کی۔ اپنی موت کے بعد مسلم قیادت کے لیے، قبل اسلام کی عرب روایات کے برعکس، اپنے کسی رشتے دار کو نہیں چنا۔ ان کا انتخاب ایسا شخص تھا جو ان کے خیال میں خلیفہ کے فرائض کی انجام دہی کے لیے زیادہ موزوں اور اہل تھا۔ اپنے بسترِ مرگ پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ ابن الخطاب کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔

حضرت عمرؓ ابن الخطاب

حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ بھی پہلے پہل اسلام لانے والوں میں شامل تھے۔ انھوں نے مکہ میں اور ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ مدینہ میں بھی وہ تمام جنگوں اور اہم واقعات کے دوران حضرت محمدؐ کے ساتھ تھے۔ وہ مسلم ریاست کو چلانے کے ہر طرح سے اہل تھے۔ مسلم روایات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے خلیفہ بننے پر کسی طرح کا عدم اتفاق موجود نہ تھا۔ حکومت اور جانشینی میں اس طرح کا استحکام بعد کی اسلامی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملا۔

حضرت ابوبکرؓ کے برعکس حضرت عمرؓ کو سیاسی عدم استحکام اور دینی تسلسل جیسے مسائل سے نہیں نمٹنا پڑا۔ پورا جزیرہ نما ان کی زیرِ قیادت متحد تھا۔ ارتداد کے خلاف جنگوں میں مسلم فوج پورے جزیرہ نما میں پھیل گئی تھی۔ اس سے مسلم ریاست کو ایسا اعتماد اور مہارتیں میسر آئیں کہ انھوں نے سنجیدگی سے سلطنت کی حدود شمال میں پھیلانے پر سوچنا شروع کر دیا۔ اب جزیرہ نمائے عرب کی ضروریات اور حالات کے مطابق مناسب عرب طرزِ حیات بھی بدلنے کی ضرورت تھی۔ عرب صدیوں سے متحارب قبائل کے چھاپوں اور اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی پر سمجھوتے کرتے زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اب جبکہ عربوں کی بھاری اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تھا تو ہمسایہ قبائل پر اس طرح چھاپے اور دھاوے اسلامی قوانین سے متصادم مان لیے گئے تھے۔ بہت سے مواقع پر اپنے خطبات میں حضرت محمدؐ نے ساری مسلم آبادی کو ایک ہی امت اور قوم قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ امت کا اپنے اندر مستقل تفریق اور تنازعات لے کر تاریخ کو آگے بڑھانا قابلِ فہم نہیں تھا۔ جزواً امت کے اندر تنازعات کے امکان ختم کرنے کے لیے اور جزواً بازنطینی اور ساسانی سرحدوں کے اندر اسلام قبول کرتے عرب قبائل کو تحفظ دینے کی غرض سے مسلم فوجوں نے شمال کا رخ کیا جہاں انھیں عظیم فتوحات حاصل کرنا تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دوسرے سال میں ساسانیوں کے زیرِ اقتدار میسوپوٹیمیا پر مسلمانوں کے دھاوے شروع ہو چکے تھے۔ یہ سلسلہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں بھی برقرار رکھا گیا۔ پہلے پہل حضرت عمرؓ اور دوسرے ممتاز صحابہ پیش بینی نہیں کر پائے تھے کہ اس طرح کے دھاوے مستقل فتوحات بن

جائیں گی۔ لیکن 603ء سے 628ء تک بازنطینیوں اور ساسانیوں کے درمیان ہونے والی تباہ کن جنگوں نے دونوں سامراجی قوتوں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ اپنی حدود کے اندر ہونے والے موج در موج عرب دھاووں کو روک نہ سکیں۔ اب انھیں فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو بس ایک منظم حملہ کرنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اس جنگ کو بھی ایک نئی طرح کی جنگ ہونا تھا۔ ان دو عالمی طاقتوں کے درمیان جنگوں کے نتائج صرف تباہی و بربادی کی صورت میں نکلتے تھے لیکن مسلمانوں کے اعلانِ جنگ میں حضرت محمدؐ کے پیغام کے مطابق انصاف اور سماجی آہنگ کے حصول کا نعرہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے پہلی فوج روانہ کی تو اُسے حکم دیا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی سلامتی کو یقینی بنائے، خانقاہوں میں بیٹھے راہبوں سے لاتعلق رہے اور حتیٰ کہ، فصلوں کو بھی تباہ نہ کرے۔ ان فتوحات میں مصروف عربوں کے یہ قوانین ان سے بہت مختلف رہے ہوں گے جن پر وہ قبولِ اسلام سے قبل عمل کرتے رہے تھے۔ لیکن حضرت محمدؐ کی تحریک ابتدا سے ہی انقلابی چلی آ رہی تھی۔ ضروری تھا کہ پرانے خیالات، روایات اور طرزِ حیات کو ختم کر کے ان کی جگہ نئے نظام کو دی جائے۔ سوچ کا یہ انداز میدانِ جنگ میں بھی رائج کرنا تھا۔

633ء میں فوجیں ایک ساتھ شام اور میسوپوٹیمیا کو بھیجی گئیں۔ ارتداد کی جنگوں میں تازہ تازہ فتحیاب حضرت خالدؓ بن ولید کو ایران جانے والے دستوں کی قیادت دی گئی۔ شام بھیجی جانے والی فوج کی قیادت ابوسفیان کے بیٹے یزید کے پاس تھی۔ اس نے جاتے ہی غزہ کے قریب بازنطینی فوج کو شکست دی۔ حیران کن طور پر اتنے بڑے نقصان سے بازنطینیوں کو اندازہ ہوا کہ یہ معمول کا دھاوا نہیں بلکہ ایک بھرپور حملہ تھا۔ شہنشاہ ہیراکلیس نے شاہی فوجوں کو حکم دیا کہ عربوں کو اپنی فتح مستحکم کرنے کا موقع دیے بغیر کچل دیا جائے۔ مدینہ کی حکومت کو اس چال کی توقع تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید عراق میں تھے اور کچھ کامیابیاں حاصل کر چکے تھے۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ فوراً عراق سے نکلیں اور شام کا صحرا عبور کرنے کے بعد غزہ کی طرف بڑھیں۔ متحدہ مسلم فوجوں نے یروشلم سے تیس کلومیٹر دور اجنادیان میں بازنطینی فوج کا سامنا کیا۔ بادشاہ کے دو بھائیوں کی زیرِ قیادت لڑنے والی شاہی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ جنوبی فوج میں موجود باقی بازنطینی دستے مضبوط دفاع کے حامل شہروں یروشلم، قیصریہ (Caesarea) اور

غزہ کی طرف پسپا ہو گئے۔ فتح یاب مسلمانوں کو فلسطین کے دیہی علاقوں میں آزادانہ پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی زیرِ قیادت مسلم فوجوں نے شمال رخ واقع قدیم شہر دمشق کا محاصرہ کرنے کے بعد اسے 635ء میں فتح کر لیا۔ شہر کے مطیع ہو جانے کے بعد طے پانے والے معاہدے نے مقامیوں کے خدشات ختم کر دیے۔ معاہدے کے مطابق: ''جب تک اہلِ شہر مسلم حکومت کو خراج دیتے رہیں گے، حضرت عمرؓ ان کی زندگیوں، مال اور مذہب کی امان کا وعدہ کرتے ہیں۔'' اس معاہدے نے بھی جنگ کو ایک نیا طریق دیا۔ وہ یہ کہ مسلم حکومت کی فوج کا ہدف صرف متحارب فوج اور حکومت ہو گی نہ کہ عام شہری۔ اس طرح کی ضمانتوں سے شامی آبادی کی بغاوت کے امکانات بہت کم ہو گئے۔ ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بازنطینیوں سے کہیں چھوٹی بدو فوج نے شام کے ایک بڑے صوبے پر قبضہ شروع کر دیا ہے۔ دمشق کھو بیٹھنے کے بعد بازنطینیوں نے پہلے سے بھی بڑی فوج ترتیب دی تاکہ بدوؤں کو ہمیشہ کے لیے ان کے صحرا میں دھکیل دیا جائے۔ حضرت خالدؓ جانتے تھے کہ دھاووں کی عادی ان کی فوج اس بھاری بھرکم شاہی فوج کے مقابلے کی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے جنوب کی طرف ہٹنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اس ناگزیر جنگ کو کچھ دیر تک ٹالا جا سکے۔ بالآخر 636ء میں بازنطینی اور مسلم فوج کا آمنا سامنا یرموک میں ہو گیا جو آج کے اردن اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔ بازنطینی فوج حجم، سامانِ جنگ اور تربیت ہر اعتبار سے برتر تھی لیکن اس کی صفوں میں موجود بے شمار اختلافات اور کشاکش کے باعث حوصلہ بلند نہ تھا۔ عربوں کو ایک برتری اور تھی؛ انھیں سخت موسمی حالات میں جنگ کا تجربہ زیادہ تھا۔ یوں مسلم فوجوں نے بازنطینیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ میدانِ جنگ سے بھاگتی فوج کا تعاقب کیا گیا اور وہ کسی بھی عسکری مہم کو موثر طور پر سرانجام دینے کے قابل نہ رہی۔ شہنشاہ ہیراکلیس شام میں شرکت مان لینے پر مجبور تھا۔ اس کے پاس مسلم دراندازی کو روکنے کے لیے فوج اور سرمایہ دونوں موجود نہ تھے۔ ایک ایک کر کے شام کے سارے شہر فتح ہو گئے۔ ان سب کے معاہدے انھی شرائط پر ہوئے جو حضرت خالدؓ بن ولید نے دمشق میں طے کی تھیں۔ 638ء تک شام کی فتح مکمل ہو چکی تھی۔ بازنطینیوں کے خلاف جنگ یہاں سے مصر میں داخل ہوئی جسے 642ء میں فتح

کرلیا گیا۔ بازنطینی سلطنت کے خوشحال ترین خطوں میں سے دوان لوگوں نے فتح کر لیے تھے جنھیں اسلام سے پہلے شاید ہی کبھی زیرِ غور لایا گیا تھا۔

رومن شہنشاہ نے 70ء میں یہودیوں کو یروشلم سے نکال دیا۔ انھیں 631ء میں مسلم فتح تک واپس مقدس شہر جانے کی اجازت نہ ملی۔

چند سال کے اندر شام بازنطینیوں کے زیرِ تسلط ایک علاقے کی بجائے پھیلتی ہوئی مسلم سلطنت کا ایک صوبہ بن چکا تھا۔ فاتح مسلمانوں کے لیے یہ کامیابی کوئی بہت حیران کن نہیں رہی ہوگی۔ بالآخر ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک وہ حضرت محمدؐ کی وساطت سے آنے والے دین پر کاربند رہیں گے، خدا ان کا ساتھ دیتا رہے گا۔ جنگ بدر اور فتح مکہ کی مثالوں سے حضورؐ کی حیات میں ہی ان پر ثابت ہو گیا تھا کہ خدا کی مدد شاملِ حال ہو تو تمام تر مشکلات کے باوجود فتح انھی کی ہوگی۔ رومنوں کے وارث بازنطینیوں کے لیے شام کا کھو بیٹھنا سلطنت کے حتمی زوال کا نقطہ آغاز تھا۔ عیسائیوں کی مقدس سرزمین میں شاہی افواج کو دوبارہ کبھی مارچ نہیں کرنا تھا اور نہ ہی کبھی انھیں اس زرخیز خطے سے مال و دولت کی فصل کاٹنا تھی۔ خطے کے مقامی باشندوں کی زندگیوں پر بازنطینیوں کے اس نقصان کا کچھ اثر نہ پڑا۔ چرچ کھلے رہے، کسان زمینوں پر ہل چلاتے رہے اور تجارتی قافلے بھی پہلے کی طرح ہی رواں دواں رہے۔

علاقے میں حکومتی بندوبست کو نئی نہج پر ڈالنے کے لیے حضرت عمرؓ خود مدینہ سے شام آئے۔ اس ملک میں آکر انھوں نے سب سے پہلے حضرت خالدؓ بن ولید کو ان کے عہدے سے فارغ کیا۔ اس فیصلے پر حضرت خالدؓ بن ولید سمیت ہر کوئی حیرت زدہ رہ گیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو جبراً ریٹائر کرنے کی ممکنہ وجوہات میں سے ایک، جسے پرانے مسلمان مورخین نے بیان کیا ہے، حضرت عمرؓ کا مسلمانوں کو باور کرانا تھا کہ ان کی کامیابیاں حضرت خالدؓ کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے باعث تھیں۔ اگر مسلمان تاریخِ عالم کے عظیم ترین جرنیلوں میں سے ایک یعنی حضرت خالدؓ بن ولید کے بغیر بھی اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تو یہ الوہی رہنمائی کے متعلق کمزور ایمان رکھنے والوں کے

لیے ایک ثبوت ہوتا اور یہی مسلمانوں کا مقصدِ حیات بھی تھا۔ جب اس نومفتوح صوبے کے منتظم کی بات آئی تو حضرت عمرؓ نے مکی سردار ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ کو مقرر کیا۔ ان کا تعلق امیر اور طاقتور بنوامیہ سے تھا جو قبل اسلام میں بھی قریش کے منتظم حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اس حکومتی تسلسل سے کام لے کر معاویہ نے شام کو اگلے بیس برس میں ایک نومفتوح صوبے کے مقام سے اٹھایا اور اسے مسلم دنیا کا اقتصادی اور سیاسی محل بنا دیا۔

637ء میں اہلِ یروشلم نے ہتھیار ڈالے تو حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے اور یہ وقوعہ اسی سفر کے دوران پیش آیا۔ پیٹری آرک سفرونیس نے انھیں شہر کا دورہ کروایا۔ وہ ایک عرب عیسائی تھا جو یروشلم کے یونانی چرچ میں ایک ممتاز عہدے دار بن گیا تھا۔ اہلِ یروشلم کے ساتھ طے ہونے والی شرائط وہی تھیں جو شام کے شہروں میں لکھی گئی تھیں۔ مسلم فتح یروشلم کی انفرادیت یہ تھی کہ شہر کے نئے حاکموں نے 500 سال میں پہلی بار یہودیوں کو شہر میں داخل ہو کر عبادت کی اجازت دی تھی۔ قرآن حکیم میں عیسائیت اور یہودیت کو خاص تعظیم دی گئی ہے اور ان کے ماننے والوں کو ''اہلِ کتاب'' کہا گیا ہے۔ اسلامی قوانین کی رو سے بے جواز ہوتا کہ عیسائیوں کو تو یروشلم میں اپنے مقدس مقامات کی زیارت کرنے دی جائے اور یہودیوں کے لیے اس ممانعت کا بازنطینی قانون برقرار رکھا جائے۔ آزادی اور مذہبی تکثیریت کی اس نظیر کی جڑیں حضرت محمدؐ کے میثاقِ مدینہ میں تھیں جسے حضرت عمرؓ بہت عمیق سطح پر جانتے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ یہ شہر بھی اسلام کا ہے۔ اسلامی عقائد کے مطابق یہ وہی شہر ہے جہاں حضرت محمدؐ کو شبِ معراج کے سفر پر مکہ سے بھیجا گیا۔ انھوں نے حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کردہ جائے عبادت پر نماز ادا کی اور پھر آسمانوں پر بلائے گئے۔ اسلامی روایات میں یروشلم کی اہمیت کم نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو صاف کروایا اور اسے رومنوں اور بازنطینیوں کے آثار سے پاک کیا۔ انھوں نے چوٹی پر مسجد اقصیٰ کی اصل شکل استوار کروائی۔ اسے اسلام میں تیسرے مقدس ترین مقام کا درجہ حاصل ہے۔

شام فتح کر لینے کے بعد خلیفہ نے دوبارہ ساسانیوں کی طرف توجہ دی۔ جب حضرت خالدؓ کو اپنی افواج لے کر شام کی طرف جانے کا حکم دیا گیا تھا، اس کے بعد سے ساسانیوں کو زیادہ تر نظر انداز کیا

گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ کی معیت میں جنگوں کا تجربہ رکھنے والے اور جنگ کی عرب حکمت عملی کے ماہر اور جہاندیدہ سعدؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں ایک فوج میسوپوٹیمیا بھیجی۔ پہلے پہل عربوں کو جنگی ہاتھیوں کے باعث نقصان اٹھانا پڑا لیکن بالآخر 636ء کی جنگ قادسیہ میں وہ ساسانیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس فتح کے ساتھ بہت سامال عربوں کے ہاتھ لگا جسے اسلامی قوانین کے مطابق تقسیم کے لیے مدینے بھجوا دیا گیا۔ لیکن قادسیہ کی جنگ کے نتائج حتمی نہیں تھے۔ عراق پر تسلط کے لیے مدائن (Ctesiphon) یعنی ساسانی دارالحکومت پر قبضہ ضروری تھا۔ اس شہر کا دفاع کچھ زیادہ مضبوط نہ تھا۔ یہ قدیم شہر بابل سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال میں دجلہ اور فرات کے درمیانی میدان میں واقع تھا۔ دو ماہ طویل محاصرے کے بعد 637ء میں اسے مدینے کی فوجوں نے فتح کر لیا۔ اب دجلہ اور فرات کا درمیانی میدانی علاقہ پوری طرح مسلم فوجوں کی گرفت میں تھا۔ ساسانی بادشاہ اپنے حکومتی بندوبست کے ساتھ فارس کے پہاڑی علاقوں کی طرف نکل گیا۔ متواتر اور متاثر کن فتوحات کے باوجود حضرت عمرؓ نے اپنی افواج کو پسپا ہوتی فوج کے تعاقب میں عراق سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ میسوپوٹیمیا کی سرزمین عربی قبائلیوں کے لیے شناسا تھی اور صحرائی جنگ کی یہی حکمت عملی کارگر تھی۔ عرب ایرانی سطح مرتفع سے ناواقف تھے اور انھیں فیصلہ کن شکست ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ عراق کے برعکس، وہاں کی مقامی آبادی ساری کی ساری ایرانی تھی۔ توقع تھی کہ وہاں کی مقامی آبادی ساسانی فوج کے ساتھ مل کر عربوں کے خلاف مزاحمت کرتی۔

قادسیہ میں پکڑا گیا درفش کادیانی (ساسانی جھنڈے کا نام) مدینے لے جایا گیا۔ ایران کی اسلامی فتح کے نشان کے طور پر رکھ لینے کی بجائے حضرت عمرؓ نے اسے ضائع کرنے اور زرو جواہر بیچ کر غرباء کو کھلا دینے کا حکم دیا۔

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت صرف فوجی فتوحات کے حوالے سے قابل ذکر نہیں بلکہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام بھی بہت اعلیٰ کیا گیا۔ فتوحات اور ان کی مسلم ریاست میں شمولیت کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ

مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ساسانی اور بازنطینی فوج اور اشرافیہ تو مفتوحہ علاقوں سے نکل گئے لیکن عام مقامی آبادی کو نہیں چھیڑا گیا۔ مفتوحہ لوگوں کی زندگی میں دو تبدیلیاں آئیں۔ پہلی تبدیلی تو ٹیکس وصول کرنے والوں کی تھی۔ پہلے تو وہ قسطنطنیہ اور مدائن کی حکومت کو ٹیکس دیتے تھے اور جاری جنگوں کے اخراجات کے باعث ان کی شرح خاصی اونچی تھی۔ اب وہ جزیہ دیتے تھے جسے مدینہ بھجوا دیا جاتا تھا۔ اس جزیہ کی شرح زیادہ تر پرانے ٹیکسوں کی شرح سے زیادہ نہیں بلکہ اکثر بہت کم ہوتی تھی۔ ایک عام شہری کے لیے ٹیکس کی کم شرح خوشخبری ہی ہوتی ہے قطع نظر اس کے کہ ٹیکس کون وصول کرتا ہے۔ دوسری بڑی تبدیلی آبادی کے بعض گروہوں کو حاصل ہونے والی مذہبی رواداری تھی۔ حضرت مسیحؑ کے مقام کے متعلق وحدت الفطری (monophysite) عیسائیوں کا عقیدہ حاکم گریک آرتھوڈوکس سے مختلف تھا اور انھیں بازنطینی حکومت نے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ اب انھیں اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کی اجازت دے دی گئی۔ یہودیوں کو بھی حکومتی جبر سے نجات ملی۔ انھیں عبادت کے لیے اپنے مقدس ترین شہر یروشلم جانے کا موقع ملا۔ سابقہ ساسانی علاقوں میں نسطوری عیسائی بھی مذہبی آزادی سے مستفید ہوئے۔ زرتشتی حکمران مشکوک رہتے تھے کہ ان لوگوں کے بازنطینی عیسائی سلطنت کے ساتھ خفیہ روابط ہیں۔ مذہبی گروہوں کے مابین تناؤ کی کیفیت پوری طرح ختم نہ ہو پائی تھی۔ الہلال الخصیب کے باسی عیسائیوں کو صحرا کے خانہ بدوش سامیوں کی برتری آسانی سے ہضم نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود حضرت محمدؐ کی تعلیمات میں موجود مساوات کی بدولت مشرقِ وسطیٰ میں ایسی مذہبی رواداری دیکھی گئی جو اس کی زیادہ تر تاریخ میں موجود نہیں رہی تھی۔

مالی اصطلاحات میں دیکھا جائے تو فتوحات کے نتیجے میں نسبتاً سادہ عرب معاشرت میں ناقابلِ تصور دولت داخل ہوئی۔ مفتوحہ زمینوں، بالخصوص عراق سے، سونے چاندی کے ہزاروں سکے اور جواہرات بطور مالِ غنیمت مدینہ آئے۔ اسلامی قوانین کے مطابق مالِ غنیمت ساری امت کے لیے تھا۔ اسے اسلام لانے والے اولین لوگوں سے لے کر غیر عربی نومسلموں تک میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں مکہ اور مدینہ میں مالیاتی سرگرمیوں میں بڑی تیزی آئی۔ نئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور فتوحات رکنے کے بعد اقتصادی ترقی کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے بہت بڑی جائیدادیں قائم کی

گئیں۔ اسلامی تاریخ میں پہلی بار حکومت کے پاس بڑی مقدار میں دولت آئی۔

اپنی خلافت کے دس سالوں میں حضرت عمرؓ نے نوعمر مسلم ریاست کو دھاوے مارنے والی صحرائی معاشرت سے اٹھا کر ایک علاقائی طاقت بنا دیا۔ اگر دیکھا جائے کہ سلطنت کتنی تیزی کے ساتھ پھیلی اور اس کے باوجود معاشرتی استحکام موجود رہا تو حضرت عمرؓ کی بطور رہنما اور منتظم صلاحیتیں ناقابلِ یقین لگتی ہیں۔ اسی لیے انھیں اسلامی تاریخ کے کامیاب ترین حکمرانوں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے ایک فارسی غلام نے ذاتی رنجش میں انھیں 644ء میں مدینے میں شہید کر دیا۔ یوں ان کا دورِ خلافت اچانک ختم ہو گیا۔ اپنے بسترِ مرگ پر حضرت عمرؓ نے مدینہ کے معزز رہنماؤں پر مشتمل ایک کونسل بنائی جس نے اپنے اندر سے ہی کسی ایک کو ان کا جانشین چننا تھا۔ اس کونسل نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو چنا۔ یہ بھی اولین اسلام لانے والوں میں شامل تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے برعکس حضرت عثمانؓ مکہ کے بنوامیہ سے تھے۔ یہ اسلام لانے سے پہلے بھی بہت دولتمند اور طاقتور شخص تھے۔ انھیں 644ء میں خلیفہ چنا گیا۔ حضرت عمرؓ کی حکمت عملی کی کامیابیاں دیکھ کر حضرت عثمانؓ نے بھی عہد کیا کہ وہ ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

حضرت عثمانؓ

حضرت عثمانؓ کا تعلق مکہ کے طبقہ شرفاء سے تھا۔ اس امر نے ان کے خلیفہ منتخب ہونے میں اہم کردار ادا کیا۔ بنوامیہ کے پاس انتظام وانصرام کا وسیع تجربہ تھا اور یہ قبل از اسلام سے چلا آ رہا تھا۔ حضرت عثمانؓ اپنے ذاتی فیصلوں میں اس تجربے کو کام میں لایا کرتے تھے۔ ان کے رشتے دار حضرت معاویہؓ پہلے ہی شام کے گورنر تھے اور ایک سرحدی صوبے کو مسلم ریاست کی ریڑھ کی ہڈی بنانے میں قابلِ تعریف کام کر رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے بنوامیہ ہی کے عبداللہؓ ابن سعد کو مصر کا گورنر بنا دیا۔ انھیں امید تھی کہ بنوامیہ کی کارکردگی شام کی طرح مصر میں بھی شاندار رہے گی۔ انھوں نے دیگر رشتہ داروں کو عراق میں تعینات کیا جہاں وہ ساسانیوں پر دھاوے مار کر ان کی باقی ماندہ سلطنت بھی قبضانے لگے۔ اسلامی تاریخ میں پہلی بار اقرباء پروری کے کچھ الزام بھی لگے لیکن وہ ایسے سنگین نہیں تھے کہ پھیلتی مسلم

ریاست کی صلاحیتوں اور کوششوں میں رکاوٹ ڈال سکیں۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں ایک سفارت چین بھیجی گئی تا کہ ٹینگ (Tang) شہنشاہیت اور خلافت کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔

حضرت عمرؓ نے ریاست کے عسکری پہلو پر بہت زور دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مسلم تاریخ کا اولین بحری بیڑہ بنانے کا حکم دیا۔ ان کا منشا تھا کہ بازنطینی حملے کی صورت میں اس کا توڑ کیا جا سکے۔ شام اور مصر کے گورنروں نے جہاز سازی کے لیے مقامی عیسائیوں کے تجربے پر انحصار کیا۔ مسلمانوں سے پہلے بازنطینی بالادستی میں زندگی گزارنے والے عیسائیوں نے اپنے عرب حاکموں کے لیے بڑے جوش و خروش سے کام کیا۔ بالخصوص اس لیے کہ ان میں سے زیادہ تر قبطی تھے یا پھر ایسے عیسائی فرقوں سے تھے جنھیں بازنطینی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بازنطینیوں کے برعکس مسلمانوں کے نسبتاً بہتر سلوک نے انھیں خلافت کا وفادار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں بیرونی خطرات سے محفوظ ایک پر امن معاشرہ قائم کرنے میں مدد ملی۔ 646ء میں جب بازنطینی بیڑے نے اسکندریہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو خلیفہ کے ملازم عیسائی علاقوں نے کامیاب مزاحمت کی۔ اپنی سرحدوں کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم ریاست نے اپنی حدود بحیرہ روم میں آگے بڑھائیں۔ انھوں نے قبرص اور کریٹ پر قبضہ کر لیا اور اپنے حملوں کا دائرہ سسلی تک بڑھا دیا۔ خشکی پر بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت معاویہؓ کی زیرِ قیادت لڑنے والی فوج نے بازنطینیوں کے خلاف اگلی فوج کشی میں آرمینیا پر قبضہ کیا۔ اناطولیہ کے پہاڑی علاقے کی زیادہ تر آبادی یونانیوں پر مشتمل تھی۔ یہ مسلمانوں اور بازنطینیوں کے درمیان ایک قدرتی سرحد کی شکل اختیار کر گیا۔ مزید مشرق کی طرف حضرت معاویہؓ کے ماموں زاد عبداللہؓ بن عامر کی زیرِ قیادت مسلم افواج فارس کے وسط تک پہنچ گئیں۔ عراق کی فتح بڑی تیزی سے مکمل ہوئی لیکن بقیہ ساسانی سلطنت کو اس رفتار سے فتح نہ کیا جا سکا۔ یہاں کی آبادی معاشرتی اعتبار سے خاصی یکساں تھی اور ساسانی حکومت کے ساتھ اس کا

گہرا تعلق تھا۔ اسی لیے مسلم فوجوں کو کامیابی کی بھاری قیمت چکانا پڑتی تھی۔ مگر حضرت عمرؓ کے دور میں قادسیہ کی فتح اتنی مکمل تھی کہ اس نے ساسانی سلطنت کے انجام پر مہر لگا دی تھی۔ بقیہ سلطنت کا قبضہ فقط کچھ کوشش اور تھوڑے وقت کا متقاضی تھا۔ ساسانی بادشاہ یزدگرد 642ء میں ہار جانے والی فوج کی جگہ نئی فوج کھڑی نہ کر سکا۔ اگلے دس برس تک ساسانیوں نے زیادہ تر دفاعی انداز اپنائے رکھا۔ 680ء میں سطح مرتفع ایران اور 651ء میں خراسان اس کے قبضے سے نکل گیا۔ اسی سال جان بچانے کی کوشش میں فرار ہوتے آخری ساسانی بادشاہ کو قتل کر دیا گیا۔ دس سال کے اندر اندر مسلم افواج عراق سے چلتی ہوئی وسطی ایشیا کے کنارے دریائے آمو تک آ گئیں۔

فوجی توسیع میں تسلسل کے باوجود حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ جیسی مقبولیت نہ ملی۔ ان کی انتظامی حکمت عملی، بالخصوص امویوں کی تقرری، پر عدم اطمینان کے باعث ان کی مشکلات بڑھنے لگیں۔ فتوحات کی تعداد بھی حضرت عمرؓ کے زمانے جیسی نہ تھی۔ اس سے مدینہ کو مالِ غنیمت کی ترسیل کم ہو گئی۔ اس نے مالیاتی جمود کو جنم دیا۔ بلاشبہ حضرت عثمانؓ اپنے دونوں پیشروؤں جیسے مقبول نہ تھے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہو گا کہ کوئی بھاری انقلاب حضرت عثمانؓ کے خلاف خطرہ بننے والا تھا۔ سپاہیوں کے فقط ایک چھوٹے سے گروہ نے مدینہ حکومت کو تشدد اور شورش سے بدل دینا تھا۔

655ء میں فوجیوں کا ایک گروہ مصر سے مدینہ آیا۔ اس کا مقصد حکومتی حکمتِ عملی اور مصر میں مالِ غنیمت کی فوج اور سول حکومت کے درمیان تقسیم پر براہِ راست خلیفہ کے سامنے احتجاج کرنا تھا۔ خلیفہ نے تنازعے کے دونوں پہلوؤں کو سنا، غور و فکر کیا اور کہا کہ وہ اس کے منصفانہ حل کے لیے اقدام کریں گے۔ مصر لوٹتے پر ان سپاہیوں کے ہاتھ ایک خط لگا جو مفروضہ طور پر خلیفہ نے مصر کے گورنر کو لکھا تھا کہ انھیں سزائے موت دی جائے۔ واپس مدینہ آ کر انھوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ ہلاکت خیز خطرے کے باوجود حضرت عثمانؓ نے مدینہ کے لوگوں کو مسلح ہو کر ان محاصرین کا مقابلہ کرنے کو نہیں کہا۔ انھوں نے حضرت معاویہؓ کو بھی روک دیا کہ ان کی حفاظت کے لیے شام سے فوج نہ بھیجیں کہ مبادا نبیؐ کے شہر مدینہ میں خونریزی ہو۔ حضرت محمدؐ کے بہت سے صحابیوں نے، جو تب تک بقیدِ حیات تھے، اس بغاوت کی مخالفت کی۔ لیکن وہ بے بس تھے۔ مدینہ میں مارشل لاء تھا۔ اس کے شہریوں نے خوف و

ہراس کے عالم میں دیکھا کہ بالآخر باغی زبردستی حضرت عثمانؓ کے گھر میں گھس گئے۔انھوں نے قرآن پڑھتے حضرت عثمانؓ کو شہید کردیا۔خلیفہ کی شہادت کے ساتھ ہی مسلم دنیا کی وحدت بھی ختم ہوگئی۔

حضرت علیؓ

مکہ میں بادشاہ گر بن جانے والے باغیوں نے خلیفہ مقرر کرنے کے لیے موزوں شخص ڈھونڈنا شروع کیا۔حضرت علیؓ کا انتخاب ہی عین فطری تھا۔وہ ابھی تک زندہ صحابہ میں سے معتزز ترین تھے۔ان کی رسولؐ اللہ سے دوہری رشتہ داری تھی؛ وہ رسولؐ اللہ کے چچازاد تھے اور داماد بھی۔حضرت محمدؐ کے قریب ترین دیگر صحابہ کی طرح حضرت علیؓ بھی اپنی آن اور طریق انصاف سے ہٹنے والے نہیں تھے۔انھوں نے شروع میں خلیفہ سوم کے خلاف بغاوت برپا کرنے والوں کے ہاتھوں خلیفہ بننے سے انکار کردیا۔بالآخر انھیں مدینہ کے ممتاز افراد نے منالیا کہ انھیں کے پاس مدینہ کا امن بحال کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

تاہم کوئی شخصیت بھی مسلم دنیا کے بحران سے نمٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔حضرت علیؓ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا کیا کیا جائے۔عامتہ الناس جذباتی ہو رہے تھے کہ باغیوں کو سزا دی جائے۔حضرت معاویہؓ کا اصرار تھا کہ جب تک ان کے رشتہ دار کے قاتلوں کو سزا نہیں دی جاتی وہ نئے خلیفہ کی بیعت نہیں کریں گے۔لیکن اپنے پیشروؤں کی طرح حضرت علیؓ بھی حقیقت پسند تھے۔انھیں ادراک تھا کہ قاتلوں کو سزا دینے کی کوشش میں ان کی اپنی جان بھی جاسکتی ہے۔اس لیے کہ مدینہ ابھی تک باغیوں کے قبضے میں تھا۔بدلہ لینے کی ایسی کسی صورت میں مسلم دنیا خونریز زوال کا شکار ہوجاتی۔ایسا کرنے کی بجائے حضرت علیؓ اپنا دارالحکومت عراق کے زرخیز علاقے کوفہ میں لے گئے جہاں جنگ پر تلے لوگوں کے خلاف انھیں کافی حمایت حاصل تھی۔ باغیوں کے خلاف قرار واقعی کارروائی سے انکار پر مدینے کے بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی تھی۔جلد ہی لوگوں کی ایک تعداد اکٹھی ہوگئی کہ حضرت علیؓ کو باغیوں کی سزا پر آمادہ کیا جائے۔دو صحابی طلحہؓ اور زبیرؓ فوج لے کر حضرت علیؓ کا سامنا کرنے کے لیے عراق کی طرف بڑھے۔انھیں زوجہ رسولؐ حضرت عائشہؓ کی معاونت حاصل تھی۔

بعدازاں پیش آنے والے تنازع میں حضرت علیؓ اور ان کے سیاسی مخالفین کے ارادوں کو جانچنا مشکل ہے۔ دونوں طرف ایسے لوگ موجود تھے جو پیغمبرؐ کے بہت قریب رہے تھے اور یقیناً مسلمانوں کے درمیان جنگ کی ہولناکی سے بھی آگاہ ہوں گے۔ پھر بھی دونوں اطراف کے لوگ اپنے اپنے اجتہاد کو عین درست سمجھے کہ باغیوں کے خلاف انھی کا طریقہ کار درست ہے۔ حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ باغیوں کو سزا دینا مناسب نہیں ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ امت کو از سرِ نو متحد کرنا اور آگے چلنا زیادہ مناسب تھا۔ ان کے مخالفین سمجھتے تھے کہ غلطیوں کو سدھارے بغیر اور آئندہ حضرت عثمانؓ کے محاصرے جیسی خلافت مخالف سرگرمیاں نہ ہونے کی یقین دہانی کے بغیر اتحادِ نو ممکن نہیں۔ غالباً دونوں طرح کے استدلال میں سچائی موجود تھی لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا ہونے والی تقسیم اتنی بڑی تھی کہ صحابہ بھی اس کا کچھ نہ کر سکے۔ امت کا نفاق ناگزیر ہو گیا تھا۔

بالآخر 656ء میں مخالف نظریات کے لیے لڑنے والی فوجیں جنوبی عراق میں بصرہ کے قریب آمنے سامنے آگئیں۔ لڑائی سے پہلے حضرت علیؓ کے مخالفین میں سے طلحہؓ اور زبیرؓ جیسے کچھ لوگ خونریزی سے بچنے کی امید میں ان سے ملے۔ متحارب جماعتوں کے درمیان ایک امکانی اور آزمائشی معاہدے پر بھی اتفاق رائے ہوا۔ انھیں اس خیال سے ہی وحشت ہوتی تھی کہ آپؐ کے وصال کے بیس برس بعد ہی مسلمان باہم جنگ کرنے لگیں۔ ان جماعتوں کے رہنماؤں میں جاری بات چیت کے باوجود دونوں طرف ایسے لوگ بھی تھے جو انتہا پسند تھے اور ان میں خدا خوفی کی کمی تھی۔ وہ عام سپاہیوں کو جلد از جلد مخالفین پر تلواریں سونتنے پر مائل کر رہے تھے۔ یہی الجھنیں تھیں کہ بالآخر دونوں فوجیں ٹکرا گئیں۔ دونوں کا خیال تھا کہ لڑائی دوسرے فریق نے شروع کی تھی۔ اسے جنگِ جمل کا نام دیا گیا۔ حالانکہ طرفین کا بھاری جانی نقصان ہوا لیکن جنگ فیصلہ کن ثابت نہ ہوئی۔ طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں اس ہنگامے میں کام آئے۔ اس جنگ میں حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں محفوظ رہے لیکن مسلمانوں کے درمیان اس پہلی جنگ پر دونوں ہی بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ مدینہ جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہو گئیں۔ حضرت علیؓ نے مدینہ تک انھیں بحفاظت پہنچانے کے لیے ایک دستہ متعین کر دیا۔ انھوں نے اپنی وفات (678ء) تک سیاست سے کچھ علاقہ نہ رکھا۔

اس ساری خونریزی کے باوجود خلافت پر حضرت علیؓ کی گرفت مضبوط نہ تھی۔ حضرت علیؓ اور مدینے کے باغیوں کے درمیان جنگ میں حضرت معاویہؓ غیر جانبدار رہے لیکن بیعت کو حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا ہونے تک موخر رکھا۔ جب تک مسلمانوں کے طاقتور ترین گورنران کی خلافت کو تسلیم نہ کرتے حضرت علیؓ کی حکومت موثر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن حضرت علیؓ اپنے اس خیال پر قائم تھے کہ باغیوں کی سزا نہ تو ترجیحی اقدام ہوگا اور نہ ہی فوری مناسب ہوگا۔ اس بار مزید خونریزی سے بچنے کے لیے حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ سے ملاقات اور ثالثی کا تنازعہ طے کرنے پر رضامند ہوگئے۔ 655ء میں دونوں کی ملاقات عراق اور شام کے درمیان ایک جگہ پر ہوئی۔ یہ جگہ دونوں کے اپنے اپنے مستقر یعنی عراق اور شام سے یکساں فاصلے پر تھی۔

تاریخ کے دھندلکے میں جھانک کر بالکل صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کیسی بات چیت ہوئی اور اس کے نتائج کیا تھے۔ لیکن لگتا ہے کہ ثالثین حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو اقتدار سے ہٹا کر ایک نیا خلیفہ منتخب کرنے کے حامی تھے۔ جب ثالثی کے نتائج فریقین کو سنائے گئے تو حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک گروپ نے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا اعلان تھا کہ ''فیصلہ اللہ کو زیب دیتا ہے۔'' انھوں نے خود ثالثی کے عمل کو ہی بے جواز اور غیر قانونی قرار دیا۔ انھیں اعتراض تھا کہ حضرت علیؓ نے اپنا فیصلہ سیاسی لوگوں پر کیوں چھوڑ دیا ہے جو بہر حال خطا سے مبرا نہیں۔ اسی انتہا پرست سیاسی نقطہ نظر نے اس انتہا پسند مذہبی نظریے کی تشکیل کی کہ کوئی بھی انسان جس سے گناہ سرزد ہوتا ہے وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔ جب یہ گروہ حضرت علیؓ کے حمایتیوں کی اکثریت سے الگ ہوگیا تو انھیں 'خارجی' کہا گیا یعنی 'وہ جو نکل گئے'۔ خارجیوں نے عراقی مضافات میں خوف و ہراس پھیلایا۔ جو بھی ان کے جنونی افکار سے متفق نہ ہوتا وہ اس کے ساتھ لڑائی کرتے۔ حضرت علیؓ نے بھی اپنی نااہلی کے حوالے سے ثالثوں کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے سابقہ حمایتیوں اور مسلمہ اسلامی الٰہیات سے نکل جانے والے اولین گروہ کے متعلق فیصلہ کیا کہ انھیں خوف و دہشت پھیلانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ انھوں نے اپنی فوج جمع کی اور 658ء میں مخالفین سے جنگ کر کے ان کے سرکردہ افراد کو مار دیا۔ تاہم یہ تحریک خفیہ انداز میں چلتی رہی کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ

دونوں کو معزول کر دیا جائے۔ دمشق میں حضرت معاویہؓ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ ناکام رہا لیکن وہ حضرت علیؓ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کوفہ کی مسجد میں فجر کی نماز کے وقت ایک خارجی نے حضرت علیؓ پر وار کیے۔ یوں حضرت علیؓ کا شورش و ابتلاء سے بھرپور دورِ خلافت ان کی متشددانہ شہادت پر ختم ہوا۔ اب خلافت کے لیے مسلمانوں کے پاس ایک حضرت معاویہؓ ہی بچے تھے جنھیں خاصی بڑی حمایت حاصل تھی اور وہ ایک موثر رہنما بھی تھے۔

چوتھا باب

مسلم ریاست کا قیام

خارجیوں کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت معاویہؓ کے خلیفہ بننے پر وہ دور ختم ہوا جسے بالعموم خلافت راشدہ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کی حکومت (661ء سے 680ء) انیس سال کی تھی۔ ان سالوں میں مسلم معاشرہ اور حکومت دونوں میں بنیادی تبدیلی آئی۔ حضرت معاویہؓ برسرِ اقتدار آئے تو مصر سے ایران تک انتشار اور نفاق کا دور دورہ تھا۔ حضرت معاویہؓ کی سیاسی مہارت اور اہلیت نے مسلم دنیا کو اس طوائف الملوکی سے بچالیا جس سے شاید یہ کبھی باہر نہ آسکتی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت معاویہؓ کی کچھ حکمتِ عملیاں اور عمل بہت متنازعہ رہے۔ آج کی مسلم دنیا میں جو بڑی بڑی تقسیمیں موجود ہیں ان کی جڑیں حضرت معاویہؓ کے بعض اعمال میں ہیں۔ ان کا دورِ حکومت اموی خلافت کا آغاز ثابت ہوا۔ بنوامیہ نے خلافت کو وراثتی بنادیا اور یہ بنوامیہ میں 750ء تک چلی۔ پھر یہ خلافت مکہ کے ایک اور قدیم خاندان بنوعباس کے پاس چلی گئی۔

حضرت معاویہؓ

ثالثی کی کوششوں کے باوجود حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان تنازعہ کا حقیقی حل سامنے نہ آیا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں حکومت عملاً حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان بٹی

رہی۔ تاہم حضرت علیؓ کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان کے وفادار علاقوں کو اپنے زیرِ حکومت کیا اور مسلم ریاست کو ایک بار پھر اکٹھا کر دیا۔ شام میں انھیں ناقابلِ یقین مقبولیت حاصل تھی۔ یہ وہ صوبہ تھا جہاں انھوں نے خلیفہ بننے سے پہلے بیس سال حکومت کی تھی۔ شامی فوج ان کی عسکری قوت کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ تاہم ان کے دشمن اور مخالفین بھی موجود تھے۔ بالخصوص عراق میں ان کی تعداد زیادہ تھی جہاں لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ کے بعد خلافت ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کو ملنا چاہیے تھی۔ حضرت معاویہؓ جیسے عملیت پسند سیاستدان کو بھی پسند نہ تھا کہ قیادت کے مسئلے پر مسلم باہم جنگ و جدل سے گزریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مخالفین کو کچلنے کے لیے فوج استعمال کرنے کی بجائے ایک معاہدے پر بات چیت کی کہ حضرت حسنؓ قیادت کے اپنے دعوے سے دستبردار ہو کر مکہ میں عبادت اور علمی مشاغل کی زندگی گزاریں گے۔ تاہم حضرت علیؓ کے گھرانے میں کچھ لوگوں میں حکومت کی خواہش موجود تھی۔ لیکن یہ خواہش کبھی ابھر کر سامنے نہ آئی اور حضرت معاویہؓ کے لیے کبھی حقیقی خطرہ نہ بنی۔

690ء میں مسجد الاقصیٰ کے جزو کے طور پر قبۃ الصخریٰ یروشلم میں بنایا گیا۔ اس کا ڈیزائن زیادہ تر بازنطینی ہے اور زیادہ تر عیسائی کاری گروں کا کام ہے۔

حضرت معاویہؓ نے زیادہ تر اپنے مخالفین کے ساتھ بات چیت اور معاہدات پر انحصار کیا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنی حکومت زیادہ تر ایک عرب قبائلی سردار کے انداز میں چلائی۔ انھوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے خاندانی رشتوں اور تحائف وغیرہ سے بھی کام لیا۔ انھوں نے اپنی نوعمری میں ہی اپنے باپ کو اہلِ قریش کی قیادت کرتے دیکھا تھا۔ قیادت کی یہ قبائلی روایات اس کے رگ و ریشے میں شامل تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت معاویہؓ نے خلافت کو ایک نئی چیز یعنی ملوکیت میں بدلنا شروع کیا۔ وہ پہلے خلیفہ تھے جو تخت پر بیٹھے اور جنھوں نے قاتلانہ حملوں کے پیشِ نظر مسجد کے اندر حصار میں نماز پڑھنا شروع کی۔ انھوں نے پہلے چار خلفاء کے سادہ اور عاجزانہ طور طریقوں کی پیروی نہیں کی۔ اس کی بجائے خلافت پر بادشاہت اور دربار کا رنگ آ گیا جو ساسانی اور

رومن حکمرانوں کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

پیغمبرؐ کی وفات کے تیس سال بعد تک خلیفہ کا ایک ہی امتیاز تھا کہ وہ باہم مساوی لوگوں میں سے پہلا سمجھا جاتا تھا۔ پہلے چار خلفاء کی دنیا سے بے رغبتی کے بہت سے واقعات ہم تک آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت عمرؓ کو غلطی سے ایک عام آدمی سمجھ لیا گیا اور یہ کہ انھوں نے محافظوں سے انکار کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کو اپنے پیشرو خلفائے راشدین اور آنے والے بادشاہوں کے درمیان ایک پل خیال کرنا چاہیے۔ جب ان کے معماروں نے دمشق میں ایک وسیع و عریض اور خوبصورت مسجد بنائی تو وہ بازاروں میں پیوند لگے کپڑے پہنے گھومتے تھے۔

حضرت معاویہؓ نے مسلمانوں کی سیاسی تقسیم کے اثرات کو معدوم کرنے کے لیے پروگرام بنایا۔ اس پروگرام کا ایک حصہ خلافت کی حدود کو پھیلانا تھا۔ جیسے حضرت عمرؓ نے ارتداد کی جنگوں سے فارغ ہو کر سلطنت کی حدود کو پھیلایا تھا اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بازنطینی سلطنت کے خلاف بحری اور بری فوج بھیجی۔ بحر ایجہ (Aegean Sea) میں واقع اہم جزائر رہوڈز اور کریٹ پر قبضہ اس بحریہ نے کیا جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں تیار کی گئی۔ ان فتوحات کے بعد مسلم فوج بازنطینی دار الحکومت قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے کے قابل ہو گئی۔ اسلام کے اولین زمانے سے ہی یہ شہر مسلمانوں کا مرکزِ نگاہ تھا۔ پیغمبرؐ نے بشارت دی تھی کہ بالآخر ایک مسلم فوج اس دور دراز اور بظاہر ناقابلِ فتح شہر کو فتح کر لے گی۔ 674ء میں جب مسلم فوج پہلی بار اس شہر تک آئی تو لگتا تھا کہ اس وعدے کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اموی فوجوں نے 674ء سے 678ء تک اس شہر کی بھاری دیواروں کو گھیرے رکھا لیکن نفری اور ٹیکنالوجی کی کمی کے باعث اسے فتح نہ کر سکے۔ اس محاصرے کے شہداء میں حضرت ایوبؓ انصاری بھی شامل تھے۔ جب پیغمبرؐ مدینہ آئے تو حضرت ایوبؓ انصاری نے ہی انھیں اپنے گھر ٹھہرایا تھا۔ انھیں قسطنطنیہ کی دیوار تلے دفنایا گیا۔ وہ تقریباً 800 سال کے بعد حملہ آور عثمانی ترک فوجوں کے لیے ایک افسانوی داستان بنے جنھوں نے بالآخر شہر فتح کر لیا۔

توسیع کا یہ عمل شمالی افریقہ کی جانب بھی جاری رہا۔ جدید لیبیا کے مغربی حصے پر تب تک بازنطینیوں کا قبضہ تھا۔ مصر کے مغرب میں اموی زیرِ تسلط علاقے پر عقبیٰ نافع کی حکومت تھی۔ مکہ سے

تعلق رکھنے والے یہ صاحب بھی صحابی تھے۔ 670ء میں انھیں بازنطینی افریقہ میں گھس جانے کا حکم دیا گیا۔ اس حملے کا تعلق بحرایجہ کے بازنطینی علاقوں میں مسلم پیش رفت سے بھی تھا۔ عقبیٰ کی فوج میں دس ہزار گھڑسوار تھے۔ انھیں حالیہ اسلام قبول کرنے والے مقامی بربروں کی ایک بڑی تعداد کی مدد حاصل تھی۔ بازنطینی دیگر محاذوں پر الجھے ہوئے تھے۔ ان کی عدم توجہ سے فائدہ اٹھا کر عقبیٰ بلا روک ٹوک بڑھتا ہوا آج کے تیونس تک پہنچ گیا۔ یہیں اس نے قیروان کے نام سے ایک فوجی شہر آباد کیا۔ اسے پیش آنے والا اصل خطرہ بازنطینی فوج کا نہیں بلکہ مقامی بربروں کا تھا۔ مغرب رخ مزید پیش قدمی جاری رکھنے کے لیے مقامی بربروں کا زور توڑنا ضروری تھا اور یہ کام خاصا سست رفتار تھا۔ بہرحال عقبیٰ نے مغرب کی طرف اپنے حملے 675ء سے 680ء تک جاری رکھے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ بطور گورنر افریقہ کر دیا گیا۔ 680ء تک عقبیٰ کی افواج نے شمالی افریقہ میں اپنے قدم اتنی مضبوطی سے جما لیے تھے کہ تب مغرب کہلانے والے آج کے تیونس، الجیریا اور مراکش سے نکل کر وہ بحراوقیانوس تک مار کرنے لگے تھے۔ ان فتوحات کے طفیل شمالی افریقہ کی مسلم آبادی کے لیے عقبیٰ کا نام افسانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ 680ء میں قیروان سے نکلنے کے بعد عقبیٰ کی فوج بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع پہاڑی سلسلے کے جنوب کی صحرائی سطح مرتفع سے گزرتی بلا روک ٹوک آگے بڑھتی گئی۔ اسلامی سلطنت کے قلب میں موجود ناچاقی اور خانہ جنگی کے باوجود ایک ایک کر کے بازنطینی چوکیوں کو فتح کرتی اس فوج نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے سینکڑوں کلومیٹر کا ساحلی علاقہ مسلم سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس بظاہر معجزاتی فتح کی ایک بڑی وجہ شمالی افریقہ کے بربروں اور بازنطینی حکمرانوں کے مابین موجود لسانی، ثقافتی اور مذہبی تفریق تھی۔ شمالی افریقہ کے حاکم بازنطینیوں اور ان کے محکوم بربروں میں فرق معمولی نہیں تھا۔ افریقی بربران حملہ آور عرب خانہ بدوشوں سے بہت مختلف نہ تھے۔ جبکہ ان سے پہلے صدیوں یہاں حکومت کرنے والے بازنطینی شہری علاقوں کے یونانی اور لاطینی تھے۔ بربروں کی زبان کا حاکموں کی زبان سے کسی طرح کا تاریخی اشتراک نہیں تھا۔ بہت کم بربروں نے اپنے حاکموں کی زبان سیکھنے کا تردد کیا تھا۔ مشترکہ ثقافتی عناصر کی عدم موجودگی کا مطلب تھا کہ دونوں طبقوں کے درمیان کشاکش مستقل جاری رہے گی۔ بربروں کی رومن ثقافت میں پوری طرح گھل مل جانے کی مثالیں بہت کمیاب ہیں۔

عرب افواج کے لیے بربر معاونت کی زیادہ بڑی وجہ مذہب لگتی ہے۔ اوائل کے مسلم ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ بربروں کے پورے پورے قبائل نے بیک وقت اسلام قبول کرلیا تھا۔ شمالی افریقہ کے باشندوں اور بازنطینیوں میں، ایک وجہ تقسیم خود عیسائیت کے اندر بھی موجود تھی۔ ان میں سے اصل مسئلہ الوہیت اور انسان کی ماہیت کا تھا۔ عیسائیت میں Tarlanism اور Donatism جیسی تحریکیں بھی، جنھیں بازنطینی سرپرست آرتھوڈوکس چرچ کے ساتھ اختلاف تھا، شمالی افریقہ کو اسلام سے قریب لائی ہوں گی۔ اگر ابتدائی تذکرہ نگاروں نے مبالغہ بھی کیا ہے کہ سارا شمالی افریقہ مسلمان ہو گیا تھا تو اس کے باوجود بھی مسلم فوج کے آنے پر بازنطینیوں کے خلاف بربروں کے اٹھ کھڑے ہونے کی عملی وجوہات موجود ہیں۔ چنانچہ 680ء کے عشرے میں عقبیٰ کی فوج کے آگے بڑھتے چلے جانے پر زور پکڑتے جانا اور بالآخر آج کے مراکش اور اوقیانوس کے ساحل تک آ پہنچنا عین ممکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا گھوڑا سر پٹختی سمندری لہروں میں ڈال دیا اور کہا، ''اے میرے مالک اگر سمندر مجھے نہ روکتا تو میں سکندرِ اعظم کی طرح دیس دیس جاتا، تیرے دین کا دفاع کرتا اور بے دینوں سے لڑتا۔'' اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ ان فتوحات کی ماہیت کتنی مذہبی تھی۔ اہم یہ نہیں ہے کہ اس نے یہ کہا تھا یا محض اس کے ساتھ منسوب ہے، اہم یہ ہے کہ اسلامی مغرب سے اٹھنے والی عسکری قیادت کی نسلوں نے اس ہیروانہ امیج سے تحریک پائی۔

جانشینی کا تنازعہ

حضرت علیؓ کی خلافت کے دوران پیدا ہونے والی مشکلات کے بعد مسلم امت کو متحد کرنے میں کامیابی کے باوجود حضرت معاویہؓ نے ایک فیصلہ ایسا کیا کہ ان کا کردار متنازعہ ہوا اور آنے والے تیرہ سو سال میں اسلامی حکومت کی ماہیت بدل گئی۔ انھوں نے اپنی موت سے کافی پہلے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا اور دمشق کے نامور لوگوں سے اس کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ مسلم مورخین نے پوری اسلامی تاریخ میں قیاس آرائی کی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے پاس اپنے عمل کا کیا جواز تھا۔ بعد ازاں یزید کو جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس کے پیشِ نظر یہ بحث اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر حضرت معاویہؓ

کے دور کا تاریخی تناظر دیکھا جائے تو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ خلافت کی بجائے موروثی بادشاہت کا فیصلہ کیوں موزوں لگتا ہوگا۔ حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سیاسی وحدت اور ہم آہنگی پر کس قدر زور دیا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے دوران جو سیاسی ابتری پیدا ہوئی اس کے بعد حضرت معاویہؓ کو درپیش اصل چیلنج مسلم دنیا کو ایک قیادت میں متحد رکھنا تھا۔ اگرچہ حضرت معاویہؓ اپنے مقصد میں کامیاب رہے لیکن کوئی ضمانت نہیں تھی کہ آنے والے خلفاء بھی بیرونی خطرات سے بچنے کے لیے سیاسی چالبازی جیسے حیلوں سے کام لے کر اندرونی تقسیم پر حاوی ہو سکیں گے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے محسوس کیا کہ جانشینی کی کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے سیاسی انتشار اور معاشرتی عدم آہنگ کا حل خلافت کو وراثتی بنانے میں ہے۔

تاہم، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، یزید کا انتخاب بھی نزاع سے خالی نہ تھا۔ اپنے باپ کے برعکس یزید نے آپؐ کو نہیں دیکھا تھا چنانچہ اس کے پاس صحابی ہونے کا تقدس نہیں تھا۔ علاوہ ازیں مکہ اور مدینہ دونوں مقدس شہروں میں افواہیں تھیں کہ یزید گناہ آلود زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ مشہور ہو گیا کہ یزید شرابی اور عیش پرست ہے اور گانے بجانے والی عورتوں میں گھرا رہتا ہے۔ یہ طرزِ حیات آپؐ کی سادہ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کی تعلیم سے مختلف تھا۔ حیاسوزی کے الزام درست تھے یا نہیں لیکن کچھ لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کے لیے کافی تھے۔ ان میں عبداللہ بن زبیر بھی شامل تھا۔ یہ انھی زبیرؓ کا بیٹا تھا جنھوں نے حضرت علیؓ کی مخالفت کی تھی۔ بعض عراقیوں کی شدید خواہش تھی کہ مسلم دنیا کی خلافت آلِ حضرت علیؓ میں سے کسی کے پاس ہو۔ اس سے صورتحال اور بھی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ حضرت علیؓ کے سب سے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ کا انتقال حضرت معاویہؓ کے دور میں ہی ہو چکا تھا چنانچہ اب وہی حمایت ان کے چھوٹے بیٹے حضرت حسینؓ کے حصے میں آئی۔ حضرت محمدؐ کے یہ نواسے میسوپوٹیمیا کے شہر کوفہ کے باسیوں کی طرف سے حمایت کے وعدے پر ادھر متوجہ ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر نے انھیں انتباہ کیا کہ اہلِ کوفہ اولین موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اس کے باوجود حضرت حسینؓ 680ء میں مدینے سے نکلے۔ وہ عراق میں اپنا ٹھکانا بنا کر شام کے بنوامیہ کے ساتھ وہی کرنا چاہتے تھے جو ان کے والد نے پچیس برس پہلے کیا تھا۔ عبداللہ بن زبیر کی پیش گوئی کے عین

مطابق حضرت حسینؓ کے پہنچنے سے بھی پہلے کوفہ کے لوگ ان کی حمایت سے دستبردار ہو گئے۔ یزید نے پہلے ہی ایک گورنر کوفے بھیج دیا تھا کہ اگر کوئی مخالفت کرے تو اسے ختم کر دیا جائے اور یقینی بنایا جائے کہ اہلِ شہر اس کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔ طاقت کے اس مظاہرے سے اہلِ کوفہ نے حضرت حسینؓ کے ساتھ کیا گیا وعدہ ختم کر دیا۔ حضرت حسینؓ اس اعانت پر انحصار کیے ہوئے تھے اور صرف ستر اہلِ خانہ اور ساتھیوں کے ساتھ کوفہ کو روانہ ہو گئے تھے۔ کوفہ کے شمال میں 80 کلومیٹر کے فاصلے پر کربلا کے میدانی علاقے میں اس قافلے کو یزید کی فوج نے گھیر لیا۔ یوں حضرت حسینؓ اور ان کے زیادہ تر ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ کربلا کی اس لڑائی نے بعدازاں اسلام کے ایک نئے فرقے شیعیت کے لیے بنیاد کا کام کیا۔

عبداللہ ابن زبیر کی بغاوت بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے نتیجے میں اموی حکومت پوری اسلامی دنیا میں لوگوں کی حمایت کھو بیٹھی۔ حضرت حسینؓ بہرحال حضرت محمدؐ کے چہیتے نواسے تھے۔ متقی مسلمانوں کے لیے ایسے شخص کی شہادت شدید المناک تھی جس کی رگوں میں پیغمبرؐ مقدس کا خون دوڑ رہا تھا۔ ان حالات میں عبداللہ ابن زبیر کی بغاوت کو کچلنا حضرت حسینؓ کے قتل جیسا آسان نہ تھا۔ درحقیقت یزید حجاز میں اس بغاوت سے پوری طرح کبھی نمٹ نہ سکا اور اپنی سلطنت پر مکمل گرفت کیے بغیر 683ء میں فوت ہو گیا۔ یزید کی موت کے بعد اسلامی دنیا پر امویوں کی گرفت کہیں کمزور پڑ گئی۔ یزید کے نوعمر جانشین کو حکومت میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ حکومت میں آنے کے چند ماہ بعد مر گیا۔ عبداللہ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ عراق، مصر اور حتیٰ کہ خود شام کے سرحدی علاقوں کے لوگوں نے اس کی بیعت کا اعلان بھی کر دیا۔ لیکن قبائلی سیاست اور جنگ دونوں کو استعمال کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے ایک عم زاد مروان نے خلافت کی باگ ڈور دوبارہ سنبھال لی۔ مروان اور اس کے بیٹے عبدالمالک کی زیرِ قیادت امویوں نے شام، مصر اور عراق کو دوبارہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ بالآخر 692ء میں امویوں نے مکہ میں عبداللہ بن زبیر کی بغاوت کچل دی۔ امویوں نے تباہی کے عین کنارے سے واپس آ کر اسلامی سلطنت کو دوبارہ قابو کر لیا تھا۔ جب حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین خلیفہ مقرر کیا تو انھیں یقیناً ایسے امن اور ہم آہنگی کی امید نہیں تھی لیکن جب امویوں

نے اپنا اقتدار بحال کر لیا تو 680ء سے 692ء تک کی خانہ جنگی تاریخ میں محض ایک ہچکی سی نظر آنے لگی۔
ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل میں بنوامیہ نے تیز رفتار عسکری توسیع اور اقتصادی ترقی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ اس دور کا تقابل اسلامی تاریخ کے کسی بھی دوسرے عہد سے کیا جا سکتا ہے خواہ وہ اس سے پہلے کا ہو یا بعد کا۔

بنوامیہ کا پورے آئبیریا کو چار سال کے اندر اندر اور محض چند سو سپاہیوں کی مدد سے فتح کر لینا بتاتا ہے کہ انھیں مقامی آبادی کی مدد حاصل تھی۔

مزید فتوحات

مزید فتوحات سے پہلے ضروری تھا کہ شمالی افریقہ پر عقبیٰ کا قبضہ مضبوط کر لیا جائے۔ خلیفہ عبدالمالک نے 698ء میں شمالی افریقہ میں بازنطینیوں کا آخری مستقر قرطاج (Carthage) فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ نتیجتاً بازنطینی شمالی افریقہ کی باقیات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ آخر بازنطینی شکست کھا کر سسلی اور یونان کی طرف پسپا ہو گئے۔ مسلم فوجوں کو تاریخ کی شاندار ترین اور غیر متوقع فتوحات میں سے ایک کا اعزاز حاصل ہوا۔ روایت کے مطابق ایک سابقہ بازنطینی عہدیدار جولین نے شمالی افریقہ کے نئے مسلمان گورنر سے درخواست کی کہ جزیرہ نما آئبیریا کے وزی گاتھ (Visigoth) راڈرک بادشاہ کو سزا دے۔ جب اس کی بیٹی راڈرک کے زیرِ نگرانی تھی تو اس نے اسے بہکا لیا تھا۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ مسلم فوج کے ہراول دستوں کو آبنائے کے پار سپین بھی پہنچا دے گا تا کہ وہ بادشاہ سے بدلہ لے۔ جولین کے حقیقی یا افسانوی ہونے کا فیصلہ کرنا تو مشکل ہے لیکن سپین میں انتشار اور بدامنی تو موجود تھی۔ ساتھ ہی ساتھ زیرِ عتاب یہودیوں اور غیر آرتھوڈوکس عیسائیوں کی عرض داشتوں نے بھی آبنائے عبور کرنے اور جزیرہ نما آئبیریا پر حملے کے فیصلے کو انگیخت دی ہو گی۔

مغرب کے اموی گورنر موسیٰ بن نصیر نے اوائل 711ء میں ایک بربری مسلم طارق بن زیاد کی زیرِ قیادت ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج سپین کے جنوبی ساحل پر سمندر میں ابھری ایک پتھریلی چٹان

کے پاس اتری۔ طارق نے اس چٹان کے پاس کیمپ لگایا۔ اس کا نام جبل الطارق یعنی طارق کا پہاڑ پڑ گیا۔ یہی نام بعد ازاں انگریزی میں بگڑ اتو جبرالٹر کہلایا۔ اس مستقر سے طارق نے جنوبی سپین میں فوجی چھاپے مارے جو بالعموم کامیاب رہے۔ ان کامیابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ راڈرک اور اس کی فوج کا بڑا حصہ جزیرہ نما کے جنوب میں باسکی (Basque) بغاوت کو دبانے میں مصروف تھا۔ جب تک راڈرک اپنی فوج کو واپس شمال میں لاتا، موسم گرما آ چکا تھا اور طارق مسلم شمالی افریقہ سے دس ہزار کے قریب سپاہی سپین کی سرزمین پر لا چکا تھا۔ ایک تو راڈرک کی فوج لمبے فاصلے سے آنے کے بعد تھک چکی تھی اور دوسرے اس کی صفوں کے کچھ عناصر وفادار نہیں تھے۔ اس لیے گواڈیلٹ کی فیصلہ کن جنگ میں طارق کی فوج نے راڈرک کی فوج کو کچل کر رکھ دیا۔ خود راڈرک جنگ میں مارا گیا۔ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ سلطنت اندر سے بہت کھوکھلی ہے۔ اس جنگ کے چند ماہ کے بعد طارق نے راڈرک کے دارالحکومت اور قدیم شہر ٹالیڈو (Toledo) پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حملہ آور فوج باقی شہر ایک ایک کر کے فتح کرتی چلی گئی۔ موسیٰ بھی سمندر پار اتر آیا اور جاری فتوحات میں طارق کی مدد کرنے لگا۔ طارق علاقے فتح کرتا گیا اور موسیٰ ان فتوحات کو ٹھوس بناتا چلا گیا۔ طارق کی زیرِ قیادت ہراول کے طور پر چلنے والی فوج نے وادی ایبرو (Ebro) تک کے علاقے فتح کر لیے۔ موسیٰ فوج کا زیادہ تر حصہ لیے اس کے پیچھے پیچھے مفتوحہ علاقوں پر مسلم حکومت قائم کرتا چلا گیا۔ 711ء سے 715ء تک طارق اور موسیٰ نے جزیرہ نما کا خاصا بڑا علاقہ اموی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ نسبتاً تھوڑی سی فوج (زیادہ سے زیادہ دس بیس ہزار) کے ہاتھوں اتنے بڑے علاقہ کی حیران کن فتح نے ایک نسل پہلے ہونے والی شمالی افریقہ کی فتح یاد دلا دی۔

پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں میں سے بہت سے بدھ مت کے ماننے والے اور نچلی ذاتوں کے لوگ تھے جنھیں اسلام کے انسانی مساوات کے تصور نے متوجہ کیا تھا۔

مزید شمال میں یعنی گال پر مسلم حملے فتح سپین کی طرح کامیاب تھے۔ مسلم فوجیں موجودہ فرانس

کے جنوب میں Aquitane اور Septinania تک چلی گئیں۔ گال پر مسلم حملوں کا نقطہ عروج 732ء میں آیا جب شمالی فرانس میں چارلس مارٹل کی زیرِ قیادت لڑنے والے فرانکوں نے Tours کی جنگ میں اندلسی گورنر عبدالرحمٰن الغافقی کو شکست دی۔ مورخین نے اس جنگ کی اہمیت پر بہت بحث کی ہے۔ ان میں سے کچھ کا خیال ہے کہ اگر اس جنگ میں مسلمان فتح حاصل کرتے تو وہ بتدریج پورے فرانس پر قابض ہو جاتے اور یہاں کی آبادی آٹھویں صدی میں ہی اسلام قبول کر لیتی۔ بعض دوسرے مورخین کے نزدیک یہ جنگ اتنی اہم نہیں تھی۔ اس لیے کہ الغافقی کی شمالی فرانس کی طرف پیش قدمی مہم محض موسم گرما کا ایک شمال رخ حملہ تھا۔ اس کا مقصد علاقے کی فتح اور اس پر قبضہ نہیں تھا۔ اس کا تعین تو مشکل ہے کہ اس جنگ کی اصل اہمیت کیا تھی لیکن یہ خیال آرائی دلچسپ ہے کہ فرانس میں مسلم حکومت کے مضمرات کیا ہوتے اور از منۂ وسطیٰ کی یورپی تاریخ کے لیے اس کے مضمرات کیا ہوتے۔

آٹھویں صدی کی اموی توسیع فقط شمالی افریقہ اور فرانس تک محدود نہ تھی اور یہی حقیقت اسے غیر معمولی بناتی ہے۔ سلطنت کے دوسری طرف اموی فوجیں ایک ایسی سرزمین میں داخل ہو رہی تھیں جہاں سکندر کی فوجوں کو بھی مہم جوئی کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اس حملے کی وجہ ایک تجارتی جہاز بنا جو سیلون (سری لنکا) سے واپس آ رہا تھا۔ اس پر قزاقوں نے حملہ کر دیا جن کا ٹھکانہ ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ سندھ تھا۔ جب سندھ کے راجہ داہر نے جہاز پر سے قیدی بنائے گئے مسلمانوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا تو اموی فوجوں کو اپنی سرحدیں ایک بار پھر آگے لے جانے کا موقع مل گیا۔ اس فوج کی قیادت محمد بن قاسم کے پاس تھی۔ اس کا تعلق طائف کے قبیلے ثقف سے تھا۔ طائف وہ شہر تھا جسے حضرت محمدؐ نے تباہ نہ ہونے دیا تھا۔ اسے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی لیکن اس نے اچھی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے چھ ہزار شامی فوجوں کے ساتھ 711ء میں ایران کے پار برصغیر ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ طارق بن زیاد کے سپین پر حملے کا بھی یہی سال تھا۔ محمد بن قاسم دریائے سندھ تک پہنچا تو راستے میں مذہبی آزادی کے وعدے پر کئی اقلیتیں اس کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ بدھ عبادت گاہوں کے منتظمین کی معاونت میں مسلم فوجیں راستے کے سارے شہر فتح کرتی گئیں۔ انھیں بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد بن قاسم اور داہر کی

فوجوں کا مقابلہ دریائے سندھ کے کنارے ہوا۔ مسلم فوج اور داہر سے تنگ مقامی لوگوں نے مل کر سندھ کی فوج کو تباہ کن نقصان پہنچایا۔ جنگ کی افراتفری میں داہر بھی مارا گیا۔ اس کے جنگی ہاتھی عربوں کے نفت آلود آتشیں تیروں کے سامنے جم نہ سکے۔ یہاں بھی سپین جیسا حال ہوا۔ ایک بڑی اور اہم جنگ میں شکست اور بادشاہ کی ہلاکت کے نتیجے میں مقامی حکومت مکمل تباہ ہو گئی، محمد بن قاسم کی فوجوں نے باقی ماندہ منظم مزاحمت چند ماہ کے اندر ختم کر دی اور سندھ پر مسلم حکومت قائم کی۔ پہلی بار ہندوستان کا ایک حصہ مسلم تسلط میں آیا۔ تاہم برصغیر میں مزید آگے جانے اور دیگر علاقوں پر اپنی گرفت مکمل کرنے میں اگلی کئی صدیاں لگ گئیں۔ مسلم فتح نے سندھ کے مقامی باشندوں کی زندگیوں پر کچھ زیادہ اثر نہ ڈالا۔ عراق کے گورنر کی ہدایت کے عین مطابق محمد بن قاسم نے ہندوؤں اور بدھوں کو ویسی ہی آزادی دی جیسی اسلامی دنیا کے دیگر حصوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کو حاصل تھی۔ نئے مسلمان حاکموں نے تباہ ہونے والے مندر اور مورتیاں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ ایک بار پھر فاتح مسلمانوں کی نرم شرائط نے مسلم حکومت میں معاشرتی انتشار اور عدم آہنگ کے امکان ختم کر دیے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک اموی خلافت سپین سے ہندوستان تک پھیل چکی تھی۔ مکہ کے ایک پہاڑ کی بلندی سے شروع ہونے والی تحریک 100 سال سے بھی کم عرصے میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ توسیع اور فتوحات عام طور پر ایک اہل اور طاقتور حکومت کی علامت ہوا کرتے ہیں۔ لیکن جب اموی سلطنت کی فوجیں نامعلوم خطوں میں پیش قدمی کر رہی تھیں تو اس حکومت کے خاتمے کی سازش تیار کی جا رہی تھی۔ جہاں امویوں کے خلاف اٹھنے والی دیگر بغاوتیں ناکام ہو گئیں وہاں اس بغاوت کو کامیاب ہو جانا تھا۔ اس لیے کہ اب کی بار بہت سے ایسے نسلی گروہوں کو بھی شامل کر لیا گیا جو مسلم تسلط میں آ چکے تھے اور بنو امیہ کی معاشرتی حکمت عملیوں سے مطمئن نہیں تھے۔

سلطنت کی تیز رفتار توسیع کا مطلب تھا کہ لوگوں کی ایسی بہت بڑی تعداد مسلم حکومت کی عوام میں شامل ہوئی جو خود مسلمان نہیں تھے۔ ایک اندازہ ہے کہ آٹھویں صدی کے آغاز سے وسط تک اموی رعایا میں مسلمان کم و بیش دس فیصد تھے۔ باقی سب عیسائی، یہودی، زرتشتی، بدھ اور ہندو تھے۔ اسلامی قانون کے مطابق ان لوگوں کو اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی آزادی تھی اور جزیہ کی ادائیگی

پر انھیں فوجی خدمات سے بھی استثنیٰ حاصل تھا۔ دوسری طرف زکوٰۃ اور عشر صرف مسلمانوں سے وصول کیے جاتے تھے اور انھیں غرباء میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ جزیہ قبل از اسلام رائج بازنطینی یا ساسانی ٹیکسوں سے کم شرح کا حامل تھا لیکن یہ مسلمانوں پر عائد ٹیکس کے مقابلے میں بہر حال قدرے زیادہ تھا۔ اس نظام کا ایک قدرتی مالی ردعمل تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ غیر مسلم ٹیکس کی نسبتاً زیادہ شرح سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر لیں لیکن اس حل نے بنوامیہ کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اگر سارے غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تو حکومتی محاصلات میں خاصی کمی آجاتی۔ اس طرح فوجی مہمات، اور بنوامیہ کی عیاشی کے لیے سرمایہ کہاں سے حاصل ہوتا۔ چنانچہ محاصلات میں کمی کا تدارک کرنے کے لیے ایک تدبیر کی گئی۔ اسلام قبول کرنے والوں سے کہا گیا کہ وہ مذہب بدلنے کے بعد بھی پہلے کی طرح جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔ نظری اعتبار سے یوں بنوامیہ کو ملنے والے ٹیکس کا اہم ذریعہ باقی رہنا چاہیے تھا اور اسلام قبول کرنے کا اقدام صرف مخلص لوگوں کو اٹھانا چاہیے تھا۔ لیکن عملاً اس کا مطلب تھا کہ باقاعدہ ادارہ جاتی سطح پر نسلی امتیاز کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ تقریباً تمام عرب تو پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام قبول کرنے والے نئے لوگ زیادہ تر قبطی، یونانی، بربر اور بالخصوص ایرانی تھے۔ یہی وہ مسلمان تھے جنھیں جزیہ ادا کرنا تھا جبکہ ان کے عرب بھائی اس سے مستثنیٰ تھے۔ ہوسکتا ہے کہ امویوں کا اصل مقصد اپنے محاصلات کے ایک ذریعہ کو ختم ہونے سے بچانا ہو لیکن اس حکمت عملی کا نتیجہ نسلی امتیاز کے طور پر سامنے آیا۔ یعنی معاشرے میں عرب بلند ترین تھے جبکہ غیر عرب نچلے درجہ پر رکھے گئے نظر آتے تھے۔ مذہبی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ امر حضرت محمدؐ کے اعلانِ مساوات سے متصادم تھا جو انھوںؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر کیا تھا، ''کوئی عرب کسی غیر عرب سے بہتر نہیں اور کوئی غیر عرب کسی عرب سے بہتر نہیں۔''

خلیفہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے 717ء سے 720ء تک کے دورِ خلافت میں اس غیر اسلامی ٹیکس کو ختم کرنے کے لیے کام کیا۔ اگرچہ ان کی حکمت عملی سلطنت کی غیر مسلم رعایا میں بڑی مقبول ہوئی لیکن مساوات پر ان کے خیالات کے باعث ان کے اپنے خاندان کے لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ انھیں اقتدار میں آئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ خود بنوامیہ نے زہر دے کر مار ڈالا۔

اگرچہ بعد کے مسلمانوں نے ان کی مذہبی اصلاحات کے باعث حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کو ''عمر ثانی'' کا نام اور پانچویں خلیفہ راشد کا اعزازی لقب دینا تھا لیکن اہلِ امیہ کی حکمت عملی کے تناظر میں ان کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ غیر عربوں کی بنوامیہ کی ٹیکس حکمت عملی پر بے چینی بڑھتی گئی۔ اس بے چینی سے فائدہ اٹھا کر مکہ کے پرانے خاندانوں میں سے ایک خاندان بنوعباس اٹھ کھڑے ہوے اور انھوں نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

عباسی انقلاب

عباسیوں کو یہ نام حضرت محمدؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی وجہ سے ملا جو اس برادری کے بڑے تھے۔ یہ لوگ شام کی فتح کے بعد دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر آباد ہوے۔ ساتویں صدی کی خانہ جنگی کے دوران انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ آٹھویں صدی کے اوائل میں کسی وقت انھوں نے ایک افواہ پھیلانا شروع کی کہ حضرت علیؓ کے جانشینوں میں سے ایک نے حکومت کا حق باضابطہ طور پر عباسیوں کو منتقل کر دیا ہے۔ بالفرض ایسا ہوا بھی تھا تو اس جانشین کو ایسا قدم کیوں اٹھانا تھا، ابھی تک اسرار بنا ہوا ہے۔ بہرحال عملاً یہ ہوا کہ عباسیوں کو ایک جواز مل گیا۔ نہ صرف وہ بنوامیہ کے مقابلے میں آپؐ کے زیادہ قریبی عزیز تھے بلکہ وہ ان لوگوں سے بھی معاونت کی توقع کر سکتے تھے جو حضرت علیؓ کی اولاد کو مسلمانوں کی قیادت کا زیادہ حقدار خیال کرتے تھے۔ انھوں نے پہلے جنوبی شام اور پھر عراق میں واقع مستقروں سے اپنے ایجنٹ مشرق میں خراسان بھیجے جہاں کی ایرانی آبادی پر جابر امویوں کے خلاف انقلاب کے لیے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں دمشق کے اموی مرکز سے دور دراز کے علاقوں میں بیعت لی جاتی رہی۔ وعدے کیے گئے کہ ان کی خلافت میں معاشرتی مساوات کو ترویج دی جائے گی اور حضرت علیؓ کے جانشین حکومت میں بڑا کردار ادا کریں گے۔ سلطنت کے مشرقی حصے کے بہت سے مسلمان حضرت علیؓ کی اولاد کے لیے مرکزی حکومتی کردار کے خواہش مند تھے۔ اس طرح عباسیوں نے معاشرے کے کئی طبقات میں اپنی حمایت کو یقینی بنایا۔ نیک اور پارسا مسلمان آپؐ کے قائم کردہ معیارات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ

حکومت چاہتے تھے۔ غیر عرب مسلمانوں کو رنج تھا کہ انھیں دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ آل حضرت علیؓ کا ایمان تھا کہ حکومت پیغمبرؐ کے گھرانے کا حق ہے۔

747ء میں عباسیوں نے بغاوت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ عباسیوں کے سیاہ علم، آج کے ترکمانستان میں واقع، شہر مرو کے آسمان پر لہرانے لگے۔ یہ شہر اسلامی دنیا کے بعید مشرق میں تھا۔ انقلاب کی قیادت ایک پراسرار ہستی ابو مسلم کے پاس تھی۔ اس کے متعلق زیادہ معلومات میسر نہیں ہیں۔ زیادہ امکان ہے کہ اس کا تعلق عباسیوں سے نہیں تھا اور وہ غالباً ایرانی الاصل تھا۔ اس کی شاندار سیاسی اور فوجی قیادت میں عباسی انقلابیوں نے خراسان پر قبضہ جما کر اسے اپنی تحریک کا مرکز بنالیا۔ ابو مسلم نے افواج کو مغرب کی طرف ایران کے وسطی علاقوں میں بھیجا اور وہاں کے ایرانی مسلمان اسی انقلابی جوش و خروش میں فوج کے ساتھ شامل ہو گئے۔ شروع میں یہی لگتا تھا کہ یہ سب محض دور دراز مرو میں بے چینی کا غیر اہم مظہر تھا۔ لیکن جب یہ فوج ایرانی حدود سے نکل کر عرب دنیا میں داخل ہوئی تو اموی خاندان کے لیے حقیقی خطرہ بن گئی۔ کوفہ امویوں کے خلاف جذبات کا گڑھ چلا آرہا تھا۔ جب سیاہ عباسی علم مشرقی افق پر نمودار ہوے تو اہلِ کوفہ اٹھ کھڑے ہوے۔ اموی گورنر کو بے دخل کر کے نکال دیا گیا۔

کوفہ پر قبضہ کر لینے کے بعد خلافت کا عباسی دعویدار ابو العباس باقاعدہ بیعت لے سکتا تھا۔ اس انقلاب کے پاس ایک واضح مقصد تھا، اسے پورے ایران میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی اور اب قیادت کے لیے ایک رہنما بھی سامنے آ گیا تھا۔ جیسے جیسے لوگ عباسیوں کے گرد جمع ہوتے گئے امویوں کا انداز دفاعی ہوتا چلا گیا۔ اس سارے عرصے میں امویوں کے حمایتیوں کو ابھارنا ایک چیلنج بنا رہا۔ کئی عشروں سے اموی حکومت نے کسی حقیقی خطرے کا سامنا نہیں کیا تھا۔ شامی افسر اپنی جاگیروں پر موجود ہونے کو ہی کافی خیال کرتے تھے۔ ان کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی کہ انقلاب از خود کمزور ہوتا ہوا مر جائے گا۔ جب اموی خلیفہ مروان ثانی نے اپنی افواج کو اکٹھا کیا، انقلابی تقریباً سارے عراق پر قابض ہو چکے تھے۔ وسطی میسوپوٹیمیا میں واقع زاب کی لڑائی نقطۂ عروج ثابت ہوئی۔ عباسیوں نے اپنی مقابل اموی فوج تہس نہس کر دی۔ پوری مسلم دنیا پر سے اموی کنٹرول ختم ہو گیا۔ اس کے

بعد عباسیوں کو کسی منظم مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ عباسی دمشق کی طرف بڑھے۔ رستے میں آنے والے شہر یکے بعد دیگرے ان کی اطاعت قبول کرتے چلے گئے۔ حکمران اموی خاندان کے لوگوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ خود مروان مصر سے پکڑا گیا جہاں وہ عباسیوں کو پیچھے دھکیل کر اموی حکومت بحال کرنے کے لیے فوج بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

شکست خوردہ خاندان کا صرف ایک شخص اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ اس نوعمر شخص کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ اسے زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ عبدالرحمٰن بھیس بدل کر شمالی افریقہ نکل گیا۔ فلسطین سے مصر اور پھر مغرب تک عباسی فوج اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اپنے خاندان کے ایک سابقہ غلام کی مدد سے اس کا یہ افسانوی سفر اندلس پر ختم ہوا۔ یہاں اس نے عباسی دسترس سے دور ایک اموی امارت قائم کی جو 300 سال تک قائم رہی۔

عباسی خلافت

آٹھویں صدی کے وسط میں خلافت امویوں سے نکل کر عباسیوں کے پاس آئی۔ امویوں کے خلاف ہونے والی بغاوت کی بنیاد ان خیالات پر تھی کہ حکومت کو آپؐ کے تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ غیر عربوں کو معاشرے میں عربوں کے مساوی درجہ دیا جائے اور حکومت میں آلِ حضرت علیؓ کا کچھ کردار رکھا جائے۔ یہ عمومی اور آدرشی وعدے لوگوں کے مختلف گروہوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ضروری تھے۔ اس کے بغیر انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا تھا لیکن اقتدار میں آجانے کے بعد ان سے وابستہ توقعات بہت کم پوری ہوئیں۔ انقلاب کا مقصد خلفائے راشدین کا دور واپس لانا نہیں تھا کہ جہاں خلیفہ کے احکام سیاسی مفادات کی بجائے تقویٰ کے تابع ہوں۔ اگر عباسیوں نے کسی چیز میں تسلسل رکھا تو وہی امویوں کی آمریت تھی جس کی یہ مذمت کرتے چلے آئے تھے۔ خلافت وراثتی لقب ہی رہا اور بنو قریش سے باہر نہیں گیا۔ آلِ حضرت علیؓ کی حمایت کرنے والوں کے ساتھ کیے گئے وعدے ایفا نہیں ہوئے۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید اپنی بے پناہ دولت اور دور دراز کی حکومتوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کی وجہ سے مشہور تھا۔ 802ء میں اس نے فرانس کے شارلیمان (Charlemagne) کو ایک سفارت بھیجی جس کے ساتھ ایک ہاتھی اور آبی گھڑیال تھا۔

عباسیوں نے غیر عربوں کو معاشرے میں سرگرم ہونے کا بھرپور موقع دیا اور اس اعتبار سے وہ امویوں سے بہت بہتر تھے۔ اگرچہ خلافت عربوں کے پاس ہی رہی لیکن انتظامیہ میں ایرانیوں کا عمل دخل بڑھتا چلا گیا۔ اسلام سے بھی سینکڑوں برس پہلے ایرانیوں نے بیوروکریسی کا ایک پیچیدہ لیکن نہایت کارگر نظام بنالیا تھا۔ اب چونکہ غیر عربوں کے خلاف منظم انتظام موجود نہیں تھا چنانچہ سلطنت کی انتظامیہ میں ان کا وضع کردہ نظام چلایا جاسکتا تھا۔ اہلِ ایران کی افادیت کو دیکھتے ہوئے عباسیوں نے اپنا دارالحکومت ایران کے قریب لے جانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے عباسی خلیفہ المنصور نے 765ء میں فرات اور دجلہ کے درمیان زرخیز میدانی علاقے میں اپنے دارالحکومت کی بنیاد رکھی۔ یہ نیا شہر پرانے ایرانی دارالحکومت مدائن کے قریب تھا۔ اگلے بیس برس میں بغداد دس لاکھ آبادی کے ساتھ دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ مسلم سلطنت کے اس دارالحکومت کو ایسا شہری مرکز بن جانا تھا جہاں حکومت، ثقافت، علوم اور فنون کا امتزاج ہونا تھا۔

اگر بنوعباس کے کارناموں کو سمجھنا ہے تو، بنوامیہ کے برعکس، فوجی کارناموں اور دور دراز علاقوں کی فتوحات کی بحث ناکافی رہے گی۔ درحقیقت عباسیوں کی آمد پر سلطنت کی سرحدی توسیع کا عمل رک گیا۔ بازنطینیوں کی سرحدوں پر موسمی حملوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن یہ بالعموم فیصلہ کن نہیں ہوتے تھے۔ سلطنت کے مغرب میں امویوں کے زمانے میں 732ء کی جنگ ٹورس کے بعد مسلمانوں کی یورپ میں توسیع پذیری رک گئی۔ اموی تارکینِ وطن نے اندلس میں حاصل ہونے والی فتوحات کو مضبوط بنانے پر اکتفا کیا۔ مشرق کی طرف وسط ایشیا میں صرف اضافی فوائد حاصل کرنے کے لیے مداخلت کی گئی۔ وسط ایشیائی میدانوں میں گھومنے والے ترک بذریعہ فتوحات مسلم تہذیب کا حصہ نہیں بنے۔ بلکہ یہ نویں اور دسویں صدیوں میں مسلم سلطنت کے مرکزی علاقوں کی طرف نقل مکانی کا منطقی نتیجہ تھا۔

پانچواں باب

دانش کا زریں عہد

نویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک مسلم دنیا نے سائنس، مذہب، فلسفہ اور ثقافت میں ترقی کا ایسا زمانہ دیکھا کہ اس سے پہلے یا بعد کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ عرب کے بنجر صحراؤں سے شہاب ثاقب کی سی تیزی اور تابانی کے ساتھ ابھرنے کے بعد اسلامی تہذیب نے سپین سے ہندوستان تک بہت سے مختلف مذہبوں، تمدنوں اور علمی روایات کا احاطہ کیا۔ اس طرح کی سرگرمی میں دور دراز کی تہذیبوں کے سابقہ کارناموں کو باہم اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ ان کا باہم تقابل کیا جا سکتا تھا اور پھر ان کی بنیاد پر سائنسی دریافتوں کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ دنیا میں کسی اور جگہ اتنے متنوع لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے اور پھر ان کے کام کی اپنے عبقری دانشوروں سے تکمیل کروانے کا ایسا عمل دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ہوا۔ ان کوششوں نے اس دور کو قدیم یورپ اور نشاۃ ثانیہ کے یورپ کا درمیانی پل بنا دیا بلکہ یہ جدید سائنسی دنیا کی بنیاد بھی ثابت ہوا۔

بیت الحکمت

تاریخ کی بے شمار سیاسی جماعتوں کی طرح عباسی بھی مثبت اور مثالی مستقبل کے وعدوں کے زور پر نمایاں اور ممتاز ہوئے۔

دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعۃ القراءیین (Karaouin) ایک مسلمان عورت نے فیض (Fez)، مراکش، میں 859ء میں قائم کی۔

جب اموی انتشار کا شکار ہوئے تو یہ خاندان متقی قیادت اور معاشرتی مساوات کے وعدوں پر اقتدار میں آیا۔ نویں صدی کے اوائل تک ان کے زیرِ اقتدار سلطنت بحر اوقیانوس سے دریائے سندھ تک پھیل چکی تھی۔ انھوں نے بغداد کے نام سے اپنا ایک دار الحکومت بنوایا جس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ ان کی سلطنت میں یونانی، قبطی، ایرانی اور ہندوستانی تمدن شامل تھے۔ یہ اس مثالی معاشرت کے آغاز کا بہترین زمانہ تھا جس کا وعدہ انھوں نے کیا تھا۔ ساتویں عباسی خلیفہ مامون (813ء تا 833ء) کی سوچ تھی کہ مستقبل کا مثالی معاشرہ فقط علم اور تعقل کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں سائنسی علوم کی موجود روایات اور سلسلوں کو ایک مرکزی مقام پر لایا جائے۔ اسے یقین تھا کہ اگر مسلم دنیا کے بہترین عالموں کو باہمی استفادے کے لیے قریب آنے کا موقع دیا جائے تو لا انتہا امکانات سامنے آسکتے ہیں۔

دسویں صدی میں کیتھولک پوپ سلویسٹر ثانی پہلے پہل کے اہلِ یورپ میں شامل تھا جس نے مسلمانوں کی ایجاد کردہ ریاضی کے مطالعہ کو رواج دیا۔ اس نے مسلم سپین اور شمالی افریقہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

مامون نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ بیت الحکمت کا دائرہ کار ایسا تھا کہ تعلیمی ادارے کی آج کی تعریف اس کا احاطہ نہیں کرتی۔ یہ بیک وقت ایک یونیورسٹی، ایک لائبریری، ترجمے کا ادارہ اور تحقیقی تجربہ گاہ تھی۔ لائبریریاں اور چھوٹے مدرسے تو امویوں کے زمانے سے ہی موجود تھے لیکن علم کے حصول اور ترویج

کا عباسی جذبہ اپنے پیشرووں سے کہیں طاقتور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی عالم کسی کتاب کو اس کی اصل زبان سے عربی میں ترجمہ کر سکتا تھا تو اسے کتاب کے ساتھ تول کر سونا دیا جاتا تھا۔ پوری دنیا سے مسلم اور غیر مسلم عالم مامون کے اس منصوبے کا حصہ بننے کے لیے جوق در جوق بغداد پہنچے۔ تاریخ میں پہلی بار ایران، مصر، ہندوستان اور سابقہ بازنطین کے چنیدہ کام ایک جگہ لائے گئے تاکہ سائنس کو ساری دنیا کے قابل استفادہ بنانے کے لیے ترقی دی جائے۔ مامون تاریخ کا اکیلا حکمران نہیں جس نے سائنس پر خصوصی زور دیا۔ اصل بات وہ پس منظر ہے جو بیت الحکمت اور مسلم عہد زریں کو منفرد کرتا ہے۔ اول تو یہ کہ مسلم سلطنت نے مختلف گروہوں کے مابین موجود اور انھیں الگ کرنے والی دیواریں گرادیں۔ اسلام سے پہلے سکندریہ میں موجود کسی عالم کے پاس مدائن جا کر پڑھنے اور پڑھانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر وہ یہ سفر کر بھی لیتا تو زبان کی رکاوٹ کے باعث وہ ایرانیوں کے لیے کچھ زیادہ کام نہ کرتا۔ عباسی عہد کا دوسرا منفرد پہلو یہی تھا۔ عربی ایسی زبان بن گئی جو متنوع پس منظر کے لوگوں کو باہم اکٹھا کر سکتی تھی۔ اگر کوئی مسلمان ہے تو اس کی مادری زبان خواہ کوئی بھی ہو اس کے لیے پیغمبرؐ کے حکم کے مطابق نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے عربی کا، کم از کم، ابتدائی علم لازمی ہے۔ چنانچہ عربی نے فقط مذہبی فرائض کی ادائیگی سے آگے بڑھ کر سائنس دانوں کے باہمی ابلاغ اور تحقیق کے لیے بھی کام کیا۔ تیسرے یہ کہ خود اسلام نے حصول علم کا حکم دیا۔ اس طرح تحقیق بجائے خود عبادت کا درجہ اختیار کر گئی۔ قرآن کی بہت سی آیات اور پیغمبرؐ کی احادیث میں ایک متقی مسلمان کی زندگی میں علم کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ پیغمبرؐ سے روایت ہے کہ جو کوئی بھی حصولِ علم کا راستہ اختیار کرتا ہے اس کے لیے جنت کی راہ آسان تر کر دی جاتی ہے۔ آپ کی حیات کے چند سو سال کے بعد مسلمان سائنس دانوں کے لیے مطالعہ اور تحقیق رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔ اس زریں عہد کا سائنسی ادب بالعموم قرآنی آیات سے شروع ہوتا ہے جن میں علم کے طالبان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں اپنے گرد و پیش کی دنیا پر غور و فکر کرنے کو کہا گیا ہے۔ سائنسی تحقیق کے یہ تین منفرد محرکات اسلامی دنیا کے ساتھ مخصوص تھے اور اگر آپؐ کی حیات کے بعد اسلام ایک جغرافیائی سیاسی قوت بن کر نہ ابھرتا تو شاید یہ محرکات بھی وجود میں نہ آتے۔

ریاضی

اپنے زریں دور میں مسلمانوں نے ریاضی میں تاریخ ساز اضافے کیے۔ ریاضی، فزکس، کیمسٹری، فلکیات اور جغرافیے سمیت تمام سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ تاہم مسلم زریں دور کے مسلمانوں کے لیے یہ ضروری اور ناگزیر کے علاوہ مقدس مضمون بھی تھا۔ انھیں امید تھی اعلیٰ ریاضی کی تفہیم انھیں دنیا میں کارفرما قوانین کی زیریں سطح پر موجود عددی بنیاد سمجھنے میں مدد دے گی۔ آج فزکس کی بنیادی تعلیم رکھنے والا بھی سمجھتا ہے کہ اس کے گرد اجسام کی حرکت چند فارمولوں کے تحت ہوتی ہے۔ زریں عہد میں یہ فارمولے ایک اسرار تھے اور سائنس دانوں کو امید تھی کہ تھیوری اور تجربات کی مدد سے وہ ان بظاہر جادوئی ہدایات کو سمجھ لیں گے۔ ان چیزوں کو سمجھ کر خدا کی قدرت کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا تھا، اس کی مخلوق کے ساتھ زیادہ بامعنی تعلق بنایا جا سکتا تھا اور خدا کے کام کی بہتر تحسین ہو سکتی تھی۔ یوں ریاضی کا مطالعہ بجائے خود ایک مذہبی روحانی سفر بن سکتا تھا۔

اولین عظیم ریاضی دانوں میں سے ایک محمد ابن موسیٰ الخوارزمی تھا۔ اس ایرانی مسلمان کا زمانہ 780ء سے 850ء تک کا ہے۔ یہ بیت الحکمت میں شامل ہونے والے شروع کے لوگوں میں تھا۔ اس نے ریاضی میں ہونے والی ترقی کے لیے بنیادی کام کیا۔ ریاضی میں اس کا ایک اہم اضافہ یہ ہے کہ اس نے اعداد اور گنتی کا ہندوستانی نظام اپنایا اور اسے رواج دیا۔ اس سے پہلے رومن نظام استعمال ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس نظام کی اپنی کمزوریاں اور نقائص تھے جس نے ریاضی کی کئی شاخوں میں پیش رفت کو روک رکھا تھا۔ مثلاً کسری اعداد (Fractions) والے پیچیدہ ریاضیاتی مسائل کو اس نظام میں حل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کے برعکس ہندوستانی نظام (---1,2,3,4) میں مثبت اور منفی اعداد کی سہولت بھی موجود تھی اور کسور بھی سادہ انداز میں بیان ہو سکتی تھیں۔ خوارزمی نے گنتی کے ہندوستانی نظام میں صفر کا اضافہ کیا اور یوں اس کی افادیت بڑھائی۔ چونکہ کسی بھی عدد کی صفر پر تقسیم کی تعریف نہیں ہو سکتی چنانچہ الخوارزمی صفر کا وجود ریاضیاتی طریقہ سے ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود الخوارزمی نے اسے مزید تحقیق میں استعمال کرتے ہوئے کچھ موضوعات میں انقلاب برپا کیا اور ریاضی میں کچھ نئی شاخوں کی بنیاد رکھی۔

الخوارزمی کی سب سے عظیم کاوش غالباً الجبرا ہے۔ اس نے اپنی عظیم ترین کتاب The Compendious Book on Calculation by Completion and Balancing میں وضاحت کی کہ وراثت کی تقسیم جیسے روزمرہ مسائل سے جیوگرافی تک کے مسائل الجبرے کی مدد سے کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔ اس مضمون میں الخوارزمی نے بہت سے نئے راستے نکالے۔ اگرچہ قدیم یونانی جیومیٹری میں ماہر تھے لیکن وہ الجبرے کو اس سے الگ نہ کر سکے۔ ان کی اس کمی نے سائنسی ترقی میں رکاوٹ ڈالے رکھی۔ الخوارزمی نے الجبرے کو ریاضی کی ایک الگ شاخ کے طور پر ترقی دی اور اس کے اطلاقات متعارف کروائے۔ لفظ الجبرا خود بھی اس مضمون پر الخوارزمی کی کتاب کے عنوان سے ماخوذ ہے۔ الجبرا ماخوذ ہے الجبر سے یعنی مکمل کرنا۔ یہ ایک مساوات کی دونوں اطراف کو مکمل کرتے ہوئے حل دریافت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

ایک اور ایرانی ریاضی دان عمر خیام (1048ء تا 1131ء) تھا۔ اگرچہ مغرب میں اس کی بڑی وجہ شہرت محبت اور تصوف کی شاعری ہے لیکن وہ ماہر ریاضی دان بھی تھا۔ اس نے بھی ریاضی میں نئے اضافے کیے اور اس مضمون کی حدود کو پھیلایا۔ وہ مکعب مساواتوں کے عمومی حل میں کامیاب رہا۔ مکعب مساواتوں میں نامعلوم کی طاقت تین ہوتی ہے۔ وہ نظری الجبرے (Theoretical Algebra) میں بھی ماہر تھا۔ Binomial Theory کی دریافت کا سہرا اس کے سر نہ بھی باندھا جائے تو بھی وہ اس پر کام کرنے والے اولین لوگوں میں سے ایک تھا۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ خیام کا یہ کام محض نظری قیاس آرائی اور سکول کے طالب علموں کو تنگ کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے نہایت اہم عملی اطلاقات بھی ہیں۔ اس نے تکونیات (Trignometry) اور کیلکولس جیسے مفید ریاضیاتی تصورات کی دریافت کا راستہ ہموار کیا۔ خود تکونیات میں بھی مسلمانوں کا حصہ کم نہیں ہے۔ دسویں صدی کے البیطانی نے بعض عملی ضرورتوں کے باعث اسے ترقی دی۔ ستاروں کے متعلق بنیادی معلومات پر تکونیاتی تفاعلات (Trignometric Function) کے اطلاق سے ان کا صحیح محلِ وقوع معلوم ہو سکتا ہے۔ مکہ رخ نماز پڑھنے والے مسلمانوں کے لیے یہ دریافت بڑی اہم تھی۔ اس زریں عہد میں سینکڑوں شہروں کے طول بلد اور عرض بلد نکال کر ان سے مکہ کی سمت بتائی گئی۔ ان معلومات کے حوالوں کی بیاضیں

(Handbooks) بنائی گئیں۔

اسی لیے ہزاروں سال پہلے بنائی گئی مساجد عین کعبہ رخ ہیں حالانکہ وہ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ مسلمان ریاضی دانوں کی دریافت کردہ ٹرگنومیٹری کی بنیادی خصوصیات آج کے GPS سسٹم کی بنیاد ہیں۔

فلکیات

مسلمانوں نے ریاضی میں جو پیشرفت کی اس کی ایک فطری توسیع فلکیاتی تحقیق تھی۔ مسلمان ریاضی دانوں کے وضع کردہ فارمولے اور طریقے ستاروں کے مطالعہ کی بنیاد بنے۔ اس طرح کے مطالعات کی تحریک اسلامی تعلیمات وعقائد نے بھی دی۔ قرآن کی بہت سی آیات میں آسمانی اجسام اور ان کی حرکات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ چاند اور سورج کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ یہ ''درست حساب کے مطابق حرکت'' کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بیان بھی ہے کہ ''انسان ستاروں سے بحر و بر کی تاریکی میں رہنمائی پاتے ہیں۔'' بحر اوقیانوس سے ہندوستان تک پھیلی ریاست کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ آسمانوں کی ریاضیاتی ماہیت پر قرآنی اشاروں کو نظر انداز کر دے۔

قرآنی تحریک کے باعث فلکیات کو حقیقی معنوں میں ترقی دینے والے مسلمان ہی تھے۔ ان سے پہلے کے زمانوں میں علم نجوم اور فلکیات کم وبیش ہم معنی خیال کیے جاتے تھے۔ اس کے نتیجے میں روزمرہ کی انسانی زندگی پر ستاروں کے اثرات کو باطل سائنس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے مسلمانوں نے فلکیات کو علم نجوم کی اساطیر اور تکے بازی سے الگ کیا۔ مسلمانوں کے زمانے تک ٹالمی کے کام کو فلکیات میں حرفِ آخر خیال کیا جاتا تھا۔ مامون اور بیت الحکمت کی سرپرستی میں ٹالمی کے قدیم نظریات کا مطالعہ کرنے کے لیے ماہرین فلکیات ایک جگہ جمع کیے گئے۔ ٹالمی کے نظریات میں زمین کو مرکز کہا جاتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور کائنات کی دیگر ہر چیز اس کے گرد گھومتی ہے۔ مسلمان فلکیات دانوں نے دیکھا کہ ٹالمی نے ستاروں اور سیاروں پر جو حساب کتاب لگایا ہے اس میں نقص ہیں اور اسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ فلکیات دانوں نے زیادہ بہتر

اور درست نتائج دینے والے فارمولے بنائے اور کچھ نے براہِ راست ٹالمی کے نظریے کو غلط قرار دے دیا۔

گیارھویں صدی میں البیرونی نے خیال ظاہر کیا کہ ٹالمی زمین کے ساکن ہونے کو سائنسی طور پر ثابت ہی نہیں کر سکا تھا۔ اسی نے نشاندہی کی کہ ٹالمی کے حسابی نتائج کے غلط ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ زمینی گردش کو حساب میں نہیں لایا۔ کوئی حتمی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مسلم ماہرین فلکیات نے بھی زمینی گردش پر اتفاق رائے نہیں کیا تھا۔ مسلم دنیا کے علمی حلقوں میں اس پر بحث چلتی رہتی تھی۔ المجریطی کے کام کا لاطینی ترجمہ اس بحث کو یورپ لے گیا۔ المجریطی ایک اندلسی عرب فلکیات دان تھا جس کا خاص موضوع فلکیاتی جدولیں اور فلکی ریاضیات تھا۔ اس کی وفات کے بعد بھی یورپ کے پڑھے لکھے لوگ المجریطی اور دیگر عالموں کی کتب کا درس لینے مسلم آئبیریا آیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ خیال پورے یورپ میں پھیل گئے۔ ان کو بنیاد بنا کر کوپرنیکس اور گیلی لیو نے وہ نظریات پیش کیے جنھیں آج ہم درست مانتے ہیں۔ یورپ کے برعکس مسلمانوں کو جدید نظریات کے حوالے سے اپنی مذہبی مقتدرہ کے جبر کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کے ہاں تو سائنسی جستجو کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔

الجبرا کی طرح فلکیات کو کئی عملی مسائل کے حل میں استعمال کیا گیا۔ ان میں سے اہم ترین اصطرلاب کی ترقی اور ترویج ہے۔ یہ آلہ اصل میں یونانیوں نے ایجاد کیا تھا۔ اس کے استعمال سے زمین کی سطح پر کسی جگہ موجود شخص اپنے محلِ وقوع کا عرض بلد (Latitude) معلوم کر سکتا تھا۔ اسے بس اصطرلاب کی مدد سے کچھ ستاروں کا زاویہ ماپنا پڑتا تھا۔ مسلمان فلکیات دانوں نے اسے اپنی زیادہ صحیح فلکیاتی پیمائشوں کے ساتھ ملا کر استعمال کیا تو یہ راستوں کے تعین میں استعمال ہونے والا معیاری آلہ بن گیا۔ بالخصوص بحری سفر کے دوران یہ بڑا کارآمد رہا۔ رات کے وقت جہازی اپنے اصطرلاب سے بعض ستاروں کے خاص جھرمٹوں کا زاویہ معلوم کرتے اور پھر اس کا تقابل اپنے پاس موجود جدولوں سے کرتے۔ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوتے انھیں اپنے محلِ وقوع کے عرض بلد جدولوں میں درج مل جاتے۔ اس طرح انھیں سمندروں کے اندر اپنی منزل کی سمت درست رکھنے میں مدد ملتی۔ اس طرح لمبے بحری فاصلوں کو طے کرتے حج کے لیے مکہ جانے کے سفر محفوظ اور یقینی ہو گئے۔ سپین سے

ہندوستان تک پھیلی تہذیب کے لیے اس طرح کی سفر کو محفوظ بنانے والی ٹیکنالوجی بہت ضروری تھی۔ اصطرلاب نے بحری سفر میں انقلاب برپا کر دیا اور یہ اٹھارھویں صدی تک سمت معلوم کرنے کا معیاری آلہ بنا رہا۔

جغرافیہ

جس طرح فلکیات نے ریاضی سے جنم لیا تھا، اسی طرح فلکیات سے جغرافیے نے جنم لیا۔ تاریخ کی بہت کم سلطنتیں رقبے میں زریں عہد کی مسلم سلطنت کی ہمسری کر سکتی ہیں۔ چونکہ مسلم سلطنت کے وسیع و عریض علاقے بالعموم ایک مرکز کے ماتحت تھے چنانچہ لمبے سفر عام اور بالعموم محفوظ ہو گئے تھے۔ چنانچہ تعجب نہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ممتاز ترین جغرافیہ دانوں میں مسلمان بھی شامل تھے۔

یہ پرانا خیال محض ایک افسانہ ہے کہ دنیا کے گول ہونے کو کرسٹوفر کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ یہ تو قدیم زمانے سے تسلیم کیا جا رہا تھا کہ زمین چپٹی نہیں ہے۔ سمندری ملاح اس امر کو خاص طور پر اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ دور ہوتے سمندری جہاز کا نچلا حصہ پہلے افقی خط سے نیچے جاتا ہے اور مستول کی باری بعد میں آتی ہے۔ قدیم یونانیوں نے تو زمین کو کرہ نما مان کر اس کا حجم معلوم کرنے پر بھی کام کیا۔ لیکن ان کی بحراوقیانوس کی قیاسی پیمائش اصل سے بہت کم تھی۔ اسی لیے ان کا معلوم کردہ زمین کا گھیر بھی اصل سے بہت کم رہا۔ عباسی خلافت میں کام کرنے والے جغرافیہ دانوں کا معلوم کردہ حجم نسبتاً بہت درست تھا۔ انھوں نے ٹرگنومیٹری اور کروی جیومیٹری کو ملا کر استعمال کیا اور زمین کا قطر 12,728 کلومیٹر نکالا۔ ان کے حساب میں صرف 37 کلومیٹر کی کمی بیشی تھی۔ ان کا معلوم کردہ زمین کا گھیر 39,968 کلومیٹر تھا جو کہ اصل میں 40,074 کلومیٹر ہے۔ جدید دوربینوں اور سیٹلائٹوں کے بغیر ان کی دریافتوں کو حیران کن ہی کہا جا سکتا ہے۔

چودھویں صدی میں مراکش کے ایک فقیہہ ابن بطوطہ نے 170,000 کلومیٹر سے زیادہ کا سفر کیا۔ اس نے مغربی افریقہ، ہندوستان، چین اور جنوب مشرق ایشیا کی سیاحت کی۔

مسلمانوں نے جغرفیائی تحقیق کو فقط زمین کی پیمائش تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے زمین کا نقشہ بنانے کے لیے بھی بڑی کاوش کی۔ انھوں نے پرانے یونانی (اور بالخصوص ٹالمی کے) نقشوں کو پھیلایا اور بہتر بنایا۔ اس کام کی بہترین مثال محمد الادریسی کی مرتب کردہ اٹلس ہے جو بارھویں صدی کے سسلی کا مسلمان تھا۔ سسلی کو، جو کبھی مسلم حکومت میں شامل تھا، آخر گیارھویں صدی میں نارمنوں نے فتح کر لیا۔ الادریسی کے زمانے میں سسلی کا بادشاہ راجہ دوم خاصا باخبر اور بردبار شخص تھا۔ اس کی سرپرستی میں الادریسی نے دنیا کا ایک نقشہ بنایا۔ صحت اور جزئیات میں ازمنیٔ وسطیٰ کا کوئی نقشہ اس کا ثانی نہ تھا۔ آنے والے سینکڑوں برس تک یہ نقشہ دیگر نقشوں کی جانچ پرکھ کے لیے معیار کا کام دیتا رہا۔ اس میں نہ صرف معلوم دنیا کا طبیعی جغرافیہ دکھایا گیا تھا بلکہ جہاں جہاں سیاح پہنچ پائے تھے وہاں کے تمدن، سیاست اور معاشروں کو بھی بیان کیا گیا تھا۔

مسلمان جغرافیہ دانوں کو جتنا تجسس معلوم دنیا کا تھا، اتنا ہی وہ نامعلوم سے بھی مسحور تھے۔ اہلِ مغرب نے کرسٹوفر کولمبس کو داستانوی حیثیت دے دی کہ اس نے پہلی بار وسیع و عریض بحر اوقیانوس میں بحر پیمائی کرتے ہوے 1492ء میں نئی دنیا دریافت کی۔ اس کی ''دریافت'' کے احوال میں اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہاں کے مقامی صدیوں پہلے سے وہاں رہتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ مضبوط شواہد موجود ہیں کہ دسویں صدی کے وائیکنگ بھی آج کے کینیڈا تک ہو آئے تھے اور مسلمانوں نے کولمبس سے سینکڑوں برس پہلے اوقیانوس پار کر کے سفر کر لیے تھے۔ عظیم جغرافیہ دان اور مورخ المسعودی نے ایک بحری سفر کا ذکر کیا ہے کہ 889ء میں مسلم آئبیریا کی بندرگاہ ڈیلبا سے مغرب کی طرف مہینوں جاری رہنے والے سمندری سفر کا آغاز ہوا اور وہ لوگ خشکی کے بہت بڑے اور پہلے سے نامعلوم ٹکڑے پر جا نکلے۔ کئی صدیوں کے بعد ڈیلبا سے ہی کولمبس کو اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے مقامی لین دین کیا اور پھر واپس آ گئے۔ ان احوال کو بنیاد بنا کر مسعودی نے دنیا کے اپنے نقشے میں بحر اوقیانوس سے پار اس ''نامعلوم'' خطے کو بھی شامل کیا ہے۔ اسی طرح کے احوال الادریسی نے بھی درج کیے ہیں کہ کس طرح مسلم ملاحوں نے بحر اوقیانوس کی مہم جوئی کے دوران اکتیس دن کا سفر کیا اور ایک نامعلوم جزیرے پر جا اترے۔ مقامی

باشندوں نے انھیں قیدی بنالیا لیکن جب عربی بولنے والے ایک مقامی نے دونوں فریقین کے درمیان بات چیت کروائی تو بالآخر انھیں رہا کر دیا گیا۔ اوقیانوس پار کے سفر کی آخری رپورٹ مالی سے ملتی ہے۔ مغربی افریقہ کی یہ مسلم ریاست چودھویں صدی میں اپنے عروج پر تھی۔ ابن بطوطہ کو مالی میں بتایا گیا کہ افریقی ساحلوں سے مغرب کی طرف 200 جہازوں پر مشتمل بیڑے نے ایک نامعلوم خطہ دریافت کرلیا۔ جب ان میں سے صرف ایک واپس آیا تو اس نے بتایا کہ انھیں سمندر پار خشکی کا ٹکڑا ملا تھا لیکن انھیں طوفان کے باعث لوٹنا پڑا۔ مالی کے بادشاہ مانسا ابوبکر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے 2000 جہاز تیار کروائے اور انھیں لے کر بحر اوقیانوس کے سفر کو نکلا۔ اس کے بعد وہ لاپتہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے بحری سفروں کی یہ کہانیاں یقیناً اوقیانوس پار قبلِ کولمبس تعلقات کے حتمی ثبوت نہیں ہیں۔ لیکن ایک تو ان کے جغرافیہ دان راوی ان کی صحت پر اصرار کرتے ہیں اور دوسرے نئی دنیا میں کھوج لگانے والوں کی پہلی نسل کے تحریر کردہ احوال میں مسلم آبادیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ یوں ایسے امکانات کے اشارے ملتے ہیں کہ دریافتوں کے عہد کی مسلمہ تاریخ کو از سر نو لکھنا پڑے۔

میڈیسن

میڈیسن کی تاریخ میں موجود غلط تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ چند صدیوں پہلے تک یہ زیادہ تر اندازوں اور تیر تکوں پر مشتمل تھی۔ جب ہم بیسویں صدی سے پہلے کی میڈیسن کا سوچتے ہیں تو بزعم خود ماہر لیکن اصلاً عطائی حکیم کی تصویر ذہن میں آتی ہے جو اپنے ہر مرض کے لیے جعلی دوائیں بیچتا نظر آتا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مسلم دنیا میں میڈیسن کی ایک لمبی روایت موجود ہے۔ اس کی بنیاد یونانی طب پر تھی اور اس میں تجربی مطالعے اور پیشہ ورانہ طبی رویے پر زور دیا جاتا تھا۔ اگرچہ آج کے عام لوگوں کے ذہن سے یہ محو ہو چکا ہے لیکن دنیا کے عظیم ترین اذہان میں سے ان چند کی تحریریں آج بھی موجود ہیں جن کا تعلق زریں مسلم عہد سے ہے۔ ان کے یہ کام روشن خیالی اور ترقی کے ایسے عہد کا پتہ دیتے ہیں جو جدید میڈیسن کی بنیاد بنا۔

دسویں صدی کے بغداد میں بطور معالج کام شروع کرنے سے پہلے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔

قدیم یونانی معالج جالینوس (Galen) نے جہاں اپنا کام چھوڑا تھا مسلم پیشرفت وہاں سے شروع ہوئی۔ قدیم زمانے میں جالینوس اپنے میدان میں عبقری حیثیت رکھتا تھا۔ دوسری صدی قبلِ مسیح کے اس معالج اور فلسفی نے میڈیسن پر بہت لکھا اور اس نظریے کی حمایت کی کہ انسانی جسم چار خلطوں یعنی خون، سودا، صفراء اور بلغم سے مل کر بنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب جسم میں خلطوں کا توازن بگڑتا ہے تو بیماری نمودار ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض خیالات اپنے زمانے کے لحاظ سے انقلابی تھے لیکن بعض شدید غلط تھے۔ اس کے باوجود اس کی وفات کے صدیوں بعد تک اطباء اسے بغیر کسی تنقید کے مانتے رہے۔

پہلا شخص جس نے جالینوس کو چیلنج کیا وہ نویں صدی کا محمد ابن زکریا الرازی تھا۔ بغداد کا یہ طبیب اصرار کرتا تھا کہ انسانی جسم کو نظریاتی خیال آرائی کی بجائے تعقل کی مدد سے سمجھنا چاہیے۔ اس نے جالینوس کے اندازِ فکر کے نقص واضح کرنے کے لیے ایک کتاب ''شکوک علی الجالینوس'' (Doubts About Galen) کے نام سے لکھی۔ اس نے دلائل دیے کہ جسمانی بیماری فقط خلطوں کے عدم توازن سے جنم نہیں لیتی اور نہ ہی یہ خدا کی طرف سے سزا ہے (جیسا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اہلِ یورپ خیال کرتے تھے) بلکہ اس کی وجہ کچھ داخلی اور خارجی عوامل ہیں۔ بیماری کا علاج ان عوامل کو دور کرنے سے ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا طریقۂ علاج فقط علامتوں کے علاج یا علالت کے جسمانی اسباب تک محدود نہ تھا۔

اس کی معرکۃ الآرا کتاب میڈیسن کا انسائیکلوپیڈیا ''الحاوی'' ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ میڈیسن میں پیشہ وارانہ لگن اور مسلسل آموزش بہت اہم ہے۔ اس کے نزدیک علاج معالجہ ایک مقدس کام ہے۔ خدا نے معالج پر ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت ہر کسی کی خدمت کرے۔ خواہ کوئی اس کا دشمن ہو یا اس کی فیس نہ دے سکتا ہو، وہ علاج سے انکار نہیں کرسکتا۔ بغداد کے مشہور ہسپتال میں وہ غریبوں

کے مفت علاج کی وجہ سے بہت نیک نام تھا۔ اس کی کتابیں صدیوں تک مسلم دنیا اور یورپ میں معالجین کی کئی نسلوں نے پڑھیں۔

ایک اور عظیم معالج ابن سینا ہے جسے اہل یورپ نے Avicenna کا نام دیا۔ گیارھویں صدی میں سیاسی ابتری سے دوچار ایران میں وہ کسی ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھ سکا۔ اس کے باوجود اسے زریں مسلم عہد کے جامع العلوم لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے میڈیسن میں اسی استدلالی اندازِ فکر کو اپنایا جو مسلمانوں نے دیگر مضامین میں اختیار کیا تھا۔ اسی طرزِ فکر کی وجہ سے ابن سینا کے ہاں وہ فکری گہرائی ہے جو الرازی سمیت دیگر لوگوں میں نہیں ملتی۔ اس نے ایک نظریہ پیش کیا کہ اگر وقوعات کو مسبب سلسلے مان کر غور کیا جائے تو جسم کی ہر چیز کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری آج کی سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ دنیا میں یہ ایک عام سی بات لگتی ہے لیکن گیارھویں صدی میں یہ ایک نئی بات تھی اور ابن سینا اس کی صداقت کو ثابت کرنا چاہتا تھا۔ برسوں کے علاج معالجے اور سائنسی مطالعہ کے بعد اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ بیماری پانی، ہوا اور مٹی کے ذریعہ پھیل سکتی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ ہر بیماری کی اپنی خاصیتیں ہوتی ہیں اور، اسی لیے، علاج مختلف ہونا چاہیے۔ ابن سینا ان لوگوں میں سے ایک ہے جنھوں نے تجرباتی طب کو رواج دیا۔ اس نے اپنی یادگار کتاب ''القانون'' میں زور دیا کہ دوائیں صرف نظریے کی بنیاد پر تجویز کرنے کی بجائے ان کی آزمائش متعین شدہ (Controlled Conditons) میں ہونی چاہیے۔ ہمہ گیر تاثیر سے خالی یا بیماری کے علاج میں آزمائش پر پوری نہ اترنے والی دوائیں اس کے نزدیک بے معنی ہیں۔ اس لیے کہ وہ علاج کو قسمت یا سریت کا معاملہ نہیں بلکہ مشاہدے اور تعقل پر مبنی علم خیال کرتا ہے۔ اس کی ''القانون'' اسلامی دنیا سمیت ہر جگہ میڈیسن کے ہر طالب علم کے لیے معیاری درسی کتاب بنی رہی۔ سترھویں صدی تک اس کا لاطینی ترجمہ یورپی میڈیکل سکولوں میں استعمال ہوتا رہا۔ چین میں مسلمانوں کی قابلِ ذکر تعداد موجود تھی جنھوں نے اس کا چینی زبان میں ترجمہ کیا جو چودھویں اور پندرھویں صدی کی یوآن سلطنت کے دوران زیرِ استعمال رہا۔ اس عظیم کتاب کو محض بیماریوں کے بیان اور ان کے علاج کا مجموعہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ یہ میڈیسن کا ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس میں اینیستھیزیا، چھاتی کے کینسر، کتا کاٹنے، زہروں سے متاثر ہونے، السر،

گردوں کی بیماری اور تپِ دق کے تفصیلی بیان ملتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ابن سینا نے ذہنی اور جسمانی صحت کے باہمی تعلق کو بیان کیا۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ زہر، زخم اور خوراک جیسے عوامل کی طرح منفی خیالات بھی جسم کو بیمار کر سکتے ہیں۔ آج ذہن اور جسم کے ممکنہ تعقل کی نشان دہی کا سہرا فرائیڈ اور ینگ (Jung) جیسے نفسیات دانوں کی پہلی نسل کے سر باندھتے ہیں۔ حالانکہ ابن سینا اور اس دور کے دیگر معالجین کے نزدیک یہ امکان بڑا حقیقی تھا۔

872ء میں مصر کے حاکم احمد ابن طولون نے فسطاط (Fustat) میں ایک ہسپتال 60,000 طلائی دینار کے خرچ سے بنوایا۔ اس میں لوگوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ اس میں ذہنی مریضوں کا شفاخانہ بھی تھا۔

اگر عظیم اداروں کی معاونت نہ ہوتی تو کسی بھی دور کے عظیم طبی ذہن اپنے کارنامے سرانجام نہ دے سکتے۔ اپنے وسیع مالی وسائل اور مضبوط سیاسی اداروں کی مدد سے مسلم دنیا نے تاریخ کے اولین ہسپتال قائم کیے۔ ان اداروں کا اصل مقصد نسبتاً غریب لوگوں کو علاج معالجے کی سہولیات فراہم کرنا تھا۔ امراء تو معالجین کی خدمات کے لیے معاوضہ دے سکتے تھے لیکن غرباء اس کے متحمل نہیں تھے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خلفاء اور امیروں نے مسلم دنیا کے بڑے شہروں میں بڑے بڑے ادارے قائم کیے۔ اس طرح کے پہلے پہل ہسپتال نویں صدی کے بغداد میں بنے۔ ان میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوئی اور یہ جسامت اور سہولیات میں جدید ہسپتالوں جیسے ہونے لگے۔ ان میں ماہرین خصوصی اور سرجنوں سمیت درجنوں ڈاکٹر اور عمومی دیکھ بھال کرنے والے ہوتے تھے۔ ان میں بیرونی مریضوں، ذہنی امراض، سرجری اور زچہ بچہ کے شعبے الگ الگ تھے۔ وہ آج کے ہسپتالوں سے یوں مختلف تھے کہ ان میں علاج بالکل مفت تھا۔ ان کے بانیوں کے سامنے پیغمبرؐ اسلام کی ہمدردی اور رحم کی مثالیں موجود تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام پر مبنی معاشرے میں تمام شہریوں کی دیکھ بھال ہونی چاہیے اور اس میں مذہب، نسل اور مالی حالت کا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ بغداد میں ان اداروں کے مستحکم ہو جانے کے بعد دسویں سے چودھویں صدی تک صحت بخشی کے لیے یہ خوش نہاد

ادارے مسلم دنیا کے دیگر بڑے شہروں میں بھی پھیل گئے۔ یہ شفا خانے قاہرہ، دمشق، بغداد، مکہ اور مدینہ سے لے کر آئبیریا کے غرناطہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعد میں عثمانیوں نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ عثمانیوں کے طویل دورِ حکومت کے دوران ہی اہلِ یورپ ان کے ساتھ شامل ہوئے اور پھر مسلم دنیا سے آگے نکل گئے۔

یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور میں بولونا اور پیڈورا جیسے سائنسی اور ثقافتی مراکز میں سینکڑوں عربی کتب کے لاطینی میں تراجم کیے گئے۔ جالینوس اور بقراط جیسے عبقری یونانیوں کے کام عربی سے تراجم کے ذریعے یورپ پہنچے اور بعد کی یورپی ترقی کی بنیاد بنے۔ آج کا طبی علم اور ادارہ اپنی اصل میں زیادہ تر مغربی ہے لیکن اسے اوائل کی مسلم روایت پر استوار کیا گیا۔ اور یہ مسلم روایت خود قدیم یونانی روایت پر قائم تھی۔ موجودہ دور کے دونوں طرف کے انتہا پسند تہذیبوں کے تصادم کا بیانیہ اپناتے ہیں تو اس طرح کی روایات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو کئی تمدنوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔

تیرھویں صدی میں ابن نفیس نے دل اور پھیپھڑوں کے درمیان دوران خون کو بیان کیا۔ پھیپھڑوں میں آکسیجن جذب کر کے دل کو جانے والا خون پورے جسم میں گردش کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

فزکس

مسلمان سائنس دانوں کو ریاضی بہت دور تک لے گئی۔ اگر انھیں کائنات میں کارفرما خدا کے مقرر کردہ اصولوں کو سمجھنا تھا تو ریاضی میں متشکل ہونے والے تصورات کا اطلاق حقیقی دنیا پر کرنا بہت ضروری تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں فزکس کے مسلم ماہرین کی ایک باصلاحیت جماعت سامنے آئی۔ دیگر مضامین کی طرح فزکس میں کام کرنے والے مسلمانوں نے پرانی تہذیبوں کے کام کا عربی ترجمہ کیا اور اسے آگے بڑھایا۔ عقل و دانش کی مختلف اور مسلم دنیا میں ترقی کرتے دیگر بہت سے علوم سے استفادے کے بعد مسلم زریں عہد کے طبیعات دانوں نے اس مضمون کے کئی بنیادی تصورات کو ترقی دی۔ ان کے کام سے وہ بنیاد بنی جسے نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے عبقری اذہان نے استعمال کیا۔

تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی اس علمی روایت میں اضافہ کرتے اولین لوگوں میں سے ایک ابن الہیثم تھا۔ اس کا زمانہ 965ء سے 1040ء تک کا تھا۔ اس کا تعلق عراق سے تھا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز عباسی حکومت کے ایک سرکاری اہلکار کی حیثیت سے کیا لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ کر قاہرہ کے ایک ابھرتے ہوئے علمی حلقے میں شامل ہوگیا۔ تب قاہرہ حریف فاطمی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ فاطمی حکمران کی ایک حکم عدولی کے باعث وہ قاہرہ میں ہی اپنے گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ابن الہیثم اور فزکس دونوں کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ نظر بندی کے دوران اس نے اپنا وقت روشنی کی ماہیت اور خصوصیات پر غور کرتے گزارا۔ قدیم دور سے ہی روشنی اور اس کی خصوصیات نے بہت بڑے بڑے اذہان کو چکرائے رکھا تھا۔ اس کے زمانے میں روشنی کے متعلق ایک ممتاز نظریہ ٹالمی کا پیش کردہ تھا۔ اس نظریے کی رو سے روشنی کی کرن آنکھ سے نکل کر خارجی جسم سے ٹکراتی ہے اور منعکس ہو کر دوبارہ آنکھ میں داخل ہوتی ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں وہ جسم ہمیں نظر آتا ہے۔ خارجی کائنات کو فقط فلسفے کے طریق پر سمجھنے کی قدیم یونانی روایت اس کے زمانے تک چلی آ رہی تھی۔ ابن الہیثم کو اس روایت سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سائنسی نظر تجربی مطالعہ اور تجربات کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے روشنی کی ماہیت پر سینکڑوں تجربات کیے۔ اس فلسفے کا عمل دخل کم کرتے ہوئے سائنس پر انحصار بڑھایا اور نتیجہ اخذ کیا کہ ٹالمی کا روشنی کے آنکھ سے خارج ہونے والا خیال قطعی غلط ہے۔ اس نے اپنا نظریہ پیش کیا کہ خارج میں موجود روشنی اجسام کے ہر ہر نقطے سے ٹکرا کر منعکس ہوتی اور پھر آنکھ میں جاتی ہے۔ آنکھ میں داخل ہونے والی روشنی کی ان بہت سی شعاعوں میں ہی وہ انفارمیشن ہوتی ہے جس پر دماغ عمل کرتا ہے اور بصارت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایران میں ابن سینا آنکھ میں روشنی کے راستے کو سمجھنے کے لیے اسے کھول رہا تھا۔ مصر میں اس نوعیت کا کام ابن الہیثم کر رہا تھا۔

برسوں کی محنت، تحقیق اور تجربات کے بعد ابن الہیثم نے ایک انقلاب انگیز کتاب ''کتاب المناظر'' کے نام سے لکھی۔ اس نے دلائل دیے کہ روشنی خطِ مستقیم میں سفر کرنے والی شعاعوں پر مشتمل ہے۔ اپنے نظریے کا ثبوت دینے کے لیے اس نے ایک آلہ بنایا جسے Camera Obscura کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بند ڈبہ ہوتا ہے جس میں باہر سے روشنی داخل نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک دیوار میں باریک سوراخ

بنایا جاتا ہے جو اپرچر کی طرح کام کرتی ہے۔ سوراخ کا رخ جس بیرونی جسم کی طرف کیا جاتا ہے اس کا خاکہ سورج کے سامنے دیوار پر بن جاتا ہے۔ اگر ابن الہیثم کے پاس مناسب ٹیکنالوجی ہوتی تو امیج کی تصویر بنا لینے والا کیمرہ چند قدم کی دوری پر تھا۔ اگر اس نے روشنی پر کام نہ کیا ہوتا تو 1000 سال کے بعد بننے والا کیمرہ وجود میں نہ آتا۔ اس نے روشنی کا مطالعہ فلکیاتی تحقیق میں استعمال کرتے ہوئے زمین کے کرۂ ہوائی کی موٹائی ماپنے میں استعمال کیا۔ اس نے روشنی کے انعطاف کے خصائص کا مطالعہ کیا اور اخذ ہونے والے نتائج کی بنیاد پر ثابت کیا کہ غروب آفتاب کے وقت افق کے بدلتے رنگوں کا انحصار کرہ ہوائی کے ساتھ سورج کی شعاعوں کے زاویے پر ہے۔ اس نے رنگوں اور زمین کے لحاظ سے سورج کے محلِ وقوع کے باہمی تعلق پر طویل مشاہدات کو کرۂ ہوائی کی موٹائی معلوم کرنے کے حساب کتاب میں جوڑا۔ اس کی معلوم کردہ موٹائی اصل سے کچھ بہت مختلف نہیں تھی۔ اس کی حسابی طریقوں سے معلوم کردہ موٹائی کی تصدیق اس وقت ہوئی جب امریکہ اور سوویت یونین نے خلائی جہاز بھیجنا شروع کیے۔

ابن الہیثم کے سائنسی کاموں کا احاطہ کئی ایک کتابیں لکھنے کا متقاضی ہے۔ یہ کام درحقیقت کیا بھی گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے 200 کے قریب کتابیں لکھیں لیکن آج صرف چند درجن باقی ہیں۔ اسے محدب عدسے، قوانین حرکت، تحلیلی جیومیٹری، کیلکولس، فلکیات اور حتیٰ کہ، تجربی نفسیات میں بانی سائنس دان کی حیثیت حاصل ہے۔ جب اس کے سارے کاموں کو یکجا دیکھا جاتا ہے تو ہم اس کے کام کی حقیقی تحسین کر سکتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کا حقیقی کام سائنسی طریقہ کی دریافت اور اس کا اطلاق ہے۔ آج یہی طریقہ تمام سائنس دان اپنے تحقیقی کام میں استعمال کرتے ہیں۔ ابن الہیثم نے فقط مشاہدے اور تجربے کو ہی قابلِ اعتناء جانا اور اس طرح سائنس کو قدیم یونانیوں کے فلسفے سے الگ کیا۔ اسی عبقری دانش ور نے اس طریقہ کو ابتدائی شکل دی جو دنیا بھر میں زیرِ استعمال ہے اور سائنسی طریقہ کہلاتا ہے۔ سائنسی مطالعہ میں اپنے انہماک کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن الہیثم لکھتا ہے ''مجھے علم اور صداقت کی مستقل تلاش ہے۔ میرا عقیدہ بن چکا ہے کہ خدا کے فضل اور قربت کے لیے صداقت اور علم کی تلاش سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے۔''

ابن الہیثم کی وفات کے بعد مسلم سائنس دانوں نے اس کی دریافتوں کو آگے بڑھایا اور ان کے عملی استعمالات دریافت کیے۔ کیمسٹری کے تجربہ گاہی آلات سے لے کر آبی گھڑیال تک بہت سی چیزیں بنائی گئیں۔ تیرھویں صدی کی اسلامی دنیا میں کرینک شافٹ، پانی کے پمپ، چشمے، قطب نما، گلائیڈر، اور پانی کی طاقت پر چلنے والے روبوٹ بنائے جا چکے تھے۔ یہ فہرست یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سائنس میں اعلیٰ مطالعہ کی بدولت مسلم دنیا میں ٹیکنالوجی کا انقلاب آ گیا۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں صلیبی جنگوں اور منگولوں نے مسلم دنیا کے قلب کو نیست و نابود کر دیا اور مسلمانوں کا تخلیقی جذبہ ماند پڑنے لگا تو اسے یورپ نے اختیار کر لیا۔ وہاں کوپرنیکس، گیلی لیو اور نیوٹن کی بدولت ایک اور سائنسی انقلاب آیا۔ اس انقلاب کی بنیاد رکھنے والے مسلم سائنسی ادب سے آگاہ اور یقیناً اس سے متاثر بھی تھے۔

بارھویں صدی کے ایک مسلمان موجد الجزری نے بہت سی خودکار مشینوں کو ڈیزائن کیا اور بنایا۔ ان میں ہاتھ دھلوانے کا خودکار نظام، گھڑیال اور پانی کی طاقت سے موسیقی پیدا کرتے روبوٹ بھی شامل تھے۔

چھٹا باب

اسلامی علوم

پیغمبرؐ کے صدیوں بعد طبیعی اور ریاضیاتی علوم کے پہلو بہ پہلو اسلامی علوم بھی ترقی کر رہے تھے۔ قرآن اور حدیثِ رسولؐ کو سمجھنے اور ان کی تفسیر کی کوشش کے دوران بہت سے نئے علوم اور ذیلی علوم وجود میں آئے۔

اسلامی علوم کا بنیادی ڈھانچہ پیغمبرؐ کی ایک حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے جو حدیث کے بہت سے مجموعوں اور بالخصوص بخاری میں موجود ہے۔ اس حدیث کے مطابق ایک پراسرار شخص آپؐ کے پاس آیا اور تین اصطلاحات اسلام، ایمان اور احسان کے معنی پوچھے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو مان لینا، روزانہ پانچ بار نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور توفیق ہو تو حج کرنا، اسلام ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کے ہونے، اس کے فرشتوں، نازل ہونے والی کتابوں، اس کے پیغمبروں، روزِ قیامت، اور تقدیر کو مان لینا ایمان ہے۔ خدا کی ایسے عبادت کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو یا کم از کم وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، احسان ہے۔ اس بنیادی ڈھانچے کو استعمال کرتے ہوئے عالموں نے اسلامی علوم کو تین بڑی اقسام میں رکھا جن کا تعلق اسلامی اعمال، اسلامی عقائد اور اسلامی روحانیت سے ہے۔

فقہ

عمومی تعریف میں فقہ ''اسلامی قانون'' کہلاتا ہے۔ اس تعریف میں کسی قدر جھول ہے۔ اس لیے کہ

قانون کی جدید مغربی تعریف فقہ کا احاطہ نہیں کرتی۔

پہلے دور کے مسلمانوں کے نزدیک فقہ انفرادی عبادات سے معاشرتی میل جول اور حکومتی حکمتِ عملی تک تمام معاملات کا احاطہ کرتا تھا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ فقہ کو قدرے وسیع تر معنی میں لیا جائے اور اسے اسلامی اصولِ قانون کہا جائے۔

دورِ اولیٰ میں فقہ کے ماہرین کو درپیش بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہردم بدلتی اور ہمہ نوع دنیا پر آپؐ کی زندگی کا اطلاق کس طرح کریں۔ جیسے جیسے مسلم دنیا پھیلی اور آئبیریا، عراق اور ہندوستان جیسے دور دراز کے خطے اس میں شامل ہوئے ایسی صورتیں زیادہ سے زیادہ سامنے آنے لگیں جن سے آپؐ کو کبھی براہِ راست واسطہ نہ پڑا تھا۔ تب فقہ کے ماہرین نے ایسے کئی طریقے نکالے جن سے کام لے کر آپؐ کی مثالوں کو ان نت نئی صورتوں پر منطبق کیا جا سکتا تھا۔ پہلے عظیم فقیہہ ابوحنیفہؒ (وفات 767ء) تھے۔ فقہ کے معاملے میں ان جیسی خلاق طبیعت اور تحرک اور کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے اور ان کی نشو و نما عراق میں ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے اردگرد کی معاشرت کا ایک صدی پہلے والے پیغمبرؐ کے مدینہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے زمانے کا عراق عرب اور غیر عرب، مسلم اور غیر مسلم اور صحرائی خانہ بدوشوں اور شہر کے باسیوں کے باہم ملاپ کا علاقہ تھا۔ ابوحنیفہؒ اور ان کے کوفی رفقائے کار (بالخصوص ابو یوسفؒ اور محمد الشیبانیؒ) کو درپیش اصل مسئلہ یہ تھا کہ اتنی متنوع نسلوں اور ثقافتوں کے لوگوں پر اسلامی تعلیمات کا اطلاق کس طرح کریں۔ کچھ مسائل اور بھی تھے، مثلاً یہ کہ اگر اسلام کی آخری اور حتمی کتاب قرآن میں کسی خاص معاملے پر واضح ہدایت نہیں ملتی تو کیا کیا جائے۔ یا اگر کسی معاملے پر ملنے والی احادیث میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے تو کیا ہوگا۔

ابوحنیفہؒ (اور اول دور کے دیگر فقہا) کو مسلمانوں کی زندگی میں قرآن اور سنت کے کردار پر درپیش مسئلے کی ایک مثال تو اس حدیث سے سامنے آتی ہے جس میں یمن پر حکومت کرنے کے لیے ایک صحابی حضرت معاذؓ بن جبل کو بھیجنے کا ذکر ہے۔ پیغمبرؐ نے ان سے پوچھا کہ وہ کسی خاص صورتحال میں اپنا فیصلہ کس طرح کریں گے۔ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ فیصلہ قرآن کے مطابق ہوگا۔ اگر قرآن سے جواب نہ ملا تو وہ پیغمبرؐ کی مثالوں میں سے کسی پر بھروسا کرے گا۔ اگر پیغمبرؐ نے بھی اس

خاص موضوع پر کبھی کچھ نہ فرمایا ہوگا تو وہ مناسب جواب کے لیے اپنے استدلال پر بھروسا کریں گے۔ اسی حدیث سے وہ بنیادی ڈھانچہ ملتا ہے جسے کام میں لاکر فقہ کی وہ علمی تدریج کی جسے اصول الفقہ (قانون کے منابع یعنی سرچشمے) کہا جاتا ہے۔

مسلم لائحہ عمل کے لیے رہنمائی کا پہلا اور اہم ترین سرچشمہ قرآن ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس پر کسی اور چیز کو فضیلت حاصل نہیں ہے۔ لیکن قرآن قانون کی عام کتابوں کی طرح نہیں ہے۔ ایسی آیات کی تعداد نسبتاً کم ہے جن میں اللہ نے حضرت محمدؐ کو کسی کام کا براہِ راست حکم دیا ہے۔ اور ایسی آیات میں جزئیات موجود نہیں ہیں کہ مسلمان وہ خاص کام کس طرح سے سرانجام دیں گے۔ مثلاً قرآن میں مسلمانوں کو نماز کا حکم دیا گیا ہے لیکن تفصیل موجود نہیں ہے کہ نماز کس طرح ادا کرنا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سنت سے رہنمائی لی جاتی ہے۔ مسلم فقہا سنت کو قرآن کی تشریح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب قرآن میں نماز کا طریقہ مفصل موجود نہیں ہے تو فقہا دیکھیں گے کہ آپؐ نے نماز کس طرح ادا کی۔ آپؐ کی نماز کا طریقہ صحابہ نے بیان کیا اور پھر نسل در نسل چلتا فقہا تک پہنچا۔ چنانچہ اصول کی سیڑھی کے دوسرے اور تیسرے درجہ پر آپؐ کی سنت اور آپؐ کے صحابہ کا عمل آتا ہے۔

لیکن کچھ ایسے معاملات پھر بھی موجود تھے جہاں قرآن، سنت اور صحابہ کا طریق کار تینوں خاموش تھے۔ ابو حنیفہؒ کے زمانے کے عراق میں بالخصوص ایسی صورتوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اوائل کے فقہا نے قیاس یعنی تمثیلی استدلال کو مناسب قرار دیا۔ اس عمل کی منطق بڑی سیدھی تھی۔ اگر کوئی ایسی صورت سامنے آتی ہے کہ پہلے تین ذرائع یعنی قرآن، سنت اور طریق صحابہ میں اس کی مثال یا نظیر موجود نہیں تو اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ دیکھیں گے جس پر قرآن، سنت یا طریقِ صحابہ میں حکم موجود ہے۔ ان دو مسئلوں کی مطابقت اور مشابہت دیکھ کر فقہا نئے مسئلے پر اپنا فیصلہ دیں گے۔ ایک سادہ اور نئے مسئلے کی مثال کے طور پر دیکھیں کہ اسلامی فقہ میں کار چلانے پر کس طرح حکم لگایا جائے گا۔ کار ساتویں صدی میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ کار چلانے کی اجازت پر قرآن، سنت اور طریق صحابہ خاموش ملیں گے۔ لیکن چونکہ کار کا بنیادی مقصد نقل وحمل ہے اور آپؐ اور صحابہ کے دور میں اونٹوں اور گھوڑوں پر نقل وحمل ہوتی تھی، چنانچہ فقہا تطبیق کریں گے کہ کار چلانا جائز ہے۔

کار چلانے کی اجازت جیسے مسائل کافی سیدھے اور سادہ ہیں لیکن قیاس کی حدود بہت دور تک پھیل گئیں۔ عالموں کے مابین ایسے معاملات پر اختلاف پیدا ہو گئے کہ مشابہت کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اور کیا قرآن اور سنت کے ہر طرح کے احکام کو مشابہت کی نوعیت کہا جا سکتا ہے یا یہ کہ مشابہت کا اصول استعمال کرنے کے لیے دونوں مسائل کی مشابہت کس قدر ہونی چاہیے کہ تطبیق کی جا سکے۔ ابوحنیفہؒ نے محسوس کیا کہ اگر عراق جیسی متنوع آبادی میں فقہ نافذ کرنا ہے تو تعقل اور منطق کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا خیال تھا کہ قرآن اور سنت کی لفظی تعبیر کی جاتی رہی تو آپؐ کے دور کے مدینہ سے قطعاً مختلف اور مسلسل بدلتی معاشرتوں میں اسلامی احکام کا نفاذ ممکن نہ ہو سکے گا۔

لیکن ابوحنیفہؒ کے معاصر مالک ابن انس (متوفی 795ء) کا اندازِ فکر بالکل مختلف تھا۔ مالکؒ مدینہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ آپؐ کے وصال کے بعد کی پوری صدی میں مدینہ کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ اس شہر میں ان کے پاس کے لوگ اور شرکائے کار صحابہ کی اولاد یا اولاد کی اولاد تھے۔ مذہب کے بارے میں ان کا اندازِ فکر خود صحابہ سے حاصل کردہ تھا جو آپؐ سے قریب رہے تھے۔ چنانچہ ان کی دلیل تھی کہ مدینے کے لوگوں کی زندگی اصولِ قانون کا منبع بن سکتی ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ اگر مدینہ کے تمام باسی کسی ایک شے یا کسی چیز کے عمل کے طریقہ پر متفق ہیں تو انھوں نے براہِ راست صحابہ سے سیکھا ہوگا اور صحابہ نے آپؐ سے سیکھا ہوگا۔ اس لیے ان کا طرزِ عمل خود سنت جیسا درجہ رکھتا ہے لیکن ابوحنیفہؒ اور ان کا عراقی مکتبِ فکر مقامی روایات کو متلون قرار دے کر اصول فقہ میں شامل کرنے کے خلاف تھا۔ ابوحنیفہؒ کے قریبی شاگردوں میں سے ایک الشیبانیؒ مدینہ جا کر مالکؒ سے علم حاصل کرتے رہے لیکن بالآخر انھوں نے عراقی مکتبِ فکر کو ترجیح دی۔ انھوں نے تو مالکؒ کے اس اندازِ فکر کے جواب میں ایک کتاب ''حجت علی اہلِ مدینہ (Response to the People of Medina) بھی لکھی کہ مقامی رسوم و رواج کو اصول فقہ میں طریق کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن یہ سمجھنا بھی بڑا ضروری ہے کہ اگرچہ فقہ کے متعلق یہ اختلافات بہت شروع میں پیدا ہو گئے تھے لیکن ان مکاتب فکر نے ایک دوسرے کو بدعقیدہ یا گمراہ نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ ان کے

اختلافات نسبتاً معمولی تھے اور اجزائے ایمان کے متعلق نہ تھے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

تیسرا مکتب فکر محمد الشافعیؒ (متوفی 820ء) کا تھا۔ ان کا تعلق عسقلان کے علاقے غزا سے تھا۔ وہ نوعمری میں مدینہ جا کر امام مالکؒ سے علم حاصل کرنے لگے تھے۔ پہلے دو فقہا کے برعکس شافعیؒ نے کچھ سفر بھی کیے تھے۔ وہ مدینہ میں قیام کے بعد یمن، عراق اور مصر میں بھی رہے۔ عراق میں قیام کے دوران وہ الشیبانیؒ سے پڑھتے رہے۔ اس طرح انھیں فقہ کے دونوں مکاتب سے استفادے کا موقع ملا۔ تاہم ان کا اپنا طریق ان دونوں مکاتب سے الگ تھا۔ ان کے تعقل اور استدلال کا استعمال عراقیوں اور مدینہ والوں کا سا نہیں ہے۔ حدیثوں کے متعلق ان کے اندازِ فکر سے سمجھا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے معاصر دونوں مکاتب سے کس طرح کے اختلاف تھے۔ مثال کے طور پر ابوحنیفہؒ نے متواتر احادیث کو دیگر پر ترجیح دے کر وہ اصول ترتیب دیے جنھیں غیر متواتر احادیث کی تشریح میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابوحنیفہؒ کے فقہی اندازِ فکر کا محور چند اصول ہیں۔ معاملہ ان اصولوں سے باہر ہو تو استدلالی اندازِ فکر کے مواقع موجود ہیں۔ دوسری جانب شافعی کا نقطہ نظر تھا کہ متواتر احادیث کے مقابلے میں احاد حدیثوں کا علمی اعتبار سے کم معتبر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے باہم متناقص احادیث کے معاملے میں شافعی نے تنسیخ حدیث کا یہ اصول وضع کیا کہ اگر آپؐ کی بعد کی زندگی سے کوئی حدیث ملتی ہے تو اس کے مقابل آنے والی اوائل کی زندگی سے روایت ہونی والی حدیث نظر انداز ہو سکتی ہے۔ یوں شافعی کا اندازِ فکر ایک ایسا نظام بن گیا جو فقہ میں استدلال کی سہولت دیتا تھا۔ لیکن اپنے پیش رو دونوں مکاتب فکر کے مقابلے میں شافعی کے ہاں استدلال کی گنجائش محدود تھی۔

اوائل کے چار فقہا میں سے آخری احمد بن حنبلؒ (متوفی 855ء) تھے۔ وہ خود شافعیؒ کے طالبعلم تھے۔ ان چاروں میں سے حنبلؒ کا طرزِ فکر لفظی معنوں کے سب سے زیادہ قریب رہنے کا ہے اور وہ استدلال میں باقی تینوں سے زیادہ محدود ہیں۔ اگرچہ حنبلؒ نے بھی باقی تینوں کی طرح قیاس کی گنجائش رکھی لیکن وہ اسے ہر ممکن حد تک محدود رکھنے کے حق میں ہیں۔ وہ حدیث میں بھی لفظی معنوں کے نزدیک تر رہنے کے حق میں ہیں۔

ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور ابن حنبلؒ کے طریق بعدازاں فقہ کے چار مکاتب فکر بن گئے جنھیں مذاہب کہا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ چاروں سنی اسلام میں چار مسلمہ فقہ کی صورت اختیار کر گئے۔ قرآن اور حدیث کی تعبیر میں استدلال کے کردار کو بنیاد بنا کر چاروں مکاتب فکر کو درجہ وار رکھا جائے تو ایک انتہا پر حنبلی اور دوسری پر حنفی آتے ہیں۔ استدلال کی آزادی کے باعث حنفی مکتب فکر میں بہت لچک تھی، اسی لیے یہ تمام مسلم دنیا میں پھیل گیا۔ عباسیوں، سلجوقوں، عثمانیوں اور مغلوں جیسے بڑے شاہی خاندانوں سے تعلق اور لچکدار فقہی اصولوں کے باعث بدلتے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کی اہلیت کے باعث اسے وسطی ایشیا، ترکی، بلقان، برصغیر پاک و ہند میں اور عراق، شام اور مصر کے کچھ حصہ میں غلبہ حاصل ہوا۔ یہ طرزِ فکر خود مالکؒ کی حیات میں ہی مغرب رخ پھیلنے لگا۔ یہ شمالی اور مغربی افریقہ اور جزیرہ نما آئبیریا میں غالب مکتب فکر بنا۔ مصر، ایران، مشرقی بحیرہ روم، یمن، بحرہند کے ساحلی علاقوں، انڈونیشیا اور زنجبار تک شافعی مکتب غالب آگیا۔ حنبلی فکر زیادہ تر جزیرہ نما عرب اور آئبیریا اور مشرقی خطہ بحیرہ روم تک محدود رہی۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ مکاتب فکر اپنے بانیان، جو ان کی وجہ تسمیہ بھی ہیں، کی وفات کے بعد رک نہیں گئے۔ اگرچہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور حنبلؒ نے الگ الگ نظریہ قانون دے کر اپنے اپنے مکتب فکر کی بنیاد رکھی لیکن اگلی کئی صدیوں تک ان کے ماننے والوں نے ان کے اخذ کردہ اصول استعمال کرتے ہوئے فقہ کی بڑی جامع کتب لکھیں۔ ان میں انفرادی اور اجتماعی عبادات سے لے کر کاروباری لین دین، حکومتی ساخت اور ریاستی حکمتِ عملی تک کم وبیش ہر چیز کا احاطہ کیا گیا تھا۔ مسلم دنیا میں جب بھی پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں کافی اور تمباکو کے متعارف ہونے جیسے، نئے مسائل سامنے آئے فقہ کے ماہرین نے ان چار مکاتب کے نظریہ قانون کو استعمال کیا اور ان کے متعلق احکام اخذ کیے۔ چنانچہ ان فقہی مکاتب کو ایسے ساکن مجموعہ ہائے احکام فرض کرنا مناسب نہیں جو بے لچک ہیں اور بدلتے حالات کے ساتھ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ یہ اپنی اصل میں ایسے طریق ہائے فکر ہیں جو نئے حالات کے مطابق ڈھل سکتے ہیں اور آج بھی تحرک انگیز ہیں۔

عقیدہ

اسلامی الٰہیات کے معاملات فقہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ متنازعے تھے۔ دورِ اولیٰ کے علماء میں اتفاق رائے تھا کہ فقہی معاملات نسبتاً کم اہم معاملات جن کا تعلق طریق عمل سے ہے لیکن اگر کسی کا نظام عقائد آپؐ کی قائم کردہ مثالوں سے ہٹا ہوا ہے تو آخرت میں اس کی بخشش خطرے میں ہے۔ چنانچہ جہاں فقہی معاملات میں اختلاف قابلِ برداشت ہے وہاں مسلمانوں کے مابین عقائد کا اختلاف اسلام کو بطور مذہب خطرے سے دوچار کرسکتا ہے۔

اس طرح کے ایک مسئلے کو پہلی بار زیرِ غور لانے والے ماہرین الٰہیات خارجی کہلاتے ہیں۔ یہ ساتویں صدی کے دوسرے نصف کے لوگ تھے۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ تنازعے میں ثالثی قبول کی تو خارجیوں نے حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کردی۔ انھیں حضرت علیؓ کو شہید کرنے کے لیے جواز دینا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ حضرت علیؓ نے فیصلہ ایک تیسرے شخص پر ڈال کر گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور گناہِ کبیرہ خدا پر ایمان کو فسخ کردیتا ہے۔ ان کے نزدیک اس طرح حضرت علیؓ نے ارتداد کیا ہے یعنی وہ اسلام سے پھر گئے ہیں اور وہ سزائے موت کے مستحق ہیں۔ اس عمل میں حضرت علیؓ کے ساتھی بھی اسی سزا کے مستحق قرار دیے گئے۔ انتہاپسندوں کے اس چھوٹے سے گروہ نے قتل و غارت اور خوف و ہراس پھیلانے پر کمر باندھی۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان جوان سے متفق نہیں تھا گناہ کبیرہ کا مرتکب تھا۔

خارجیوں کی رائے اس وقت کے زیادہ تر مسلمانوں کی رائے سے بنیادی سطح پر مختلف تھی اور یہی ان کا مسئلہ تھا۔ ان کی تعداد ہمیشہ بہت قلیل رہی۔ جبکہ اسلامی الٰہیات کے زیادہ تر علماء کا استدلال تھا کہ عقیدے اور عمل کے مابین خطِ امتیاز کو یوں مبہم کرنے کی نظیر اسلامی فکر میں نہیں ملتی۔ فقہ کے حنفی مکتب فکر کے بانی نے الٰہیات پر ایک رسالہ لکھا۔ وہ اس میں کہتے ہیں کہ ''اگر کسی مومن نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو خواہ وہ گناہِ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، اسے مرتد نہیں کہتے۔'' ابوحنیفہؒ نے اپنی رائے اس بنیاد پر دی کہ آپؐ اور صحابہ سے یہ طرزِ فکر ثابت نہیں تھا۔ اس لیے دورِ اولیٰ کے عالموں نے الٰہیات کی مروجہ روایت برقرار رکھی اور خارجی تعبیرات کو رد کردیا۔ انھوں نے خارجی تعبیرات کو مروجہ اور ثابت

کے الٹ قرار دیا۔ 661ء میں حضرت علیؓ کو شہید کرنے کے بعد وہ دو ایک عشرے خطرہ بنے رہے لیکن ان کا طرزِ فکر اسلامی فکر کے مرکزی دھارے میں جڑ نہ پکڑ سکا۔

جب خارجیوں کا خطرہ معدوم ہونے لگا تو الٰہیاتی روایت کی تعبیرِ نو کے لیے ایک اور مکتبِ فکر سامنے آیا۔ تعبیرِ نو کے ان دعویداروں کو معتزلہ کہا جاتا ہے۔ یہ الٰہیات میں تعقل و استدلال کے زبردست حامی تھے اور خدا و غیب کی ماہیت پر بحث میں کوشاں تھے۔ دیگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے جس کا متن خدا اور اس کے اوصاف کے حوالے سے دوٹوک تھا۔ تاہم جہاں عام مسلمان قرآن میں موجود صفاتِ خداوندی کی باریکیوں میں نہیں جاتے تھے وہاں یہ مسلمان ان پر انسانی تعقل اور منطق کا اطلاق چاہتے تھے۔

مثال کے طور پر قرآنی متن کے مطابق انسانوں کی طرح خدا کا ہاتھ بھی ہے۔ معتزلہ کی دلیل تھی کہ اس طرح کی آیت کو بطور کنایہ لینا چاہیے۔ اس لیے کہ ہاتھ انسانی اوصاف میں سے ہے اور ان اوصاف کو خدا کی طرف منسوب کرنا انتہائی نامناسب ہے۔ معتزلہ نے اس طرح کے تنازعات خدا کے دیکھنے، سننے اور بالخصوص بولنے کے متعلق بھی کھڑے کیے۔ ان کی دلیل تھی کہ قرآن کو لفظی معنوں میں خدا کا کلام نہیں کہا جا سکتا۔ بصورت دیگر قرآن بھی خدا کے ساتھ ابدی ہو جائے گا جو کہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ خدا کو انسان سے اتنا بلند، ارفع اور ماورا مانتے تھے کہ انسان اس کے ساتھ کوئی صفات وابستہ کرنے کا اہل نہیں ہے خواہ وہ قرآن میں موجود صفات ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ سارا طرزِ فکر متنازعہ بن گیا۔ اس لیے کہ خدا کو انسانی سطح سے ماورا ماننے کی بنیاد بعض قرآنی آیات کو استعارے قرار دینے پر تھی۔ قرآنی تشریح کے اس طریق کو دوسرے لوگ صوابدیدی اور بلاجواز قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں اس طرزِ فکر سے سارا قرآن ہی حقیقی معنوں سے خالی قرار دے دیا جائے گا۔

خدا کے عادل ہونے کی صفت پر بحث کرتے ہوئے بھی معتزلہ نے اپنے نظریے کے مطابق منطقی موشگافیوں سے کام لیا اور عام مسلمانوں کو برہم کیا۔ انھوں نے دلیل دی کہ چونکہ اپنی مخلوق کے متعلق فیصلے کرتے ہوئے خدا عدل سے کام لیتا ہے چنانچہ وہ گناہ گاروں میں سے کچھ کو معاف کرنے پر قادر نہیں۔ اس لیے کہ یہ دیگر گناہ گاروں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ قدرتی بات تھی کہ یہ اندازِ فکر

بڑا متنازعہ ثابت ہوا۔ ان کے روایت پسند ناقدین نے جواباً کہا کہ یہ قادرِ مطلق خدا پر ایمان کی اسلامی تعلیم سے متصادم اور اوائل کے مسلمانوں کے طرزِ عمل سے مختلف ہے۔

خارجیوں کے برعکس معتزلہ کی صفوں میں کچھ عالم بھی شامل ہو گئے جو بڑھتے بڑھتے ایک قابلِ ذکر قوت بن گئے۔ ان کا نمایاں ترین حمایتی عباسی خلیفہ المامون تھا۔ وہ نہ صرف خود معتزلی ہوا بلکہ اسے ریاستی نظریہ بھی بنا دیا۔ اس نے عباسی سلطنت میں موجود عالموں کو اس نظریے پر لانے کے لیے دار و گیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اس کی شدید ترین مخالفت احمد بن حنبلؒ نے کی۔ وہ اسلامی الٰہیات کو معتزلی قیاس آرائیوں کے حوالے کرنے کی مزاحمت کرتے رہے۔ حنبلؒ اور ان کے ہم فکر سمجھتے تھے کہ خدا کی صفات وہی ہیں اور ویسی ہیں جو اور جیسی قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ انسانی تعقل سے ان صفات کو سمجھنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ بالآخر حنبلؒ کو قید کر دیا گیا۔ اپنی مستقل مزاجی کے باعث وہ معتزلی الٰہیات اور الٰہیاتی معاملات میں حکومتی مداخلت دونوں کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گئے۔

ابن حنبلؒ کے مکتب فکر (جو بالعموم اثریہ کہلاتے ہیں) نے اسلامی الٰہیات کے روایتی طرزِ فکر کو معتزلہ سے بچا لیا۔ اس کے بعد معتزلہ کے سب سے بڑے مخالف اشعری اور ماتریدی سامنے آئے ابوالحسن اشعری (متوفی 936ء) اور ابو منصور الماتریدی (متوفی 944ء) نے معتزلہ کے ہاں تعقل کے غلو اور حنبلیوں کے ہاں اس کے شدید مسترد کیے جانے کے درمیان ایک متبادل راستہ مہیا کیا۔ یہ مکتب فکر خدا اور الٰہیات کے متعلق قرآنی بیانات کی تشریح کے لیے وہ منطقی طریقہ استعمال کرنے کے حق میں تھا جن پر معتزلہ اصرار کرتے تھے لیکن وہ قرآنی بیان کی تعبیرِ نو کے خلاف تھے۔ مختصراً یہ کہ اشعریوں اور ماتریدیوں کے ہاں تعقل کو وحی کے مطابق ہونا چاہیے جبکہ معتزلہ کے نزدیک وحی کو تعقل کے مطابق ہونا چاہیے۔

دسویں اور گیارھویں صدی کے اواخر میں معتزلی نظریہ معدوم ہوتا چلا گیا۔ المامون کی چھان پھٹک اور دار و گیر بھی معتزلیوں کے کسی کام نہ آ سکی۔ بالآخر بعد کے عباسی حکمرانوں نے اس کی سرکاری سرپرستی پر ختم کر دی۔ خود معتزلہ بھی بہت سے متصادم فرقوں میں بٹ گئے۔ اب ان کے پاس وکالت کے لیے

کوئی متفق علیہ نظریہ نہ رہا۔ اس اثناء میں اشعری ماہر الٰہیات الغزالی اور ماتریدی ماہر الٰہیات النسفی نے اپنی تصانیف میں معتزلہ کا مدلل اور مسکت رد پیش کیا اور ان کا رہا سہا اثر بھی ختم ہو گیا۔ ان تینوں یعنی اثریہ، اشعریہ اور ماتریدیہ مکاتب فکر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ جو معمولی فرق تھا وہ اکثر الفاظ کے معنیاتی (Semantics) اختلاف کی پیداوار تھا۔ یہ تینوں اسلام کے سنی نظریے کے مکاتب فکر جانے جاتے ہیں۔ اہلِ سنت کا پورا نام اہلِ سنت والجماعت ہے۔ نام کا پہلا حصہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ الٰہیاتی مسائل پر روایتی طرزِ فکر رکھتے ہیں جبکہ دوسرا حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ یہ الٰہیاتی مسائل پر مسلم امت کی اکثریت کے ساتھ متفق ہیں۔ ان تین مکاتب فکر نے اپنا قانونی موقف آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔

تصوف

اسلامی علوم کی تیسری بڑی قسم روحانیت کا احاطہ کرتی ہے جسے بسا اوقات تصوف یا تزکیہ بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ تصوف کا تعلق باطنیت سے ہے اور یہ خدا کے ساتھ بندے کے انفرادی تعلق پر مبنی ہے، چنانچہ فقہ اور عقیدہ کے مقابلے میں، جن کا تعلق مذہب کے ظاہر سے ہے، اس کی تاریخ کا سراغ اور بیان قدرے مشکل ہے۔

فقہ اور عقیدے کی طرح تصوف کی جڑیں بھی ابتدائی صدیوں کے بڑے عالموں کے کام میں تلاش کی جاسکتی ہیں جنھوں نے اپنے اعمال کی بنیاد اتباعِ رسولؐ اور قرآنی ممنوعات کے مطابق رکھی۔ ان اولین بڑی شخصیتوں میں سے ایک حسن بصری (المتوفی بہ 728ء) تھے جو عراق کے شہر کوفہ کے رہنے والے تھے۔ دنیا سے لاتعلقی اور خدا پر توکل ان کی وجہ شہرت تھی۔ ان کی ایک اور ہم عصر صوفی خاتون رابعہؒ العدویہ (المتوفی بہ 801ء) تھیں جن کی روحانیت ساری مسلم دنیا میں مشہور ہوگئی۔ خدا سے فرد کی محبت کے حوالے سے ان کا یہ حکیمانہ نکتہ بہت معروف ہوا، ''اے خدا اگر میں تیری عبادت جہنم کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے اس میں جلا اور اگر میری عبادت جنت کے لالچ میں ہے تو اس کے دروازے مجھ پر بند کردے۔ لیکن اگر میری عبادت فقط تیری ذات کی خاطر ہے تو مجھے اپنا دیدار کروا دے۔'' اس مقولے کو تصوف میں خدا کی محبت اور اس پر توکل کی اہمیت کا مختصر بیان سمجھنا چاہیے۔

جس طرح فقہ کے ساتھ ہوا تھا، اوائل کے صوفی افکار کا تانا بانا بالآخر ایک متعین شکل میں ڈھلا اور مکتب فکر بن گیا۔ بارھویں سے پندرھویں صدی تک عبدالقادر جیلانیؒ (التوفی بہ 1166ء) معین الدین چشتیؒ (التوفی بہ 1236ء) ابن عربیؒ (التوفی بہ 1240ء) اور ابوالحسن شادلیؒ (التوفی بہ 1258ء) جیسی شخصیات کے گرد تصوف کے کئی طریق بن گئے۔ ان طریق یا سلسلوں نے روح کی تطہیر کے لیے مختلف طریقے متعارف کروائے۔ ان کا خاص زور سخاوت، ذات کی نفی، یادِ خدا اور انکساری پر تھا۔ کسی سلسلے میں داخل ہونے کے لیے شیخ کے راستے پر چلنا پڑتا ہے جو خدا سے قریب ہونے میں اپنے مریدوں کی مدد کرتا ہے۔ جب اس شیخ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے مریدوں میں سے کوئی سلسلے کے معاملات سنبھالتا اور طالبعلموں کی اگلی نسل کو رہنمائی دیتا ہے۔ اس طرح ہر سلسلے کے شیخوں کی ایک لڑی ہوتی ہے۔ سلسلے میں پیچھے کی طرف چلتے ہوئے بالآخر اس کے بانی شیخ کا نام ہے جس کے نام سے یہ سلسلہ جانا جاتا ہے۔ ہر سلسلہ اپنا تعلق اپنے بانی شیخ کی وساطت سے بالآخر آپؐ سے جوڑتا ہے۔ اس آخری تعلق سے سلسلے کو جواز ملتا ہے۔ یہی استاد اور طالبعلموں کا رشتہ ہے جو فقہ اور عقیدہ دونوں میں صدیوں سے ان کے عالموں کو قانونی حیثیت فراہم کر رہا ہے۔

تصوف کی تاریخ بھی تنازعات سے پاک نہیں ہے۔ اوائل کے صوفیاء میں بحث چلتی رہی کہ آیا روحانی واردات کے ذریعہ خدا کے عرفان کا مطلب ہوگا کہ فقہ اور عقیدہ کے لغوی معنوں کو ماننے اور ان پر چلنا ضروری نہیں ہوگا۔ شاید اس بحث کی معروف ترین مثال دسویں صدی کے الحلاج (متوفی 922ء) کی ہے۔ اس نے کھلے عام کچھ ایسے کلمات کہے جنھیں خدا کی توہین سمجھا گیا۔ اس نے اصرار کیا کہ یہ کلمات روحانی حالت کے باعث ادا ہوئے۔ اس کے باوجود اسے موت کی سزا دے دی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حلاج کی مذمت جنید بغدادیؒ (التوفی بہ 910ء) نے بھی کی۔ حلاج کے اس معاصر صوفی کا نقطہ نظر تھا کہ روحانی معاملات میں زیادہ پختہ اور بردبارانہ رویے کا مظاہرہ ہونا چاہیے تھا۔ گزرتی صدیوں کے ساتھ سنی مسلمانوں نے تصوف سے متعلق جنید کا قدامت پسندانہ انداز تسلیم کر لیا جس میں اسلامی علوم کی تین شاخوں کے مابین زیادہ متوازن تعلق قائم کرنے کا کہا جاتا ہے۔ آج کے تصوف کے زیادہ تر سلسلے رسول اللہؐ تک اپنا تعلق جنیدؒ کے ذریعے جوڑتے ہیں۔

شیعیت

مسلم دنیا کی اکثریت نے فقہ اور حدیث کے متعلق اپنے سرکردہ عالموں کی تشریح اور تعبیر قبول کر لی۔ لیکن ایک بڑی تعداد نے اسے مسترد بھی کیا۔ مرکزی مسلم دھارے سے ان کی علیحدگی اصل میں سیاسی بنیادوں پر تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معاملے کا مذہبی پہلو بھی سامنے آ گیا جس گروہ کا خیال تھا کہ خلافت کا سب سے زیادہ حق حضرت علیؓ کا تھا، اس نے فقہ اور حدیث پر بھی الگ موقف اپنانا شروع کر دیا۔ اس اختلاف کی جڑیں بھی خلافت کے متعلق سیاسی اختلاف میں تھیں۔ اس گروہ نے خود کو شیعان علیؓ یعنی حضرت علیؓ کی جماعت کہنا شروع کر دیا۔ عامتہ الناس انھیں شیعہ کہتے ہیں۔

اہلِ تشیع کہتے ہیں کہ سارا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب آپؐ کی وفات کے دن حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چنا گیا۔ اس اجتماع میں حضرت علیؓ موجود نہیں تھے جس میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد کیا اور خود ان کی بیعت کر لی۔ اگرچہ خود حضرت علیؓ نے بھی بعد ازاں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی لیکن شیعوں کی بعد کی نسلیں اس انتخاب کی قانونی حیثیت پر سوال اٹھانے لگیں۔ ان کے نزدیک رسولؐ کے چچازاد اور داماد کو اس اجتماع میں حضرت علیؓ کو موجود اور خلیفہ منتخب ہونا چاہیے تھا۔ یوں اس عقیدے نے جنم لیا کہ مسلمانوں کی قیادت کے جائز حق دار صرف اہلِ بیت ہیں۔

ان مجوزہ حکمرانوں کو امام کا نام دیا گیا۔ شیعوں نے خلافت کی جگہ امامت کے تصور کو پروان چڑھایا جس کے مطابق حکومت کا حق صرف حضرت علیؓ کی اولاد کے پاس ہے۔ شیعہ حضرت علیؓ کو پہلا امام سمجھتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دوسرے اور تیسرے امام تھے۔

خلافت کی بجائے امامت کو ماننے کے باوجود شیعہ اسلام میں کوئی الگ فرقہ نہیں تھے۔ امامت محض ایک سیاسی تصور تھا اور اموی اور عباسی خلفاء کو بھی تو بالعموم امام کہہ دیا جاتا تھا۔ پہلے خلفاء کے متعلق اہلِ تشیع کے دلائل انھیں ایک سیاسی گروہ تو بناتے تھے لیکن الگ مذہبی فرقے کے طور پر متشکل نہیں کرتے تھے۔ اس سوال کا جواب پہلے خلفاء کے بارے میں ان کے دلائل کے مضمرات تھے۔ انھوں نے مذکورہ خلفاء کے متعلق قرار دیا کہ چونکہ وہ غاصب تھے چنانچہ ان کی روایت کردہ کوئی حدیث معتبر نہیں ہے۔ اس دلیل کے مذہبی مضمرات بہت گہرے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے

حامیوں نے حدیثوں کا ایک بڑا حصہ روایت کیا تھا اور مسلم علماء انھیں مانتے تھے۔ صحیح بخاری میں موجود سینکڑوں احادیث آپ ؐ کی زوجہ حضرت عائشہؓ اور ہمسائے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہیں۔ چونکہ ان دونوں نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی حمایت کی تھی چنانچہ یہ احادیث معتبر نہیں۔ ہزاروں حدیثوں کے انکار سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کے لیے انھوں نے آئمہ کے اقوال کو وہ درجہ دیا جو احادیث سے ذرا سا ہی کم ہے اور بعض صورتوں میں ان کے برابر ہے۔ باقی مسلم دنیا کے نزدیک یہ طرزِ فکر مذہبی توہین کے برابر ہے۔ اہلِ تشیع کے نزدیک اپنی خاص نسبت کے باعث امام مذہب کی تعبیر میں معصوم عن الخطا ہیں اس لیے کہ انھیں خدا کی طرف سے براہِ راست خالص علم ملتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس نظریے کا زیادہ تر حصہ مغربی فلسفے کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔ اسلام کی راسخ العقیدہ تعبیر میں نیم الوہی خصوصیات سے متصف انسان کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اوائل عباسی عہد کے ممتاز فلسفیوں میں سے کچھ کی نوفلاطونیت نے الٰہیاتی تناظر میں امامت کے جواز میں شیعوں کی مدد کی ہو۔

شیعیت کا مرکزی دھارا حضرت محمدؐ کے بعد بارہ اماموں کو ماننے والوں کا ہے، اس لیے انھیں اثناء عشری کہا جاتا ہے۔ ان کے مطابق امامت کا سلسلہ امام محمد المہدی پر ختم ہو گیا۔ 874ء میں جب وہ پانچ برس کے تھے تو غائب ہو گئے۔ اس طرح وہ زمانہ شروع ہوا جسے غیبت اصغر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں امام کے نمائندے ان سے شیعان کے لیے ہدایات حاصل کرتے رہے۔ 941ء میں اعلان کیا گیا کہ امام احتجاب اکبر میں چلے گئے ہیں اور اب ان سے ابلاغ ممکن نہیں رہا۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اب امام آخری زمانے میں ظاہر ہو کر اپنی رہنمائی میں ایک مثالی عہد کا آغاز کریں گے۔ اثناء عشریوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے ظہور تک قرآن، ان کے نزدیک مصدقہ احادیث اور آئمہ کے فرامین سے رہنمائی حاصل کرنا ہو گی۔ اوائل عباسی عہد میں اثناء عشریوں کے ساتھ ساتھ دیگر شیعوں کو بھی ابتلاء سے گزرنا پڑا۔ سیاسی اعتبار سے سات اماموں کو ماننے والے اثناء عشریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ انھوں نے دسویں صدی میں مشرقی عرب اور مصر میں بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ شیعوں میں سے زیدی صرف پانچ اماموں کو مانتے ہیں۔ ان کی تعداد سب سے کم ہے۔ وہ

حضرت حسینؓ کے پوتے حضرت زیدؒ کو آخری امام مانتے ہیں اور اسی لیے زیدی کہلاتے ہیں۔ سات اور بارہ اماموں کے مقابلے میں یہ اسلام کے مرکزی دھارے کے زیادہ نزدیک ہیں۔ ابتدائی خلافت کے بارے میں ان کا رویہ بھی نسبتاً زیادہ معتدل ہے۔

شیعیت کے علمبرداروں کی توقعات کے برعکس ان کے نظریات زیادہ نہیں پھیل سکے۔ تبلیغ میں شدید کاوش اور حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے نام پر جذباتی پکار کے باوجود مسلم دنیا کی اکثریت نے الٰہیاتی اور فقہی معاملات میں مرکزی دھارے سے شیعوں کے انحراف پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ دراصل اسلام کے مرکزی دھارے میں شامل اکثریت انھیں اسلام کے لیے خطرہ خیال کرتی رہی۔ اپنے آغاز سے ہی اسلام کی تحریک خود کو منفرد قرار دیتی آئی ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مثالیں دے کر سمجھا دیا گیا کہ کیسے پچھلی قوموں پر پیغمبر بھیجے گئے تو انھوں نے خدا کے پیغام کو بدلا اور اپنے مفادات کے لیے اس میں ملاوٹ کی۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ حضرت محمدؐ آخری نبی بنا کر بھیجے گئے اور سابقہ آسمانی تعلیمات کے برعکس اسے مسخ نہیں کیا جاسکے گا۔ جب جب یہ داخلی علمی قوت اسلامی تحریک کے تقدس کے لیے خطرہ بنی تو شدید ردعمل سامنے آیا۔ عباسی حکومت نے سیاسی معاملات میں ان پر سختی کی اور مرکزی دھارے کے علماء نے شیعہ نظریے کے رد میں لکھا اور خود کو اہلِ سنت والجماعت (آپؐ کے نقشِ قدم اور امت کے اجماع پر چلنے والے) قرار دیا۔ انھیں مختصراً سنی کہا جانے لگا۔ ان ماہرین الٰہیات میں سے ایک ابوحامد الغزالی تھے؛ وہی غزالی جنھوں نے معتزلیوں کے فلسفیانہ دلائل کا رد لکھا تھا۔ بارھویں صدی میں دلائل کی جنگ ہارنے اور شیعہ حکومتوں کی عسکری محاذ پر شکست کے بعد شیعیت کا زور ٹوٹنے لگا۔ اسے مسلم دنیا میں قابلِ ذکر قوت کے طور پر ابھرنے کے لیے سولھویں صدی کی صفوی سلطنت کے عروج کا انتظار کرنا تھا۔

ساتواں باب

بحران

اسلامی انقلاب کے پہلے تین سو سال کے بعد مسلمان سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ دنیا میں اسلام کی حتمی فتح دور نہیں ہے۔ اس دورانیے میں اسلام بڑی تیزی سے پورے مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ اور فارس (ایران) میں پھیل چکا تھا اور مسلم افواج ہندوستان اور فرانس کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ جب فوجی توسیعات کا سلسلہ رکا تو علمی پھیلاؤ کا سلسلہ شروع ہوا اور کئی علوم کو نئی ان دیکھی حدود تک وسعت دی گئی۔ اقتصادی اعتبار سے بھی مسلمان دنیا میں سرفہرست تھے۔ بغداد سیاسی اور اقتصادی قوت کا مرکز بنا۔ اس کے بینکوں کی شاخیں چین جیسے دور دراز ممالک میں بھی موجود تھیں۔ یقیناً آثار موجود تھے کہ اسلام کو فوجوں، کتابوں اور سکوں کے ذریعہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل جانا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ سال 900ء سے ایسی ابتری اور انتشار کا آغاز ہوا جو سولھویں صدی میں عثمانیہ سلطنت کا عہد زریں آنے تک جاری رہا۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک مسلم دنیا تقریباً مسلسل حملوں کی زد میں رہی۔ شیعہ، یورپی صلیبیوں اور منگول جتھوں نے اسلامی سلطنت کے مرکز پر وہ تباہی ڈھائی کہ تیرھویں صدی کے کچھ لوگ اسے قرب قیامت خیال کرنے لگے۔ اسلامی روایت میں دنیا پر مکمل مسلم غلبہ قرب قیامت میں ہونا تھا لیکن اب اس کی الٹ صورتحال تھی۔

اسماعیلیت

وجود میں آنے کے بعد سے ہی شیعیت نے اپنی بنیاد ایک ایسے تصور پر رکھی تھی جسے مرکزی سنی دھارے کی خلافت کے متبادل وضع کیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم دنیا کی قیادت اماموں کے پاس ہونی چاہیے، جن کا خدا سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ قیادت کسی عام شخص کے پاس نہیں ہوسکتی جو عباسی یا اموی بھی ہوسکتا تھا۔ جب خود شیعہ کئی فرقوں میں بٹ گئے تو امامت لانے کے طریقوں پر کئی طرح کے خیالات سامنے آئے۔ ان کی اکثریت یعنی اثناعشریوں نے جمود کو ترجیح دی۔ ان کا نقطۂ نظر تھا کہ غیب میں چلے جانے والے بارھویں امام کے ظہور تک کوئی جائز مسلم حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ ان کے لیے امام کی آمد تک کا زمانہ صبر سے گزارنے کا ہے۔ وہ امام آخری زمانے میں آکر ایک مثالی تہذیب کی بنیاد رکھے گا۔

ہفت امامیوں کا خیال تھا کہ ایسی خاطر جمعی کسی کام کی نہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ساتویں امام اسمٰعیل وسط آٹھویں صدی میں عباسیوں کی دارو گیر سے بچنے کے لیے پردے میں چلے گئے ہیں۔ اثناعشریوں کے برعکس، جو کہتے تھے کہ آخری امام کے ظہور تک کوئی اور امام نہیں آئے گا، ہفت امامیوں کا عقیدہ تھا کہ اسمٰعیل کے جانشین دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہی پردہ پوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی لیے تو انھیں عرف عام میں اسمٰعیلی کہا جاتا ہے۔ اسمٰعیل کی زندگی، اور حتیٰ کہ اس کے حقیقتاً ہونے یا نہ ہونے، کے حالات تاریخ اور داستانوں کے درمیانی دھندلکے میں کھو گئے ہیں۔ اتنا واضح ہے کہ اس کے غیب میں جانے (یا فوت ہونے) کے بعد مبلغین اسمٰعیلی امامت کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں پھیل گئے۔ عباسیوں نے، جو خود بھی خفیہ معاون سلسلوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے، اسمٰعیلیوں کی صورت سامنے آنے والے خطرے کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ہر ممکن کام کیا۔ نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ اسمٰعیلی تحریک کا اخفا اور بڑھ گیا اور وہ عباسیوں کی دسترس سے اور دور ہو گئے۔ اسمٰعیلی مبلغین اسلامی دنیا کے سارے بڑے شہروں میں پھیل گئے اور اپنے انقلابی خیالات کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کی بجائے ہر اس گروہ سے تعاون مانگنے لگے جو کسی بھی وجہ سے عباسیوں کے خلاف تھا۔ وہ خاص طور پر نچلے طبقات، عرب حکومت سے نالاں غیر عرب آبادیوں اور

مرکزیت سے متنفر بدوی قبائل میں مقبول تھے۔

کئی دہائیوں تک کام کرنے کے بعد سال 900ء کے لگ بھگ اسمٰعیلی سنی اقتدار پر کاری ضرب لگانے کے اہل ہو گئے۔ انھوں نے مشرقی جزیرہ نما عرب کے بدو قبائل کو عباسیوں کے لیے حقیقی خطرہ بنا دیا۔ اسمٰعیلیوں کے اس گروہ کو قرامطی کہا گیا۔ 903ء میں قرامطیوں نے اچانک دمشق پر قبضہ کر لیا اور مقابلے کے لیے بھیجی جانے والی عباسی فوج کو شکست دی۔ 905ء کے بعد سے قرامطیوں نے اسمٰعیلی انقلاب لانے کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی اپنائی۔ علاقوں کی فتح اور ان پر حکومت بنانے کی بجائے انھوں نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے بحرین کو اپنا اڈہ بنایا اور عباسیوں کو دہشت زدہ کرنا شروع کیا۔ 906ء میں انھوں نے حج کی غرض سے مکہ جاتے لوگوں میں سے بیس ہزار کو قتل کیا۔ دسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں قرامطیوں نے بصرہ اور کوفہ قبضا لیے۔ ان بدو چھاپہ ماروں نے بغداد بھی قریب قریب فتح کر لیا تھا۔ 928ء میں قرامطیوں کی غارتگری اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب انھوں نے مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی آبادی کو قتل کیا، حجرِ اسود کو کعبہ سے اکھاڑ کر بحرین لے جایا گیا۔ یہ پتھر 952ء تک وہیں رہا۔

قرامطی مذہبی اعتبار سے بڑے انتہا پسند تھے۔ انھوں نے زندگی کے متعلق اپنے اندازِ فکر میں کئی طرح مجنونانہ الہامی خیالات اور قبل از اسلام کے مذہبی عقائد شامل کر لیے۔ اس زمانے میں بحرین جانے والوں نے بتایا کہ وہاں کوئی مسجد نظر آئی اور نہ کوئی نمازی۔ انھوں نے مکہ کو مقدس شہر ماننے سے انکار کر دیا اور حج کو بھی غیر اسلامی قرار دیا۔ چنانچہ وہ حاجیوں اور مکہ پر حملے کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ روایتی مسلمان قرامطیوں کو غیر مسلم سمجھتے تھے۔ کیسے بھی نرم الفاظ استعمال کیے جائیں اتنا تو طے ہے کہ قرامطی اپنے عقائد میں مرکزی دھارے کے مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ دہشت گردی برپا کرنے کے باوجود قرامطی ہیئت مقتدرہ کے لیے حقیقی خطرہ نہیں بن پائے۔ ان کے طریقِ اتنے انتہا پسندانہ تھے کہ مسلم دنیا قبول نہیں کر سکتی تھی اور ان کے عقائد بھی بنیادی سے کچھ بہت زیادہ مختلف تھے۔ ان کی بجائے سنی اسلام کے لیے حقیقی خطرہ مغرب سے اٹھا۔ یہاں بربروں کی مدد سے ایک اور اسمٰعیلی تحریک ابھری اور علاقائی قوت بن گئی۔

فاطمی سلطنت

اسمٰعیلی مبلغین کو شمالی افریقہ میں مقابلتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ انھوں نے یہاں صحارا کے بربروں اور ساحلی شہروں کے عربوں کے مابین چلی آنے والی روایتی چپقلش کو استعمال کیا۔ ان مبلغین نے نویں صدی کے آخر میں منہاجی بربروں میں اثر ورسوخ قائم کیا اور ان کی مدد سے شمالی افریقہ کی سنی اسلامی ریاستوں کو ختم کر دیا۔ الرستمی اور الاغلابہ (Aghlabids) ریاستیں 908ء تک ختم ہو چکی تھیں۔ 909ء میں اس اسمٰعیلی گروہ نے اسمٰعیل کی نسل میں سے امام کے ظہور کا دعویٰ کر دیا۔ اس کا اصل عبیداللہ تھا لیکن اس نے المہدی کا لقب اختیار کیا یعنی ہدایت یافتہ یا نجات دہندہ۔ عبیداللہ کی اصل کا یقینی علم نہیں۔ اس نے اسمٰعیل، اور ظاہر ہے، حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنی قائم کردہ سلطنت کا نام بھی فاطمی رکھا۔

قرامطیوں کی طرح فاطمیوں نے بھی سنی دنیا کے پہلو میں ایک کانٹا بنے رہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ساری اسلامی دنیا پر تسلط جما کر اس پر اسمٰعیل کے واسطے سے اسمٰعیلیت قائم کرنا ان کا فرض ہے۔ 909ء میں اس کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا جو در اصل اسلامی دنیا پر عباسی اقتدار کو چیلنج تھا۔ اگر چہ عباسیوں کی مخالفت کا اعلان کرنے والوں میں سے فاطمی سر فہرست نہیں تھے لیکن جلد ہی وہ خطرناک ترین بن گئے۔ انھوں نے اپنا ٹھکانہ آج کے تیونس میں بنایا اور سسلی فتح کرنے کے بعد مشرق کی طرف مصر تک آ گئے۔ دسویں صدی کی تیسری دہائی تک وہ شمالی افریقہ پر حاوی ہو گئے۔ 934ء میں عبیداللہ کی وفات کے بعد ان کی فوجی توسیع کا سلسلہ قدرے سست پڑ گیا۔ ان کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں نے ان کے عقائد اور سنی دنیا کے متعلق خیالات کے خلاف کئی بار بغاوت کی۔ لیکن سنی باہم متحد نہ تھے۔ یہ اتنی بڑی خرابی تھی کہ وہ پھیلتی فاطمی سلطنت کی راہ نہ روک سکے۔

929ء میں آئبیریا کے اموی حکمران نے شمالی افریقہ کے فاطمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قرطبہ میں ایک نئی خلافت کا اعلان کیا۔ اس طرح دسویں صدی میں عباسی، فاطمی اور اموی کے نام سے تین خلافتیں موجود تھیں۔

دسویں صدی کے وسط میں عباسی خلیفہ عملاً بے اختیار ہو گیا۔ نویں اور دسویں صدیوں میں سیاسی عدم مرکزیت اور ترک علاقوں سے آنے والی غلاموں کی موروثی حکومتوں جیسے اثرات نے خلیفہ کو بے اختیار کر دیا۔ 945ء میں ایرانی سلطنت نے عراق فتح کیا اور خلیفہ کے نام پر حکومت کرنے لگے۔ مصر، جو کبھی خلافت کا اقتصادی اور زرعی مرکز تھا، ایک آزاد ترک سلطنت بن گیا۔ اسے اخشیدی سلطنت کہا جاتا ہے۔ یہ شمالی شام میں قائم عرب ریاست کے ساتھ مسلسل حالت جنگ میں رہی۔ صورتحال کی سنگینی محض یہ کہہ دینے سے بیان نہیں ہوتی کہ مصر اور ایران کے درمیان مسلم دنیا غیر متحد تھی۔ مسلمانوں کے مابین مستقل جنگ وجدل اور شمال سے نئے ابھرتے بازنطینی خطرے کے باعث فاطمیوں کو 969ء میں مصر پر حملے کا موقع مل گیا۔ اخشیدیوں کا لشکر 100,000 کا تھا۔ مصریوں کو فوراً شکست ہوگئی۔ بڑھتی فاطمی فوجوں کے سامنے سنی حکومت ڈھیر ہوگئی۔ فاتح فاطمی فوجوں نے نیل کے کنارے اپنے لیے ایک نیا دارالحکومت القاہرہ کے نام سے بنایا۔ انھیں اب کسی قسم کی صحرائی پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ مسلم دنیا کی طاقتور ترین ریاست بن گئے تھے۔ شام، ایران اور عراق میں جاری بدامنی کو دیکھ کر لگتا تھا فاطمی بڑھتے ہوئے بغداد پر قابض ہوں گے، خلافت ختم کر دیں گے اور ساری اسلامی دنیا کے حکمران بن جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ فاطمیوں کو جلد ہی بازنطینیوں کی طرف سے شام کو لاحق خطرے سے نمٹنا پڑا۔ ستم ظریفی یہ کہ انھیں بحرین کے قرامطیوں کا حملہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ قرامطی ان کے ہم مسلک تھے لیکن انھیں اتنا راسخ العقیدہ نہیں مانتے تھے جتنا ان کے خیال میں ہونا چاہیے تھا۔

اس طرح بغداد فاطمیوں کا مفتوح ہونے سے بچ گیا۔ سنی دنیا کو سنبھلنے اور گیارھویں صدی میں سلجوقی ترکوں کی مدد سے مضبوط سیاسی اور فوجی ادارے بنانے کا موقع مل گیا۔ فاطمیوں کو شمالی افریقہ، مصر، مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں اور شام و فلسطین کے کچھ حصوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ تاہم ان کا انقلابی جذبہ برقرار رہا کہ وہ اپنے زیرِ نگیں علاقوں کو خالصتاً اسمٰعیلی شیعہ سرزمین بنا دیں۔ 970ء میں قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس کا مقصد غالب سنی آبادی کے ملک مصر میں شیعیت کی تبلیغ تھا۔ فاطمیوں نے مختلف خلفاء کے ادوار میں اپنی آبادی سے کبھی نرمی اور کبھی سختی کا سلوک کیا۔ کبھی

سنی، عیسائی اور یہود پر شدید سختیاں کی جاتیں اور نسبتاً آزادی دے دی جاتی۔ عامتہ الناس کو اسمٰعیلیت کی طرف کرنے کی کوشش خلیفہ الحاکم کے دورِ حکومت میں اپنے عروج پر تھی۔ پاگل خلیفہ کہلانے والے الحاکم کا عہد 996ء سے 1021ء تک کا ہے۔ دیگر فاطمی حکمرانوں کی طرح اسے بھی منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا اور اسمٰعیلی اسے مقدس مانتے تھے۔ ان کے علاوہ ہر کوئی اسے اپنی من مرضی کی کرنے والا جابر اور ظالم سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں موجود تمام عیسائی اور یہودی عبادت گاہیں گرا دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ ان چرچوں میں یروشلم کا وہ چرچ بھی شامل تھا جس میں، عیسائی عقائد کے مطابق، حضرت عیسٰیؑ کو دفنایا اور دوبارہ زندہ کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے چرچ کے حوالے سے جو یقین دہانی کروائی تھی، اسے بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ 1009ء وہ چرچ پوری طرح گرا دیا گیا۔ الحاکم نے فقط عیسائیوں پر جبر نہیں کیا، اس کے ہاتھوں مسلمان بھی محفوظ نہ تھے۔ مسلمانوں کو سنی اسلام کے مطابق باجماعت نماز سے روک دیا گیا۔ جمعہ کے خطبات میں فاطمی خلیفہ کا نام شامل کرنے اور اسے اسمٰعیلی رنگ دینے کے لیے کام کیا گیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی یروشلم کے مقدس شہر میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ الحاکم کے غیر معقول اور جبریہ احکام فقط مذہب تک محدود نہ تھے۔ اس کے ایسے ہی ایک حکم پر شاہی محل کے قریبی گاؤں کے بھی کتے ہلاک کر دیے گئے۔ اس لیے کہ ان کا بھونکنا خلیفہ کو ناگوار گزرتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ سارے کام کاج رات کے دوران کیے جائیں۔ اس نے شطرنج کی ممانعت کروادی اور غالباً اس لیے کہ وہ اس کا اچھا کھلاڑی نہ تھا۔ اس طرح مصری خوراک کا ایک اہم جزو ملوخیہ (mulukhiya) بھی منع قرار پایا۔ جب عظیم مسلمان طبیعات دان نیل پر بند نہ باندھ سکا تو الحاکم نے اسے گھر میں نظر بند کر دیا۔ 1021ء کی ایک رات وہ اکیلا صحرا میں نکلا اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا تو اس کی رعایا میں سے بہت سوں نے سکھ کا سانس لیا۔

الحاکم کا دورِ حکومت جبر اور ظلم میں بہت منفرد تھا۔ فاطمیوں کے زیرِ حکومت معاشرے کے متعلق عمومی حکم لگانا بہت مشکل ہے کہ آیا وہ جابر تھے یا متحمل اور بردبار۔ طرزِ حکومت، معاشرت اور غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے فاطمیوں کے پاس کوئی طے شدہ رہنما اصول نہیں تھے۔ عباسی اور دیگر سنی سلطنتوں کے برعکس جو (کم از کم حکومتی دعوؤں کی حد تک) اسلامی قوانین کے پابند تھے، فاطمی خلفاء

نیم الوہی شخصیات تھیں اور شخصی حکومتی انداز اختیار کرنے میں آزاد تھے۔ اس لیے ہر نیا خلیفہ سلطنت کی سمت اور کردار میں انقلابی تبدیلی کر سکتا تھا۔ اس کے نتائج بعض صورتوں میں بڑے تباہ کن ہوتے تھے۔ مضبوط قانونی اور علمی بنیاد نہ ہونے کے باعث فاطمی حکمران اور ان کا عقیدہ دونوں میں ان کے عوام کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مصر، شام اور شمالی افریقہ کٹڑ سنی ہی رہے جبکہ اسمٰعیلیت فقط حکومتی اشرافیہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لوگوں کی حمایت نہ ہونے اور ہر نئے حاکم کے ساتھ بدلتی حکمتِ عملی کے باعث گیارھویں اور بارھویں صدی میں فاطمی سلطنت سست رفتار زوال کا شکار ہوتی گئی۔ بالآخر انھیں مسلم دنیا کے لیے تباہی کا باعث بننے والی صلیبی جنگوں کے دوران صلاح الدین ایوبی نے ختم کر دیا۔

صلیبی جنگیں

مغربی اور اسلامی تاریخ دونوں میں شائد کوئی اور تنازعہ صلیبی جنگوں سے زیادہ جذبات انگیز نہیں۔ اس سارے تنازعے کا محور شہر یروشلم تھا جسے یہودی عیسائی اور مسلمان سب مقدس مانتے تھے۔ عیسائیوں کے لیے یہ وہ شہر تھا جہاں مسیح نے تبلیغ کی، مصلوب ہوے اور دوبارہ حیات پائی۔ مسلمانوں کے لیے اس کی وجہِ تقدیس یہ عقیدہ تھا کہ حضرت محمدؐ راتوں رات معجزانہ مکہ سے یروشلم آئے اور پھر خدا سے کلام کے لیے آسمانوں پر گئے۔ صلیبی جنگوں کے دوران بادشاہوں، سلطانوں، جنرلوں، پادریوں اور اماموں نے ہزاروں باران واقعات سے طرفین کو گرمایا کہ وہ مقدس شہر پر اپنے دعوؤں کو برحق خیال کریں۔ 1095ء میں شروع ہونے والی یہ جنگیں دو سو سال تک جاری رہیں۔ انھوں نے مسیحی یورپ کو بنیادی طور پر اور مسلم دنیا کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

صلیبی جنگوں کے محرکات کا آغاز یروشلم سے بہت دور وسط ایشیا میں ہوا۔ یہاں ترک قبائل ہزاروں سال سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہ چراگاہی خانہ بدوش تھے۔ میدانِ جنگ میں ان کی جفاکشی سے دشمن خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ عباسیوں نے نویں صدی ہی سے ترکوں کی جنگی مہارت سے استفادے کے لیے انھیں بطور جنرل اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ترک قبائل گروہ در گروہ ترکستان سے نکل کر اسلامی دنیا میں داخل ہونے لگے۔ ترکِ وطن کرنے والے ترکوں نے

اسلام قبول کرنا شروع کیا اور وہ دسویں صدی کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر انھیں ریاستیں قائم کرنے لگے۔ ان میں سے عظیم ترین سلجوق ریاست تھی جو 1037ء میں قائم ہوئی اور شام سے وسط ایشیا تک پھیل گئی۔ عباسیوں کی شان وشوکت محض ایک بھولی بسری داستان رہ گئی تھی اور وہ عملاً بغداد میں اپنے محلات تک محدود تھے۔ سلجوقوں نے اپنی ریاست کا جواز خلفاء کی حفاظت قرار دیا تھا۔ سخت سنی ہونے کی وجہ سے سلجوقوں نے طاقت کے توازن میں سنیوں کو فاطمیوں کے برابر کیا اور گیارھویں صدی میں فاطمیوں کی توسیع پسندی کا تدارک کیا۔

سلجوقوں نے گیارھویں صدی کے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور اس میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی۔

1071ء میں سلجوقوں نے مشرقی اناطولیہ میں بازنطینیوں کے خلاف ایک اہم جنگ جیت لی۔ مانزکرٹ (Manzikert) کی جنگ نے بازنطینیوں کی اناطولیہ پر گرفت ختم کر دی۔ اس جنگ کے بعد آنے والے سالوں میں سلجوق پورے جزیرہ نما میں مغرب کی طرف بڑھنے لگے حتیٰ کہ وہ قسطنطنیہ کے مقابل واقع ساحل تک آ گئے۔ لگتا تھا کہ اب وہ ترک مسلم سلطنت کو اس شہر تک بلکہ اس سے بھی پرے تک پھیلائیں گے۔ 1095ء میں بازنطینی شہنشاہ الیکسیوز (Alexios) نے محسوس کر لیا کہ اکیلے بازنطینی ترکوں سے نہیں لڑ سکتے۔ عیسائیت کے مشرقی اور مغربی نصف حصے صدیوں سے حریف چلے آ رہے تھے لیکن الیکسیوز کو یقین ہو گیا تھا کہ صرف عیسائیوں کا اتحاد ہی ترکوں کو شکست دے سکتا ہے۔ اس نے فوری مدد کی درخواست پوپ اربن دوم (Pope Urban II) کے پاس روم بھیجی۔ اسے شاید کسی فوری فوجی مدد کی توقع تھی جس سے وہ بازی الٹا دے اور مانزکرٹ سے اب تک کا کھویا علاقہ دوبارہ قبضہ لے۔ اربن نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسیح کے نام پر پورے یورپ سے مسیحی فوج اکٹھی کر لی جس کی تعداد دسیوں ہزار تھی۔ لیکن اس کا ارادہ الیکسیوز کی مدد کا یا ترکوں سے لڑنے کا بھی نہیں تھا۔ اربن کی صلیبی جنگ کا ہدف یروشلم تھا۔ اس نے حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے سے یروشلم پر مسلم قبضے کا

واویلا کرتے ہوئے تمام عیسائیوں کو للکارا کہ اس شہر کو فتح کرنے اور فلسطین میں پوپ کے زیرِ سایہ لاطینی عیسائی حکومت قائم کرنے کے لیے فوجی معاونت کریں۔

اربن کی اس فوج نے جمع ہونے میں بڑا وقت لیا۔ کہیں 97-1096ء میں شرفا اور سورماؤں کی قیادت میں فوج نے آج کے جرمنی، فرانس اور اٹلی سے مشرقی یورپ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ چرچ کے برانگیختہ کردہ مذہبی جنون میں اس فوج نے یورپی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ پہلا صلیبی جتھا ایسا خوفناک تھا کہ جب قسطنطنیہ کی فصیل تک پہنچا تو الیکسیوز نے شہر میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ مبادا اسے بھی اپنی راہ میں آنے والے دیگر شہروں اور قصبوں کی طرح لوٹ نہ لے۔ 3000 کی اس فوج نے باسفورس عبور کیا اور اناطولیہ میں سے یوں لانگ مارچ کرتے گزرے کہ نئی قائم ہونے والی ترک حکومت مزاحمت نہ کر سکی۔ 1097ء کے آخر میں صلیبی انطاکیہ (Antioch) پہنچ گئے۔ آج کے ترکی اور شام کی سرحد پر واقع یہ ایک بڑا شہر تھا اور اس کا دفاع بڑا مضبوط تھا۔ اسے صلیبیوں کی پہلی آزمائش ثابت ہونا تھا۔ اگر عیسائی یہاں کامیاب ہو جاتے تو یروشلم تک چلتے چلے جانے کی توقع کر سکتے تھے۔ اگر وہ ناکام ہو جاتے تو مسلم دنیا کے اندر گھس کر یروشلم فتح کرنے کے لیے فوج بھرتی کرنا مشکل ہو جاتا۔

انطاکیہ کے محاصرے سے گیارھویں صدی کے مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی صورتحال کے متعلق بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ شہر کا دفاع ناقابلِ یقین حد تک مضبوط تھا اور یہ صلیبیوں کے لیے بڑا چیلنج ثابت ہوا۔ لیکن سیاسی اعتبار سے شہر ایک جزیرہ تھا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے تک عظیم سلجوق سلطنت ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اب یہ متحدہ سیاسی وحدت نہیں رہی تھی۔ معمولی معمولی ترک امیروں نے شہر قبضا رکھے تھے اور باہم مستقل لڑتے رہتے تھے۔ دمشق، حلب، انطاکیہ اور موصل جیسے بڑے شامی شہر غیر متحد تھے اور گیارھویں صدی کی آخری دہائی میں باہم مسلسل لڑتے رہے تھے۔ جب انطاکیہ کے حاکم یاغی سیان (Yaghi Siyan) نے شہر کا محاصرہ کیے ہوئے صلیبیوں کے خلاف اپنے ترک بھائیوں سے مدد مانگی تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ ان کی افواج غالباً اپنے حریف پر حملے سے خوش ہوں گی۔ اسے شکست ہونے کی صورت میں ان کے اثر و رسوخ کو بڑھنا تھا۔ شہر کی دفاعی دیواروں کے ایک حصے کا ذمہ ایک

زرہ ساز تھا۔ اس نے امیر کے ساتھ اپنے ایک تنازعے کے کینے میں صلیبیوں کو شہر میں داخل کروادیا۔

صلیبیوں نے قابض ہوتے ہی شہری آبادی کو تہ تیغ کر دیا۔ انطاکیہ اور یروشلم کی راہ میں پڑنے والے دیگر شہروں کی تباہی اور آدم خوری کے کم از کم ایک واقعہ نے اردگرد کے علاقوں میں دہشت طاری کر دی۔ مسلم امیر عیسائیوں کے ساتھ لڑائی سے کترانے لگے۔ جب انھیں محسوس ہوا کہ ان کی اصل منزل یروشلم ہے تو وہ لڑنے کی بجائے انھیں محفوظ رستہ دینے اور رسد فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ 1099ء کے گرما تک عیسائی بالآخر یروشلم کی دیواروں تک جا پہنچے۔

یروشلم کے پاس اپنے دفاع کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہ کئی سالوں سے فاطمیوں اور سلجوقوں کے درمیان میدانِ کارزار بنا رہا تھا اور برے حالوں میں تھا۔ علاوہ ازیں فاطمیوں نے یروشلم کو درپیش خطرے کا ادراک دیر سے کیا تھا۔ شہر میں سوائے چھاؤنی کی برائے نام فوج کے اور کچھ نہ تھا۔ ہزاروں مسیحیوں کے سامنے اس انتظام کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ فاطمیوں نے مصر میں یروشلم کے لیے ایک فوج تیار کی لیکن جب تک وہ فلسطین پہنچی بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک ہفتہ کے محاصرے کے بعد 15 جولائی 1099ء کو صلیبیوں نے شہر مسلمانوں سے چھین لیا۔ حضرت عمرؓ کے 462 سال بعد شہر دوبارہ عیسائی قبضے میں چلا گیا۔

مسجد اقصیٰ اور اس کے صحن میں خون گھوڑ سواروں کے گھٹنوں اور لگاموں تک آرہا تھا۔

(1099ء میں فتح یروشلم کے حوالے سے ایک صلیبی Raymond D'Aguilers کا بیان)

اسلامی دنیا کے لیے یروشلم کا مفتوح ہونا تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کی ستر ہزار کی ساری آبادی قتل کر دی گئی۔ مسجد اقصیٰ میں، جہاں مسلم عقیدے کے مطابق پیغمبرؐ نے تمام سابقہ پیغمبروں کی امامت کروائی تھی، فاتحین کی پنڈلیاں مسلمانوں کے خون میں ڈوب گئیں۔ ان کے ظلم وستم سے عیسائی بھی محفوظ نہ رہے۔ اس شہر میں یونانی، جارجین اور آرمینی چرچ کو مانا جاتا تھا۔ صلیبیوں نے ان پر کیتھولک چرچ مسلط کر دیا۔ اسلام کے تیسرے مقدس مقام پر عیسائیوں کا قبضہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے بڑا صدمہ

تھا۔ قاہرہ اور بغداد میں غم و غصے کا اظہار کیا گیا اور انتقام کی باتیں بھی ہوئیں لیکن صلیبی ظلم و ستم کے خلاف متوقع متحدہ مسلم محاذ سامنے نہ آیا۔ فاطمیوں کو فلسطین سے باہر شکست ہوئی اور انھوں نے یروشلم آزاد کروانے کے لیے دوبارہ کوئی خاص کوشش نہ کی۔ درباری پیچیدگیوں اور نااہل قیادت کے باعث فاطمی صلیبیوں کے ساتھ نمٹ نہ سکے۔ عباسی خلیفہ بے بس تھا اور شام، عراق اور ایران کے ترک امیر باہم دست و گریباں تھے۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے فلسطینی ساحل اور شام کے ساتھ اپنی جمعیت کو بہتر بنالیا۔ یروشلم پر یلغار میں مدد دینے والے شہروں کے علاوہ مسیحیوں نے دیگر شہر بھی فتح کر لیے اور چند سال کے اندر بحیرہ روم کے خطے میں چار مسیحی ریاستیں قائم ہوگئیں۔

بارھویں صدی کے شروع کا مشرقِ میں اسلام آنے کے بعد پہلی بار مشرقِ وسطیٰ میں مشرق و مغرب کا ملاپ ہوا۔ اس خطے کے فاتح فرانک نائٹوں (Frankish knights) نے اسی طرز کا جاگیردار معاشرہ قائم کرنا شروع کر دیا جو ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں موجود تھا۔ ان لوگوں نے شہروں کی آبادی ختم کر دی لیکن اردگرد دیہات اسی طرح رہنے دیے اور انھیں اپنی جاگیروں میں شامل کر لیا۔ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں آبادی کی تقسیم بدلنے کی کوشش نہ کی۔ یورپ سے کاشتکاروں کی کوئی بڑی تعداد ہجرت کر کے ارض مقدس نہیں آئی۔ اس کی بجائے کوشش کی گئی کہ پہلے سے موجود عرب آبادیوں پر مشتمل یورپی طرز کی جاگیرداری قائم کی جائے۔ اس انتظام کی بدولت مسلم علوم کو یورپ کی راہ ملی۔ زیادہ روشن خیال صلیبی مشرقی بحیرہ روم کے علوم اور فلسفہ واپس یورپ لے کر گئے۔

اقتصادی اعتبار سے بھی ان نائٹوں نے مشرق اور مغرب کے درمیان نئے تعلقات کا آغاز کیا۔ ازمنہ وسطیٰ کی یورپی اقوام میں سے اطالوی شہری ریاستیں بحری کاروباری مہم جوئی میں نمایاں تھیں۔ گیارھویں صدی کی آخری دہائی میں صلیبی شام تک پہنچے تو اطالوی تجارتی جہاز سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ صلیبی ریاستیں بننے اور مستحکم ہونے کی دیر تھی کہ وینس اور جینوا سے ناقابلِ رسائی چیز کی تجارت عام سی بات ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں جزیرہ نما اٹلی پر دولت کی بارش ہونے لگی۔ اطالوی شہری ریاستوں کے تاجر خاندان امیر تر ہو گئے۔ اس دولت اور مسلم علمی کارناموں کے ترجموں نے چودھویں صدی سے شروع ہونے والے نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ اسی طاقت اور دولت

کے بل بوتے پرشہری ریاستوں نے پندرھویں اور سولھویں صدیوں کے آتے آتے خودکوسلطنت عثمانیہ کے طاقتور حریف بنادیا۔

یروشلم پر 1099ء میں ہونے والے قبضے کے بعد کئی دہائیوں تک صلیبیوں کے خلاف کوئی قابلِ ذکر فوجی یا سیاسی پیش رفت نہ ہوئی۔ مسلم دنیا اتنی کمزور اور شکستہ تھی کہ کوئی قابلِ ذکر مزاحمت نہیں کرسکتی تھی۔ بالآخر صلیبیوں کو وسط بارھویں صدی میں چیلنج کا سامنا کرنا ہوا بھی تو یہ بغداد، دمشق یا قاہرہ کے روایتی حکومتی مراکز سے نہیں بلکہ یہ چیلنج عمادالدین زنگی کی شکل میں سامنے آیا جو شمالی عراق میں شہر موصل کا حاکم تھا۔ مستقل مزاج اور قدرے درشت مزاج یہ حکمران موصل اور حلب کو ایک ریاست بنانے میں کامیاب رہا۔ اس خطے کے سب سے بڑے شہروں میں سے دو کی متحدہ افواج کی مدد سے زنگی نے 1144ء میں شمالی سرے کی صلیبی ریاست ایڈیسا کو فتح کرلیا۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت ایڈیسا (Edessa) کی فتح کچھ زیادہ اہم نہ تھی۔ یہ تب تک کی کمزور ترین صلیبی ریاست تھی اور اس کی فتح نے باقی تین ریاستوں پر کچھ زیادہ اثر نہ ڈالا۔ لیکن بعد کے سالوں نے ثابت کردیا کہ 1144ء ہی وہ فیصلہ کن موڑ تھا جب وقت کا دھارا صلیبیوں کے خلاف اور مسلمانوں کے حق میں پلٹنے لگا۔

زنگی کو امید تھی کہ وہ دمشق پر اپنی گرفت کرنے کے بعد متحدہ شام کو صلیبی خطرے کے بالمقابل لاکھڑا کرے گا۔ لیکن یہ سابقہ دارالحکومت اس کے قابو نہ آسکا۔ ترک امیروں کے مابین چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہونے والی لڑائیاں ابھی جاری تھیں اور دمشق کا امیر اپنا علاقہ اسلامی اتحاد کے نام پر بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ 1146ء میں عمادالدین زنگی کا انتقال ہوا تو مشرقِ وسطیٰ کو متحد کرنے کا کام اس کے بیٹے نورالدین زنگی نے سنبھال لیا۔ اس نے 1149ء میں انطاکیہ کے اردگرد کا زیادہ تر علاقہ فتح کر لیا۔ دمشق کی رعایا اپنے امیر سے نالاں تھی کہ وہ صلیبیوں کا اتحادی بنا ہوا تھا۔ اس آبادی کی حمایت نے 1154ء میں دمشق پر زنگی کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔ شام زنگی کی زیرِ قیادت متحد ہوا تو یروشلم اور بقیہ مقبوضہ علاقوں کی آزادی کے امکانات نظر آنے لگے لیکن واقعات کے ایک عجیب اور غیر متوقع سلسلے نے نورالدین کو مصر اور روبہ زوال فاطمی سلطنت کی طرف متوجہ کردیا۔

عظیم سلجوق سلطنت کے بعد پہلی بار زنگی نے اسے متحد اور اتنا مضبوط کردیا تھا۔ اب اگر صلیبیوں

کو اپنی سلطنت پھیلانا تھی تو وہ جنوب کا رخ ہی کر سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان کا حملہ مصر کی قدیم اور زرخیز سرزمین پر متوقع تھا۔ 1163ء میں یروشلم کے بادشاہ نے خراج کی ادائیگی سے انکار کو جواز بنایا اور فوج لے کر مصر کی طرف بڑھا۔ فاطمی وزیراعظم شاور (Shawar) نے، جسے اس کی مخالف درباری قوت نے مذکورہ حملے سے عین پہلے برطرف کروا دیا تھا، نورالدین زنگی سے فوجی مدد مانگی۔ اسے اندیشہ تھا کہ صلیبی مصر پر قابض ہو جائیں گے۔ اس مہم جوئی کے متعلق اپنے شکوک وشبہات کے باوجود 1164ء میں زنگی نے مسلم اتحاد کے نام پر صلیبیوں سے جنگ اور شاور کی بحالی کے لیے اپنی فوج بھجوادی۔ صلیبیوں کو شکست دینے کے بعد شاور کو دوبارہ وزیراعظم بنا دیا گیا۔ لگتا تھا کہ شیعہ مصر اور سنی شام کا اتحاد جلد ہی یروشلم کی بادشاہت کو اپنے درمیان پیس ڈالے گا۔ لیکن شاور جیسے ہی وزارتِ عظمیٰ پر بحال ہوا اس نے حلیف بدل لیے۔ اس نے زنگی کو مصر سے بے دخل کرنے کی کوشش میں انھی صلیبیوں کے ساتھ اتحاد کے معاہدے پر دستخط کر دیے جنھوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ زنگی کی فوج مجبوراً شام کی طرف پسپا ہوگئی اور مصر فاطمی اور صلیبی متحدہ فوج کے قبضے میں رہ گیا۔ چار سال کے بعد صلیبیوں نے دوبارہ مصر پر حملہ کر دیا تاکہ اس پر قبضہ کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ سنی شیعہ اتحاد کے نام پر ایک بار پھر نورالدین زنگی کو آواز دی گئی کہ وہ مصر کو بچائے۔ زنگی کی فوج ایک بار پھر نیل کے کنارے کنارے چلتی ہوئی پہنچی۔ لیکن اس بار فوج نے شاور سے فریب نہیں کھایا۔ اس فوج نے پہلے صلیبیوں کو شکست دی اور شاور کو بار بار کی غداری پر موت کی سزا دی گئی۔ فاطمی سلطنت ختم نہ کی گئی لیکن اسے زنگیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ شاور کی جگہ زنگی کے اعلیٰ ترین جنرل شیرکو (Shirkuh) کو وزیر بنایا گیا۔ تاہم شیرکو صرف دو ماہ بعد آنتوں کی بیماری سے مر گیا اور مصر کو اس کے بھتیجے یوسف کے ماتحت کر دیا گیا۔ یوسف کو تاریخ صلاح الدین ایوبی کے نام سے جانتی ہے۔

یروشلم کی آزادی

لگتا ہے کہ صلاح الدین کو جنگ وجدل اور سیاست میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دمشق میں پلا بڑھا اور اس نے اپنے عہد کے عظیم علماء سے تعلیم حاصل کی۔ وہ سخت گیر سنی تھا۔ وہ فقہ میں شافعی اور

الٰہیات میں اشعری خیالات سے متاثر تھا۔ لگتا ہے کہ اسے حکومت سے زیادہ علمی مشاغل اور مذہبی مطالعات سے لگاؤ تھا۔ لیکن وہ چچا کے اصرار پر فوجی مہم پر اس کے ساتھ آیا اور نوعمر صلاح الدین کا مقدر ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔ 1169ء میں وہ اپنے چچا کی جگہ مصر کا وزیر بنا تو اس کے مذہبی رجحانات اس کی حکمتِ عملیوں میں جھلکنے لگے۔ فاطمیوں کی خلاف شرع حکومت جو صدیوں سے سنی اسلام کے پہلو میں کانٹا بنی ہوئی تھی، اس کے حکم پر ختم کردی گئی۔ الازہر یونیورسٹی، جو شیعہ پروپیگنڈے کا مرکز چلی آرہی تھی، روایتی سنی مدرسہ بنادی گئی۔ اس کی یہ حیثیت آج بھی قائم ہے۔ مصر کے عام لوگوں نے، جنھوں نے کبھی شیعیت پوری طرح قبول نہ کی تھی، صلاح الدین کی اصلاحات اور شام کے ساتھ قریبی تعلقات کو خوش آمدید کہا۔

لیکن ایک شخص جو مصر میں اس کی بڑھتی طاقت اور اثر ورسوخ سے خوش نہ تھا وہ اس کا سابقہ رسمی آقا نورالدین زنگی تھا۔ نورالدین مصر کے اپنے اس گورنر کے پھیلتے اثر ورسوخ سے خوفزدہ تھا اور دونوں کے درمیان شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ مصر اور شام کے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ دونوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ تاہم دونوں میں لڑائی نہ ہوئی۔ زنگی بیمار رہ کر 1174ء میں مر گیا۔ صلاح الدین بغیر کسی مزاحمت کا سامنا کیے شام میں داخل ہوا۔ عامۃ الناس نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اب وہ خودمختار حکمران تھا۔ فاطمی بغاوت کے بعد پہلی بار مصر اور شام اس کی زیرِ قیادت متحد ہوے۔ یروشلم کی صلیبی بادشاہت اب ایک متحدہ مسلم سلطنت کے حصار میں تھی جس کا بادشاہ یروشلم کو آزاد کروانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتا تھا۔ اس کا مسئلہ یوں بھی گمبھیر ہوگیا تھا کہ صلیبیوں کے مابین اتفاق کی صورتحال بدترین تھی۔ نائٹ ٹمپلر (Knights Templar) اور نائٹ ہاسپٹلر (Knights Hospitaller) جیسی تنظیمیں باقاعدگی سے یروشلم بادشاہت کی خودمختاری میں مداخلت کررہی تھیں۔ بارھویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائیوں میں مسلم باہم متحد تھے اور صلیبی باہم جھگڑ رہے تھے۔ صورتحال گیارھویں صدی کے آخری سالوں کے بالکل الٹ تھی۔

لیکن صلاح الدین کو جنگ کی جلدی نہ تھی۔ اس نے یروشلم بادشاہت کے ساتھ امن معاہدہ کیا اور اپنی سلطنت کو اندرونی اور بیرونی خطروں سے محفوظ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کا سب

سے بڑا مسئلہ حشیشین (Hashashin) تھے۔ انگریزی زبان کا لفظ assassins اس فرقے کا بگڑا ہوا نام ہے۔ یہ انتہا پسند اسمٰعیلیوں کا ایک خفیہ گروہ تھا اور سمجھتا تھا کہ فاطمی شیعہ انقلاب کے داعی اپنے وعدے میں ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے سنی مسلم دنیا کو گھٹنوں کے بل جھکانے کے لیے سیاسی قتل اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کیا۔ صلاح الدین ان کے مکمل صفائے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ ان کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے الجھا رہا اور اس پر کم از کم دو قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ بارھویں صدی کی اسّی کی دہائی کے وسط میں صلاح الدین کو مجبوراً یروشلم کی طرف توجہ دینا پڑی۔ ایک جنگجو نائٹ Reynald de Chatillon کی معاندانہ سرگرمیوں نے اسے کئی بار برانگیختہ کیا۔ اس نائٹ نے امن کے کئی معاہدے توڑے، حاجیوں کے ایک قافلے کا قتلِ عام کیا اور، حتیٰ کہ، کعبہ پر حملے کی کوشش کی۔ یروشلم کی بادشاہت بھی اس تنازعے میں ملوث ہوگئی۔ بالآخر صلاح الدین کی متحدہ مسلم فوج اور یروشلم کے درمیان حتمی معرکہ برپا ہوا۔

1187ء میں حطین (Hattin) کی جنگ ہوئی۔ صلاح الدین کی فوج نے یروشلم کی فوج کو بری طرح شکست دی۔ مقدس شہر میں فقط چند نائٹ رہ گئے جنھوں نے اکتوبر میں ہتھیار ڈال دیے۔ اٹھاسی سال پہلے صلیبی اس شہر میں طوفانی انداز میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے یہاں کی آبادی کا قتلِ عام کیا تھا اور مذہبی مقامات اپنی سلطنت میں شامل کر لیے تھے۔ لیکن صلاح الدین نے حضرت عمرؓ کی پیروی کی جنھوں نے یہ شہر پہلی بار 637ء میں فتح کیا تھا۔ اس نے شہر کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے لیے قتلِ عام کا سہارا نہیں لیا۔ انھیں اپنے علاقوں کی طرف نکل جانے کا محفوظ راستہ دیا گیا۔ انھیں اپنا مال و دولت بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔ شہر کی عیسائی زیارت گاہوں کو محفوظ بنایا گیا اور ان کی زیارت کی اجازت دی گئی۔ صلاح الدین کا شریفانہ طرزِ عمل رائیگاں نہیں گیا۔ اس کی سورمانہ شجاعت کے قصے پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اسی لیے صلاح الدین اور بعد کے صلیبی بادشاہوں کی لڑائی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین باہمی احترام کے بہت سے قصے ملتے ہیں۔ خود صلاح الدین اور صلیبی بادشاہ رچرڈ دی لائن ہارٹ (Richard the Lionheart) کی کہانیاں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔

صلاح الدین کی وفات کے بعد اس کا علاقہ ایوبی سلطنت بن گیا۔ کئی دہائیوں تک اس کے

جانشین مصر اور شام پر حکومت کرتے رہے حالانکہ مزید صلیبی فوجیں یروشلم پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش میں اس کی سرحدوں تک آتی رہیں۔ یروشلم کی آزادی کے سو سال بعد تک صلیبی کوشش کرتے رہے لیکن وہ نہ تو مسلم حکومتوں کے لیے کوئی بڑا خطرہ بن پائے اور نہ ہی یروشلم پر دوباہ قابض ہوے۔ اس کی بجائے ایک نیا خطرہ ابھر رہا تھا جس کے سامنے صلیبی جنگوں کو چھوٹا اور کم اہم ثابت ہونا تھا۔ یروشلم آزاد کروانے میں صلاح الدین کی کامیابی کے صرف بیس سال کے بعد چین کے شمال میں بسنے والے منگول قبیلے ایک جنگجو سردار چنگیز خان کی قیادت میں متحد ہوے۔ ان کا مقصد اپنی سلطنت کو متواتر وسیع کرتے چلے جانا تھا۔ اگر چہ یہ قوت مسلم دنیا کے مرکز سے 8000 کلو میٹر دور تھی لیکن اسے بہت جلد اسلام کی سیاسی قوت کے لیے خطرہ بن جانا تھا۔

منگول

ستم ظریفی یہ کہ منگول حملے کے وقت مسلم دنیا دوبارہ مائل بہ عروج تھی۔ فاطمی ختم ہو چکے تھے اور انتہا پسند شیعہ بھی فقط شام اور ایران کی چند آبادیوں تک محدود ہو گئے تھے۔ ایران اور شام کی چند سرحدی پٹیاں ابھی تک صلیبیوں کے قبضے میں تھیں لیکن وہ مسلم سرزمین کے لیے قابلِ ذکر خطرہ نہ تھیں۔ بازنطینی ابھی تک مانزکرٹ کے نقصان سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ انھیں صلیبیوں کا مسئلہ بھی لاحق تھا جو یروشلم جا کر مسلمانوں سے جنگ کرنے کی بجائے قسطنطنیہ میں ہم مذہبوں سے جھڑپوں میں مصروف تھے۔ لیکن مسلم دنیا میں تیرھویں صدی کے اوائل کا یہ استحکام دیرپا نہیں تھا۔ چنگیز خان اور منگول چند سال کے اندر دیوارِ چین کے شمال میں بسنے والے بے وقعت قبیلے سے اٹھ کر دنیا کی بڑی سلطنتوں میں سے ایک بن چکے تھے۔ حکومت میں آنے کے دس سال کے اندر اندر انھوں نے نصف شمالی چین کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ پھر چنگیز خان نے مغرب کی طرف توجہ دی۔ ایشیا پر ان کے تسلط کی راہ میں فقط وسطی ایشیا کی ریاستیں حائل تھیں جن پر خوانین کی حکومت تھی۔ وسطی ایشیا کے میدان اسی طرح کے تھے جہاں سے وہ اٹھ کر آئے تھے۔ انھوں نے بہت جلد اُس وسیع خطے کو فتح کر لیا۔ اس فتح کے اثرات بڑے تباہ کن تھے۔ 1219ء تک منگولوں کی حکومت دریا سے لے کر ایران میں مسلم سرحد

تک پھیل چکی تھی۔

تیرھویں صدی کے اوائل میں منگولوں کا اچانک ابھرنا تاریخِ عالم میں عسکری توسیع کی اہم ترین مثالوں میں سے ایک ہے۔ یہ لوگ خانہ بدوش گھڑسوار تھے اور انھوں نے زراعت پر بھی عبور حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن انھوں نے جو مالی سلطنت بنائی وہ وسطی یورپ سے کوریا اور ہندوستان کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی گھڑسوار خانہ بدوشی کی فطرت نے اس طرح کی فتوحات کو ممکن بنایا۔ منگول عملاً گھوڑے کی زین پر زندگی گزارتے تھے۔ اسی لیے کسی سرزمین کا طویل سفر یا راستوں کا نہ ہونا عام فوج کو روک دیتا تھا لیکن منگولوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ متاثر کن تیز رفتاری کے علاوہ وہ اپنے دشمنوں کا دل دہلانے کے لیے سوچی سمجھی حکمتِ عملی اختیار کرتے۔ ان کے مقابل ایسے خوفزدہ ہوتے کہ اپنے وطن کے لیے لڑنے کی بجائے ان کے سامنے خود بخود ہتھیار ڈال دیتے۔ جب منگول کسی دشمن شہر تک پہنچتے تو انھیں تین میں سے کوئی ایک طریقہ منتخب کرنے کو کہتے۔ ایک انتخاب تو یہ تھا کہ دشمن لڑائی سے بچنے کے لیے ہتھیار ڈال دے اور منگول فوج میں شامل ہو کر جاری اور مسلسل فتح میں ان کا ساتھ دینے چل پڑے۔ دوسرا انتخاب مزاحمت تھا۔ اگر دشمن مزاحمت کرتا اور ہار جاتا (جو کہ اکثر ہوتا تھا) تو ساری فوج قتل کر دی جاتی اور شہر لوٹ لیا جاتا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ فوج اور شہری دونوں منگولوں کے خلاف لڑتے۔ اس صورت میں منگول عہد کرتے کہ شہر میں موجود ہر ذی روح کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ایشیا کے بہت سے شہروں اور قصبوں کو اسی انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح کے طریقوں سے منگول ہر لحظہ بڑھتی رفتار کے ساتھ پورے ایشیا میں پھیل گئے اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنائی۔ وسطی ایشیا سے امنڈتے ان جنگجوؤں کے ظلم وستم کی کہانیاں ان سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ آگے آگے پھیلتی تھیں۔ عراق سے چین تک منگولوں کے راستے میں پڑنے والے زیادہ تر لوگوں نے ان کے غیظ وغضب کا سامنا کرنے کی بجائے اطاعت کر لی۔

منگول سلطنت کی سرحدوں کے ساتھ لگتی مسلم ریاست خوارزم شاہی سلطنت تھی۔ اس سلطنت میں زوال یافتہ عظیم سلجوق سلطنت کے بہت سے ٹکڑے شامل تھے۔ 1200ء تا 1220ء تک حکومت کرنے والے شاہ محمد نے انھیں ایران کے زیادہ تر حصے کے ساتھ ملا کر خوارزم شاہی سلطنت بنائی۔

شاہ محمد ترک الاصل تھا لیکن اس کی اٹھان ایران کے درباری ماحول کی تھی۔ اس کے عہدِ حکومت میں دسویں صدی کے وسط سے عملاً بے اختیار چلے آنے والے عباسی خلفاء نے اپنے اختیارات کا براہِ راست استعمال شروع کیا۔ صدیوں کے بعد الناصر پہلا خلیفہ تھا جو فوج کی قیادت کرتا بغداد سے باہر گیا۔ تب اس نے زیادہ تر عراق اور ایران کا کچھ حصہ اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ چونکہ شاہ محمد خود مسلم دنیا میں اپنا اختیار اور اقتدار پھیلا رہا تھا چنانچہ اسے بھی خلافت کی خودمختاری پسند نہ تھی۔ چنانچہ خلیفہ کی نئی نئی بادشاہت اور شاہ محمد کی خوارزمی سلطنت کا تصادم ہونا ہی تھا۔ شاید اسی تنازعے کی وجہ سے یا متواتر لڑائیوں سے تھکے غلام فوجیوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار کے باعث خوارزمیوں کی تیاری سے پہلے ہی چنگیز خان اپنی خوفناک فوج لیے 1219ء میں مسلم سرحد پر آ گیا۔

خوارزمیوں نے منگولوں سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جب منگول سلطنت سے تاجر خوارزمی علاقے میں داخل ہوئے تو انھیں جاسوس قرار دے کر قتل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چنگیز خان اس وقوعے پر خوش نہیں ہوا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ بظاہر وہ مسلم ریاست سے پرامن تعلقات رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے انتقام کی قسم کھائی۔ اگلے سال منگول فوج پہلی بار مسلم علاقوں میں داخل ہوئی۔ اس طرح ایران، عراق اور شام میں مسلم تہذیب کی تباہی کا آغاز ہوا۔ منگولوں نے مشرقی ایران کے شہروں کی تیز رفتار فتح کے لیے اپنی حربی مہارت کے ساتھ ساتھ قلعہ شکنی کے چین سے لائے گئے آلات بھی استعمال کیے۔ حدیث کے عظیم جامع امام بخاری کے ساتھ منسوب چلا آنے والا شہر بخارا بالکل تباہ کر دیا گیا۔ قدیم بلخ کا بھی یہی انجام ہوا۔ ہزاروں مسودات پر مشتمل اس کی لائبریری دریا برد کر دی گئی۔ منگولوں کو کتابوں یا مسلمانوں کے علمی کارناموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ خانہ بدوش جنگجو تھے اور انھیں سوائے علاقے فتح کرنے اور لوٹ مار کرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ آج کے ایران اور افغانستان میں پیش قدمی کرتے ہوئے انھوں نے بعض بڑے شہروں کا نام ونشان مٹا دیا۔ اس دور کے مسلمان مورخوں نے لکھا کہ منگولوں نے نیشاپور میں 17 لاکھ اور ہرات میں بیس لاکھ لوگ قتل کیے۔ اس تعداد کی صحت یقینی نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ منگول جہاں بھی گئے موت اور تباہی لائے۔ مسلم تہذیب جس کی تشکیل میں چھ سو سال لگے تھے چند ہفتوں میں ملیامیٹ ہوئی جاتی تھی۔ مختصر لیکن تباہ کن تصادم

کے نتیجے میں خوارزمی سلطنت 1222ء تک عملاً تباہ ہو چکی تھی۔ چنگیز خان نے مسلم دنیا کے قلب تک جانے کا ارادہ ترک کیا اور واپس منگولیا کی راہ لی جہاں وہ 1225ء میں مر گیا۔

چنگیز خان کی وفات کے بعد مسلم دنیا کو منگول حملوں سے نجات ملی۔ اس کے بیٹے اوکتائی نے اپنی توجہ کوہ یورال (Ural) عبور کر کے یورپ فتح کرنے پر مرکوز کر دی۔ منگولوں نے یہ کام حسب معمول ناقابلِ یقین اہلیت کے ساتھ کیا۔ 1237ء میں منگول فوجیں آج کے روس سے گزر کر ہنگری اور جرمنی تک جا چکی تھیں۔ عیسائی حکمران خوفزدہ تھے کہ منگول ان کی حکومتوں کے ساتھ بھی وہی کریں گے جو وہ خوارزمیوں کے ساتھ کر چکے تھے۔ لیکن جس طرح منگولوں کی مسلم ممالک میں دراندازی ختم ہو گئی تھی اسی طرح اوکتائی کے مرنے پر انھوں نے اپنی یورپی مہمات بھی 1241ء میں ختم کر دیں۔ اس وقت پر اہلِ یورپ ارض مقدس پر صلیبی جنگوں اور یروشلم کو دوبارہ فتح کرنے کے خیال میں مست تھے۔ لیکن ایوبی سلطنت میں ابھی تک یروشلم کے لیے ہونے والی کسی بھی کوشش پر مزاحمت کی مطلوبہ اہلیت موجود تھی۔ اہلِ یورپ کی خوش قسمتی سے منگولوں کے ساتھ اتحاد کا امکان بڑھ گیا۔ ایک تو نسطوری عیسائی منگول سلطنت کے بالائی طبقے میں بتدریج سرایت کر گئے اور، دوسرے خاص طور پر اس لیے بھی کہ، چنگیز خان کے بہت سے جانشینوں نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ یورپی بادشاہوں نے مسلم علاقوں پر حملوں کے لیے منگولوں کے پاس بار بار سفارتیں بھجوائیں۔ بالآخر منگولوں نے 1255ء میں مسلم سیاسی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے ایک فوج تیار کر لی۔

بغداد میں واقعی روزِ حساب تھا۔ پیغمبرؐ کی اولاد اور خانوادۂ علم و فضل قیدی بنائے گئے۔ جن ان لوگوں کو امان نہ ملی تو شہروں میں اور کون بچ سکتا تھا۔

اسمٰعیل ابن ابی الیسر، (Isma'il ibn Abil-Yusr)، ایک معاصر شاعر

اس منگول فوج کی قیادت ہلاکو کے پاس تھی۔ اسلام کے متعلق اس کے خیالات پر عیسائی اور بدھ مشیروں کے اثرات تھے۔ یہ میدانِ جنگ کو روانہ ہونے والی غالباً سب سے بڑی فوج تھی۔ اس

1- یروشلم میں گنبد الصخرۃ۔ اسے اموی خلافت کے دوران 691ء میں بنوایا گیا۔

2- استنبول میں سلیمان کی مسجد کا صحن۔ یہ مسجد 1558ء میں ماہر تعمیرات سینان معمار نے تعمیر کی۔

3- مدینہ کی مسجد نبوی۔ اس میں آپ کا روضہ مبارک ہے

4- دمشق کی اموی مسجد۔ 715ء میں تعمیر شدہ۔ اس مسجد پر بازنطینی طرز تعمیر کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔

5- قروین یونیورسٹی کا صحن۔ اسے 859ء میں فاطمہ الفہری نے مراکش کے شہر فاس میں بنوایا۔

6- فارسی وضاحت کے ساتھ ایک خاکہ۔ چاند گرہن کی سائنسی وضاحت کے لیے یہ خاکہ البیرونی نے گیارھویں صدی میں کھینچا۔

7- خط کوفی میں لکھا گیا عہد اوائل کا قرآن کا ایک نسخہ

8- سامراء میں عباسی عہد کا ایک مینار

9- سترھویں صدی کی ایک یورپی کندہ کاری۔ ابن الہیثم اور گیلی لیو کو سائنس کے بانیوں کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

11- ذکر یعنی یادالٰہی میں مصروف اورنگ زیب عالمگیر کا ایک پورٹریٹ

10- فاتح محمد ثانی کا ایک عثمانی پورٹریٹ

13- عثمانی سلطان محمود ثانی کی تصویر، ملبوساتی اصلاحات کے بعد۔ ان اصلاحات نے عثمانی ملبوسات کو مغربی یورپی انداز کے قریب کر دیا۔

12- 1375ء کے ایک کتلانی مرقع میں سونے کا ڈلا پکڑے مانسا موسیٰ

14- بحر اوقیانوس اور جنوبی امریکی و افریقی ساحلوں کا نقشہ جسے عثمانی نقشہ نگار پیری ریس نے 1513ء میں کھینچا۔
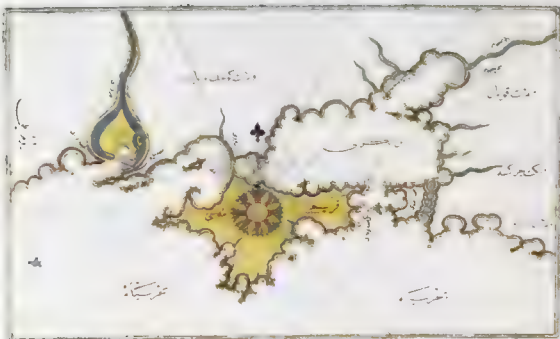
15- پیری رئیس کا تیار کردہ کریمیا کا نقشہ جو 1513ء کی اس کی کتاب ''کتاب المساحت'' سے لیا گیا

16- سلطان عبدالحمید ثانی کا طغریٰ۔ اسے اکثر فن طغریٰ کی معراج سمجھا جاتا ہے

17- نیلی مسجد کے ہندسی اور خوش نویسی کے نمونے۔ یہ مسجد عثمانیوں نے 1616ء میں بنائی۔

18- پندرھویں صدی کی ایک درسی طبی کتاب سے لی گئی آپریشن کی تصویر

19- اٹھارھویں صدی کا ایک عربی مسودہ۔ سطروں کے درمیان جاوا زبان میں ترجمہ دیا گیا ہے۔

20- آلات کی ایجاد پر الجزری کی کتاب سے لی گئی آبی گھڑیال کی تصویر

21- قاہرہ کی الازہر مسجد اور یونیورسٹی۔ اسے فاطمیوں نے دسویں صدی میں قائم کیا۔

22- قاہرہ میں قایتبائی Qaitbay مسجد۔ مخصوص مملوک طرزِ تعمیر صاف نظر آتا ہے

23- مسجد قرطبہ کے ستون اور محرابیں، یہ مسجد اندلس کے امویوں نے بنوائی

24- آئبیریا کی آخری مسلم ریاست غرناطہ کا امیر 1492ء میں کاسٹائل کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے
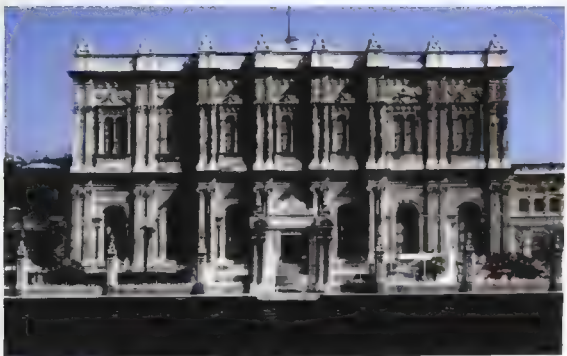
25- استنبول کا دولما باغچہ محل جسے 1856ء میں تعمیر کیا گیا۔ تنظیماتی عہد کی اس عمارت پر یورپی اثرات واضح ہیں۔

26- پہلی جنگِ عظیم کے دوران آخر 1917ء میں برطانوی جنرل ایڈمنڈ ایلن بائی یروشلم میں داخل ہوتے ہوئے

MAP OF EASTERN TURKEY IN ASIA, SYRIA AND WESTERN PERSIA

A

B

27- 1916ء کے سائیکس پیکو معاہدے میں کھینچی گئی سرحدوں کا نقشہ۔ اس میں مشرق وسطیٰ کو برطانوی اور فرانسیسی زیر تسلط حصوں میں بانٹ دیا گیا

28- قسطنطنیہ کی تھیوڈیسی دیوار کی باقیات جس نے محمد ثانی کی فوج کو تقریباً دو ماہ تک روکے رکھا
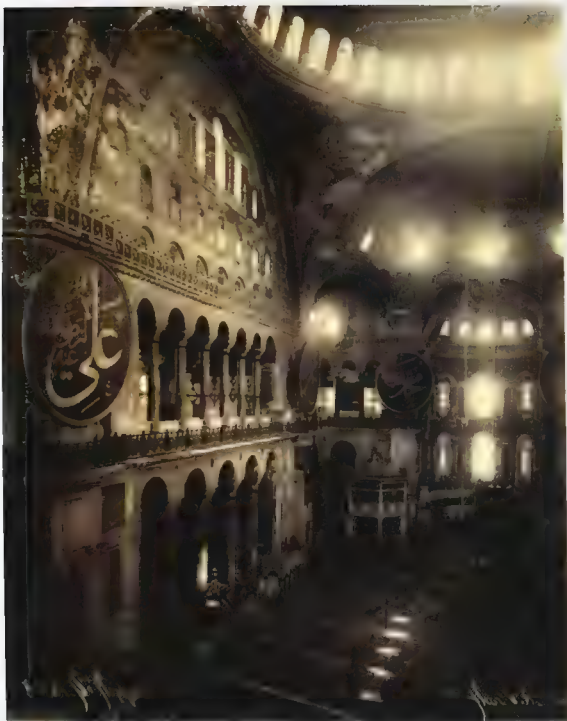
29- آیا صوفیہ کی اوائل بیسویں صدی کی تصویر جس میں یہ مسجد نظر آتی ہے

30- جزائر برطانیہ Mercia کے کنگ اوفا کا آٹھویں صدی کا ڈھلوایا طلائی سکہ۔ اس میں
مسلم سکوں کی اس حد تک نقل کی گئی ہے کہ عربی میں کلمہ بھی موجود ہے
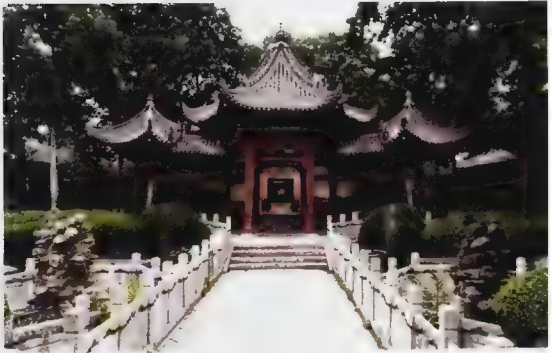
31- چین میں آٹھویں صدی کی ایک مسجد ''شیان''

کی تعداد کوئی ایک لاکھ تھی۔ آرمینیا کے فوجی دستے اور دیگر صلیبی ریاستوں کی فوج بھی ان کے ساتھ مل گئی۔ مسلم دنیا اس ابتلاء کے لیے تیار نہ تھی۔ خوارزمی سلطنت بکھر چکی تھی اور تیس سال پہلے کے منگول حملوں سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ عباسی خلافت کے پاس بس عراق کا علاقہ تھا اور وہ حشیشین کے ساتھ اپنا اقتدار بچانے کے لیے مسلسل کوشاں تھی۔ اسی اثناء میں صلاح الدین ایوبی کے جانشینوں کا تختہ 1250ء میں خود ان کی غلام فوج نے الٹ دیا تھا۔ مملوک کہلانے والے ان لوگوں نے مصر میں مملوک سلطنت قائم کر لی تھی۔ غیر متحد اور کمزور مسلم دنیا پر ایک بار پھر غیر ملکیوں نے حملہ کیا اور ایک بار پھر نتیجہ تباہی کی صورت نکلا۔

922ء میں مسلم سیاح اور فقیہہ ابن فضلان نے وائیکنگوں کے متعلق یادداشتیں لکھیں۔ یہ اب تک کی اولین دستیاب دستاویز ہے۔

منگول فوج ایران میں گھسی اور اس نے حشیشین پر بھاری حملے کیے۔ ان کا ٹھکانہ الموت (Alamut) جسے سنی ابھی تک فتح نہ کر سکتے تھے، ہلاکو نے 1256ء میں تباہ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ سنی الموت کی تباہی پر خوش ہو سکیں ہلاکو نے بغداد پر نظریں جمالیں۔ یہ شہر 750ء سے دارالخلافہ چلا آ رہا تھا۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے ہتھیار ڈالنے اور منگول برتری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسلامی تاریخ میں خود خلافت کا سقوط کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کبھی دارالخلافہ فتح کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ فاطمیوں اور صلیبیوں کے مقابلوں میں بھی حالات نے کچھ ایسے رخ اختیار کیے تھے کہ مسلم دنیا کی روحانی قیادت بچ گئی تھی۔ جب 1258ء میں منگول بغداد پہنچے تو شاید مستعصم باللہ اور بغداد میں بیٹھے لوگوں نے اسی تاریخی تناظر میں سوچا ہوگا کہ اب کی بار بھی کوئی اسی طرح کا معاملہ ہوگا۔ تاہم اس بار کوئی معجزانہ فتح نہ ہوئی۔ خلافت بچانے کے لیے کوئی بڑا اتحاد وجود میں نہ آیا۔ منگول جارحیت کے سامنے انفرادی بہادری کا کسی طرح کا کارنامہ کارگر نہ ہوا۔ صرف ایک ہفتہ محاصرے کے بعد 10 فروری 1258ء کو بغداد پر ہلاکو کا قبضہ ہو گیا۔

بغداد کی فتح اسلامی تاریخ کے سب سے تباہ کن واقعات میں سے ایک تھا۔ جونہی شہر فتح ہوا معمول کی منگول قتل وغارت شروع ہوگئی۔ صرف شہر کی عیسائی آبادی کو چھوڑ اگیا۔ مامون نے علوم کی ترقی کے لیے جو بیت الحکمت قائم کیا تھا، زمین بوس کر دیا گیا۔ اس کی کتب دجلہ میں پھینک دی گئیں۔ سینکڑوں سال کی علمی کاوشوں کی روشنائی سے دجلہ سیاہ ہوگیا۔ ریاضی، سائنس، جغرافیہ، تاریخ، الٰہیات اور فقہ کے ہزاروں فن پارے ہمیشہ کے لیے کھو گئے۔ یہ نقصان اتنا زیادہ تھا کہ آج ہمارے پاس عہدِ زریں کے ابن الہیثم، البیرونی اور ابن سینا جیسے عظیم سائنس دانوں کے کام کا صرف معمولی حصہ موجود ہے۔ ان کی کیسی کیسی دریافتیں ہوں گی جن سے ہم بے خبر رہے اور وہ دجلہ کی نذر ہوگئیں۔ جب سینکڑوں سالوں کی علمی کاوش ضائع کی جارہی تھی تو ہلاکو خود خلیفہ کو اس کے ایک قالین میں لپٹوا کر لے گیا اور منگول گھڑسواروں کی ٹاپوں تلے مروا دیا۔ اس قتلِ عام کے فوراً بعد عباسی خاندان کو قاہرہ میں بطور خلیفہ نہ بٹھا دیا جاتا تو عباسی خلافت ختم ہوگئی ہوتی۔ مملوکوں کے تحت خلافت 1517ء تک موجود رہی۔ لیکن یہ خلیفہ صرف نام کے اور اعزازی تھے انھیں حقیقی اختیارات کبھی حاصل نہ ہوسکے۔ بغداد کی تباہی محض ایک شہر کی تباہی نہیں تھی۔ یہ ایک سیاسی، سائنسی اور مذہبی مرکز کا خاتمہ تھا جس کے متعلق اس وقت کی مسلم دنیا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ منگولوں کا بغداد پر اکتفا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ہلاکو اپنی فوج لیے شام جا پہنچا۔ حلب اور دمشق پر قبضہ ہوگیا۔ خطے کے عیسائیوں اور بالخصوص صلیبیوں کو اس کی بہت خوشی ہوئی۔ عیسائیوں کا ایک دعائیہ اجتماع دمشق کی امیہ مسجد میں ہوا جو کبھی دنیا کی سب سے بڑی عظیم الشان مسجد ہوا کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ منگولوں کو جنوب میں پہنچنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ وہاں کی اسلامی تہذیب بھی تباہ کردی جائے گی اور اسلام عملاً اسی تیزی سے ختم ہو جائے گا جس تیزی سے چھ سو برس پہلے پھیلا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہونا تھا۔ نوعمر مملوک سلطنت نے 1260ء میں منگولوں کا راستہ شمالی فلسطین میں روک لیا۔ مملوک فوج کی قیادت سلطان بیبرس (Baybars) کے پاس تھی۔ اس نے منگولوں کے خلاف خود انھی کے گھڑسوار دستوں کی چالیں استعمال کیں۔ مسلم علاقے میں داخل ہونے کے بعد یہ منگولوں کی پہلی شکست تھی۔ اس فتح کی وجہ سے نہ صرف مصر بلکہ اسلام بھی منگول ظلم وستم سے بچ گیا۔ اس کے

بعد ہونے والے حملے بھی ناکام رہے۔ ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ روس میں ایک منگول خان Berke نے اسلام قبول کرلیا اور وہ مملوکوں کے ساتھ مل کر منگولوں کے خلاف لڑا۔ مسلم برک اور بے دین ہلاکو کے درمیان ہونے والی اس خانہ جنگی نے بھی مسلم دنیا کو عارضی سکون کا ایک وقفہ دیا۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں منگول سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی اور اس کی توسیع کا عمل رک گیا۔ منگول حملوں نے مسلم تہذیب کو معدوم تو نہ کیا لیکن جو کچھ بچا وہ گزشتہ عظمت کا صرف سایہ تھا۔ ایران اور عراق سیاسی اعتبار سے تباہ ہوگئے۔ جنگ وجدل نے شام کو اجاڑ دیا۔ مکہ اور مدینہ کے مقدس شہر بے دینوں کے قبضے میں جانے سے بال بال بچے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ بعض نے تو آہ و بکا شروع کردی کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔

تیرھویں صدی کی تباہی کے نتیجے میں بڑے خطرناک الٰہیاتی سوالات نے جنم لیا۔ اسلام پر نازل ہونے والی تباہی کے باعث کچھ مسلمانوں کا اپنے اس عقیدے پر قائم رہنا مشکل ہوگیا کہ اسلام کامل دین ہے۔ رسول اللہؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے شروع ہونے والا خلافت کا ادارہ ختم ہوگیا تھا۔ لاکھوں مسلمان منگولوں کے ہاتھوں مارے گئے اور بدترین بات یہ تھی کہ منگول بے دین تھے، وہ اہلِ کتاب بھی نہ تھے۔ منگولوں کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچنا مسلمانوں کے لیے مسئلہ تھا۔ کچھ نے سوال اٹھایا کہ آیا اسلام کہاں پر غلط تھا۔

ابن تیمیہؒ (1263ء تا 1328ء) کی زیرِ قیادت مسلمان ماہرینِ الٰہیات اس خیال کا رد لکھنے لگے۔ ان کا استدلال تھا کہ اسلام میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ انھوں نے کہا اصل مسئلہ اسلام کی راہ سے ہٹ جانے کا ہے اور منگول تباہی اصلاً مسلمانوں کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ 200 سال پہلے کے الغزالی کی طرح انھوں نے بھی اسلام میں موجود ہر اضافے کو، جو آپؐ کی مثال سے متصادم تھا، چن چن کر نکالنا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود صوفی تھے لیکن انھوں نے کچھ صوفی سلسلوں کے سرّی فلسفوں کی مذمت میں لکھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سریّت تکثیریت کی طرف لے جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ان لوگوں کی قیادت کو ناجائز قرار دیا جن کا اپنا عمل اسلام کے مطابق نہیں تھا اور جو خود اسلامی قانون کا نافذ نہیں کرتے تھے۔ یوں منگول اور مملوک حکمرانوں کے ساتھ ابن تیمیہؒ متفق نہ ہوئے۔

انھیں کئی بار قید کیا گیا اور وہ دمشق کے قلعے ہی میں فوت ہوے۔ ان کی تعلیمات نے بہت سے مسلمانوں میں امید پیدا کر دی کہ اگر وہ خالص اور اصل اسلام کے پیروکار بن جائیں تو دوبارہ دنیا پر غالب آ سکتے ہیں۔ واقعی اسلامی تہذیب کا احیاء ہونا تھا لیکن نیل اور دریائے آمو کے درمیان واقع اسلام کے روایتی قلب میں نہیں۔ اس کی بجائے یہ احیاء مسلم دنیا کی شمال مغربی سرحدوں پر ہوا جہاں ترکوں کے خانہ بدوش جنگجو معاشرے نے بازنطینیوں کی شہری اور مستحکم بادشاہت سے ٹکر لی۔

آٹھواں باب

الاندلس

اسلام اور مسلمانوں کی کہانی میں بالعموم توجہ اسلامی دنیا کے مرکزی علاقے پر مرکوز رہتی ہے جو نیل سے دریائے آمو تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں مصر، شام، جزیرہ نمائے عرب، عراق اور ایران آتے تھے۔ تاہم اسلامی تاریخ کو ان خطوں کے سیاق وسباق میں دیکھنا بھی ضروری ہے جہاں مسلم تہذیب کی سرحدیں براہِ راست باقی دنیا سے ملتی تھیں۔ جزیرہ نما آئیبریا میں، جہاں آج کے سپین اور پرتگال واقع ہیں، اسلام مسیحی یورپ کے ساتھ براہِ راست متعامل ہوا۔ یہاں ایک متنوع اور پیچیدہ معاشرہ بنا جو مسلم بھی تھا اور مغربی یورپی بھی۔

سپین میں اسلام کا استحکام

ساتویں صدی کے وسط میں بنوامیہ نے شمالی افریقہ بڑی تیز رفتاری سے فتح کیا۔ اس کے بعد کچھ وقت کے لیے فتوحات کی رفتار سست پڑ گئی۔ لگتا تھا کہ بحراوقیانوس اور بحیرہ روم نئی مسلم سلطنت کی قدرتی سرحدیں ہیں۔ ساتویں صدی کا دوسرا نصف مفتوح علاقوں پر گرفت مضبوط کرنے اور نئے لوگوں کو اسلامی دنیا میں شامل کرنے میں صرف ہو گیا۔ لیکن جب مسلم افواج جزیرہ نما آئیبریا میں اترنے لگیں اور مزید ایک علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل کیا گیا تو فتوحات کا دھارا ایک بار پھر رواں ہو گیا۔

اس جزیرہ نما کے تیزی سے فتح ہو جانے کی وجوہات پر بہت بحث کی گئی ہے۔ اس مہم کا آنکھوں دیکھا احوال بتانے والے کہتے ہیں کہ بس یوں لگتا تھا خدا کچھ سے خوش اور کچھ سے ناراض ہے۔ مسلمانوں کے لیے فتح اتنی آسان اور ایسی تیز تھی کہ گویا خدا اس علاقے کو مسلم سلطنت میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ عیسائیوں نے اپنے بھاری نقصانات کی وضاحت میں کہا کہ وزی گاتھ کے غیر اخلاقی رویے کے باعث خدا نے ان پر مسلمان بطور سزا مسلط کر دیے۔ ظاہر ہے کہ زیرِ غور لانے کے لیے مزید اور زیادہ ٹھوس عوامل بھی موجود ہیں۔

ایک تو یہ کہ وزی گاتھی بادشاہ اور راڈرک (Roderic) پہلے سے موجود سیاسی تنازعات کے باعث عوام میں مقبول نہیں تھے۔ اشرافیہ کے ایک حصے نے افریقہ سے ہونے والے حملے کے خلاف بادشاہ کا ساتھ نہیں دیا۔ گوڈالیٹ (Guadalete) کی جنگ کے دوران امراء اور سپاہیوں کی قابلِ ذکر تعداد میدان سے کھسک گئی اور پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ گیا۔ یہ جنگ مقامی مزاحمت کا نقطہ عروج تھا۔ اسی سے عوام میں وزی گاتھیوں کی عدم مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام بڑے شہر آسانی سے فتح ہو گئے۔ اصل مزاحمت شمالی علاقوں میں ہوئی جہاں سیاسی علیحدگی پسند مسلم آمد سے پہلے ہی لڑ رہے تھے۔ مسلمانوں کی پیش کردہ اچھی شرائط اور مقامی خودمختاری کے وعدوں کی بدولت بہت سے بڑے شہروں نے بلامزاحمت ہتھیار ڈالے۔ غیر مقبول وزی گاتھی بادشاہت کے تناظر میں مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی آزادی زیادہ اجاگر ہوئی۔

تیز رفتار فتوحات مکمل ہونے کے بعد مسلمانوں نے آباد ہونا شروع کیا۔ یہ آبادکاری مشرقِ وسطیٰ میں خلفائے راشدین اور اموی دور کی سی نہیں تھی۔ اس ابتدائی دور کے مسلمانوں نے مفتوحہ علاقوں میں آبادکاری کے لیے چھاؤنیاں بنائیں۔ لیکن اندلس میں ہونے والی آبادکاری ویسی منظم نہیں تھی۔ مسلمانوں نے خود کو چھاؤنیوں تک محدود نہیں رکھا۔ شمالی افریقہ کے بربر اپنے شناسا ماحول کی تلاش میں مغرب اور شمال میں بسے۔ یہاں انھیں وہ چراگاہی ماحول ملا جس کے وہ شمالی افریقہ میں عادی تھے۔ اندلس آنے والے عرب قبائل یمن سے آئے تھے۔ ان کے ہاں کاشتکارانہ طرزِ حیات کی لمبی روایت تھی۔ اس لیے وہ جنوب کے زرخیز علاقوں اور قرطبہ (Cordoba)، ویلنشیا

(Valencia) اور زارگوسا (Zaragoza) جیسے بڑے شہروں میں آباد ہوئے۔ عربوں اور بربروں نے مقامی آبادی کے ساتھ رشتے ناتے کیے اور اس طرح ایک منفرد معاشرت وجود میں آئی جس میں عرب، بربر اور ہسپانوی رنگ شامل تھے۔

اموی دور حکومت

مسلم حکومت کے پہلے چند عشروں کا اندلس وسیع اموی سلطنت کا دور دراز واقع اور بے وقعت سا کونا تھا۔ لیکن آٹھویں صدی کے عباسیوں نے امویوں کا تختہ الٹا تو معاملات کی نہج بدل گئی۔ شام میں اموی خاندان کے زیادہ تر لوگ قتل ہوے یا قید کر دیے گئے۔ تاہم ایک بیس سالہ اموی شہزادہ عبدالرحمٰن بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اپنا تعاقب کرتی عباسی فوج کے آگے بھاگتا 750ء میں دمشق سے نکلا اور پوری مسلم دنیا کے اندر مدد اور تعاون ڈھونڈتا رہا۔ اس کی ماں بربر تھی چنانچہ اس نے شمالی افریقہ کے بربروں سے بھی مدد مانگی۔ اس سارے سفر میں وہ پیچھے لگے عباسی کارندوں سے بال بال بچتا رہا۔ بالآخر 755ء میں وہ اندلس میں امویوں کی معاونت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے یہاں اموی ریاست کی بنیاد رکھی اور قرطبہ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس نے خود کو دور دراز واقع عباسی بغداد سے سیاسی طور پر الگ تھلگ رکھا۔ شام سے اس دور دراز مغربی سرزمین کے سفر کے باعث عبدالرحمٰن کا عرف الداخل (مہاجر) پڑ گیا۔

اس کی قائم کردہ ریاست میں صدیوں تک کئی تمدن باہم گھلتے ملتے رہے۔ مسلم دنیا سے لوگوں کی اس دور دراز سرزمین پر آمد جاری رہی۔ یہ لوگ اپنے اپنے تمدن بھی لائے۔ علاوہ ازیں نویں صدی کے اواخر اور دسویں صدی کے اوائل میں مقامی ہسپانوی آبادی کا ایک بڑا حصہ بھی مسلمان ہو گیا۔ دسویں صدی کے وسط تک جزیرہ نما کی آدھی آبادی مسلمان تھی اور بارھویں صدی کے آتے آتے عیسائی آبادی فقط 20 فیصد رہ گئی تھی۔ عرب، بربر اور ہسپانوی مسلمانوں نے اندلس کا منفرد تمدن پیدا کیا۔ اس تمدن کے اجزاء بڑے متنوع تھے جو اسلام کے پرچم تلے جمع ہوگئے تھے۔ اندلس کی عیسائی آبادی نے بھی عرب تمدن اختیار کیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے اسلامی ثقافت اور عربی زبان، فنون اور رسم ورواج کو اپنانا

شروع کر دیا۔ ہسپانوی زبان میں عربی سے مستعار الفاظ آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہودیوں کو بھی اندلسی معاشرے کا بہت فائدہ ہوا۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ یہودیوں کے خلاف عدمِ برداشت کے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ انھیں قتل عام جیسے خطرات کا مسلسل سامنا رہتا تھا۔ تاہم مسلم سپین میں انھیں عباداتی رسوم بجالانے کی آزادی دی گئی اور انھیں معاشرت کا حصہ بنایا گیا۔ مسلم سپین میں ہی یہودی فلسفہ اپنے بام عروج کو پہنچا۔ وہیں موسیٰ بن میمون پیدا ہوا جسے تمام زمانوں کے عظیم ترین یہودی فلسفیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اموی دارالحکومت میں عظیم مسجد قرطبہ 200 سال میں بنی اس میں 856 ستون ہیں جن میں سے کئی قدیم رومن کھنڈرات سے لائے گئے۔

عبدالرحمٰن سوم کے عہد حکومت (912ء تا 961ء) میں مسلم اندلسی ریاست اپنے عروج پر تھی۔ نصف صدی پر محیط اپنے دورِ حکومت میں اس نے خود کو مسلم دنیا کا خلیفہ قرار دیا۔ حالانکہ اس کا اقتدار جزیرہ نما آئبیریا تک محدود تھا لیکن ساتویں اور آٹھویں صدی کے اپنے اموی اجداد کی جانشینی کے دعوے کا مطلب تھا کہ وہ شمالی افریقہ میں فاطمیوں کی بڑھتی طاقت کے مقابل آ رہا تھا۔ تب تک بغداد کے عباسی خلیفہ اپنے محلات میں غیر موثر قیدی بن چکے تھے۔ اصل حکومت اور اختیار ترک حکمران خاندانوں کے پاس تھا۔ شیعہ فاطمی ایک اور خطرہ تھا جو سنی اسلام کی سیاسی قوت کو مسلسل لاحق چلا آ رہا تھا۔

عبدالرحمٰن سوم علوم اور فنون کا سرپرست تھا۔ اس اعتبار سے وہ اپنے سے پہلے کے عباسی خلیفہ مامون اور بعد کے عثمانی سلیمان عالی شان کے ہم پلہ تھا۔ اس کے دارالحکومت قرطبہ میں 600 کتب خانے تھے جن میں سے ایک میں کئی زبانوں کی 4 لاکھ سے زیادہ کتب موجود تھیں۔ شہر میں بے شمار دکانیں تھیں جو یورپ بھر کے لیے من پسند چیزیں بناتی تھیں۔ قرطبہ میں چمڑہ، ریشم، کاغذ، اون اور کرسٹل پیدا کیے جاتے تھے جن کی تجارت پورے یورپ اور مسلم دنیا کے ساتھ ہوتی تھی۔ اگر کوئی یورپی معیاری تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو کتب خانوں اور اساتذہ سے استفادے کے لیے سپین کا رخ

کرتا حتیٰ کہ دسویں صدی میں چرچ کے ایک رہنما پوپ سلویسٹر ثانی نے بھی نوعمری میں اندلس میں تعلیم حاصل کی اور مسلم تہذیب کے سائنسی کارناموں پر حیرت زدہ رہ گیا۔ بعد کی صدیوں میں جب اٹلی، فرانس اور انگلینڈ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو ان کی لائبریریاں اندلسی کتب کے لاطینی تراجم پر مشتمل تھیں۔ مسلم سپین ہی وہ رستہ تھا جس سے گزر کر مسلمانوں کا صدیوں سے جمع شدہ علم یورپ پہنچا اور پندرھویں صدی کی احیاء کی تحریک کا سبب بنا۔

قرطبہ کی شان وشوکت محض علوم تک محدود نہ تھی۔ عبدالرحمٰن اور دیگر ابتدائی اندلسی حکمرانوں نے اپنی شکوہ اور سطوت کا اظہار خوبصورت مساجد اور عالی شان محلات کی تعمیر میں بھی کیا۔ مساجد میں سے عظیم ترین مسجد قرطبہ تھی۔ اصل میں اسے عبدالرحمٰن الداخل نے تعمیر کروایا لیکن نویں اور دسویں صدی میں اس کی بار بار توسیع ہوئی حتیٰ کہ اس میں ہزاروں نمازیوں کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اس کا امتیازی نشان ستونوں کا جنگل تھا۔ ان ستونوں پر دوہری محرابیں ہیں۔ یوں قرطبہ کی مسجد فنِ تعمیر کا ایسا شاہکار بن گئی جس کا یورپ میں تقابل صرف قسطنطنیہ کے آیا صوفیہ سے ہوسکتا تھا۔ مسیحی چرچوں کے مجسموں اور تصویروں کی جگہ مسجد میں فنکاری کا اظہار کرنے کے لیے خطاطی اور جیومیٹری کے نقوش سے کام لیا گیا۔ خطِ کوفی میں قرآنی آیات کی خطاطی نے دیواروں کو ڈھانپ رکھا ہے۔ یہ کام اس مسلم عقیدے کا اظہار تھا کہ ادب کا اعلیٰ ترین فن پارہ قرآن ہے اور عالم اسلام کی خوبصورت ترین مسجد کو سجانے کے لائق ہے۔ تعمیرات کے کارنامے فقط مسجدوں تک محدود نہ رہے بلکہ ان کا اظہار محلات سے سجے شہر مدینۃ الزہرا میں بھی ہوا جسے اس دور کا ورسائے (Versailles) کہا جاسکتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ ان سب کاموں کی بدولت قرطبہ باقی یورپ میں دنیا کے نگینے کے نام سے معروف ہوگیا۔

اندلس کے لوگوں کی بدقسمتی تھی کہ یہاں علم اور خوبصورتی پر جو زور دیا گیا، اس کے کچھ منفی نتائج بھی نکلے۔ جب شہریوں کو آرام دہ طرزِ حیات کی سہولت ملی تو ان کی جفاکشی کم ہوتی چلی گئی۔ قرطبہ کے بادشاہوں کو شمال کی عیسائی سلطنتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج کھڑی کرنا تھی لیکن انھیں شہروں اور دیہی علاقوں سے فوج کے لیے لوگ ملنا مشکل ہوگیا تھا۔ فی الحال اندلسی اپنی آسائشی زندگیوں سے منہ

موڑ کر مسلم سپین کے دفاع میں لڑنے کو تیار نہ تھے۔ عامۃ الناس کی یہ بے دلی اور کاہلی حکومتی ایوانوں میں بھی سرایت کرتی چلی گئی۔ گیارھویں صدی کے آغاز تک اموی گھرانے کے افراد اور ان کے حامیوں کے مابین اختیارات کی کشمکش عام ہونے لگی تھی۔ بیرونی دشمنوں پر توجہ دینے کی بجائے امراء قرطبہ کے اندر اپنے حریف گروہوں کو تباہ کرنے میں لگے تھے۔ اختیار اور اقتدار کی جنگ میں باہم دست و گریبان گروہ شمال کے عیسائیوں اور افریقہ کے بربروں کو اپنے حامیوں میں شامل کر رہے تھے۔ 1009ء میں سلیمان ثانی نے امویوں کی ایک دوسری برادری کے خلیفہ کا تختہ الٹ کر خود خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کی فوج ساری کی ساری بربروں اور کاسٹائلوں پر مشتمل تھی۔ اگلے سال ایک اور گروہ نے قرطبہ پر جوابی حملہ کیا جس کے جواب میں ایک سال بعد پھر سلیمان کے حامیوں نے حملہ کر دیا۔ دسویں صدی کے قرطبہ کی بردبار اور مستحکم معاشرت بڑی تیزی کے ساتھ خانہ جنگی اور اقتدار کی کشاکش کے کیچڑ تلے ڈوبتی جا رہی تھی۔ گیارھویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں اندلس کی سیاسی وحدت بکھری اور باہم متحارب بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں۔ ان میں سے ہر ریاست کو طائفہ کا نام دیا گیا۔

طائفوں کا زمانہ اور بربر اصلاحات

اندلسی تاریخ کا طائفہ دور زیادہ تر گیارھویں صدی پر محیط ہے۔ یہ لفظ قرآن سے لیا گیا جس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ متحارب فرقوں کے مابین صلح کروا دیا کریں۔ لیکن اس دور میں بھی امن و امان کی صورتحال بہتر نہ تھی۔ جب چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کا معزول شدہ امویوں کی جگہ لینے کے لیے باہم مقابلہ ہوا تو عرب، بربر اور آئیبیری مسلمانوں کے نسلی فرق ابھر کر سامنے آ گئے۔ قرطبہ، سیوائل، ٹولیڈو، غرناطہ اور زاراگوزا جیسے بڑے شہر جو کبھی اموی سلطنت کے اہم حصے ہوا کرتے تھے، وہ چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں بنیں جو ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔ دہائیوں تک جاری رہنے والی جنگوں کی وجہ سے اندلس، جو کبھی بہت خوشحال ہوا کرتا تھا، کھنڈرات میں بدل گیا۔ فقیہہ، مورخ اور فلسفی ابن حزم جیسے معاصرین نے متحارب فوجوں کے باعث خاموش ہو جانے والے دیہات اور شہروں کی تباہی کا

ذکر کیا ہے۔

اندلس پر اختیار کے لیے طائفوں کی باہمی جنگ کے باعث آئبیریا میں اسلام کو افسوس ناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ طائفہ دور کی فاتحین صرف شمال کی عیسائی ریاستیں تھیں۔ آٹھویں صدی میں آئبیریا کی فتح کے بعد سے جزیرہ نما کے بعید شمالی علاقے مسلم تسلط سے باہر چلے آرہے تھے۔ مسلم تسلط کے بعد وہاں چھوٹی چھوٹی عیسائی ریاستیں رہ گئیں جو سنگلاخ پہاڑی سطح زمین کے باعث محفوظ تھیں۔ جب تک اندلس ایک سیاسی وحدت رہا انھیں بے قابو نہیں ہونے دیا گیا لیکن جب باہم متحارب ٹکڑوں میں بٹ گیا تو ان کے عیسائی بادشاہوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ طائفہ ریاستوں کے کئی بادشاہوں نے اپنی حریف مسلم ریاستوں کے خلاف عیسائی افواج کی مدد حاصل کی۔ اس طرح کے اعمال اوائل کے ادوار میں بدنامی کا باعث بنتے اور پاکباز مسلمان ان سے نفرت کرتے لیکن دور طائف کے بادشاہوں کو نظریے سے زیادہ طاقت اور ملک گیری میں دلچسپی تھی۔ مسلمانوں کے مابین جنگ وجدل میں مداخلت کرتے ہوئے کاسٹائل (Castile)، لیون (Leon) اور نوار (Navarre) جیسی عیسائی ریاستوں نے مسلم مفادات کی قیمت پر اپنی دولت اور زیرِ تسلط علاقوں میں اضافہ کیا۔ اس کی ایک مثال یوں ہے کہ ٹولیڈو طائفہ نے زاراگوزا پر حملہ کرنے کے لیے مملکت ناوار کو بہت سا خراج ادا کیا۔ زاراگوزا نے یوں بدلہ لیا کہ ٹولیڈو کے دیہی علاقے اجاڑنے اور مال و اسباب قبضانے کے لیے کاسٹائل کو پیسہ لگایا۔ اس طرح اندلسی تاریخ کے اس تاریک باب میں مسلمانوں نے خود پیسے دے کر دوسرے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ہاتھوں مروایا اور کمزور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے جزیرہ نما میں زمین کے وسیع ٹکڑے مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے جبکہ سپین کی عیسائی ریاستیں فوجی اور مالی اعتبار سے طاقتور ہوتی گئیں۔ 1085ء میں کاسٹائل کے ہاتھوں ٹولیڈو کا سقوط اہم علاماتی اور تزویراتی نقصان تھا۔ آئبیریا کے عین وسط میں واقع اس سقوط کا مطلب یہ تھا کہ عیسائی افواج، جنوب میں بہت آگے تک بھی، کسی بھی طائف ریاست کے لیے خطرناک ہوسکتی ہیں۔ تب کہیں طائفہ بادشاہوں کو احساس ہوا کہ وہ عیسائی بادشاہوں کے مقابل زیادہ دیر تک نہیں پائیں گے۔ اب انھوں نے مدد کے لیے مسلم دنیا کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ یہ مدد افریقہ سے مرابطیوں کی تطہیری تحریک کی صورت میں آئی۔

مرابطی تحریک شمالی افریقہ کو مغربی افریقی دولت مند ملکوں سے ملانے والے تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ مراکش کے صحرائی علاقوں میں اٹھی۔ یہاں کے بربر لوگ ساتویں صدی میں شمالی افریقہ کی فتح کے بعد کی صدیوں میں مسلمان ہوئے تھے۔ گیارھویں صدی تک تقریباً تمام بربری قبائل مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن وہ بس نام کے مسلمان تھے۔ ان کے عقائد ورسوم میں قبلِ مسیح کے بہت سے عناصر موجود تھے۔ قبل از اسلام کے قبائلی اتحاد بڑے مضبوط تھے اور، قبل از اسلام کے جزیرہ نما عرب کے قبائل ہی کی طرح باہمی دشمنی کا بھی وہی حال تھا۔ گیارھویں صدی کے وسط میں ایک بربر ماہرالٰہیات عبداللہ ابن یٰسین نے بربر قبائل کو روایتی اسلامی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کام کیا۔ اس نے اپنی تحریک کو مرابطین کا نام دیا جس کا مطلب ہے "سختی سے پکڑے رکھنے والے"۔ اس کا حوالہ قرآن کی وہ آیت ہے جس میں اللہ کے راستے کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہسپانوی اور انگریز مورخین نے اس نام کو بگاڑ کر اموراوی کر دیا۔ آج وہ اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ تحریک اپنی اصل میں بڑی سادہ تھی اور، اسی لیے بہت مقبول بھی ہوگئی۔ ابن یٰسین نے اعلان کیا کہ مرابطیوں کے تین بنیادی اہداف ہیں، راست بازی کا فروغ، ناانصافی کو روکنا اور غیر اسلامی ٹیکسوں کو ختم کرنا۔

پوری گیارھویں صدی میں مرابطی تحریک دن دوگنی رات چوگنی رفتار سے پھیلی اور یہ پھیلاؤ کسی طرح بزورِ شمشیر نہ تھا۔ مرابطیوں کے بنیادی پیغام اور سادہ طرزِ زندگی میں بربروں کے لیے بڑی کشش تھی۔ اس میں پیغمبر حضرت محمدؐ کے اصل پیغام کی سادگی اور راستی کی جھلک تھی۔ جس طرح ساتویں صدی میں بہت سے عرب قبائل نے رضا کارانہ اسلام قبول کر لیا تھا، بہت سے بربر قبائل بھی مرابطی کنفیڈریشن میں شامل ہوگئے۔ بارھویں صدی کے نویں عشرے تک یہ تحریک شمالی افریقہ سے مغربی افریقہ میں گھانا کے خوشحال علاقوں تک پھیل چکی تھی۔ اس کے صحارا سے باہر تک تیزی سے پھیلنے کا مطلب تھا کہ یہ مسلم سپین سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جہاں اندلس میں مسلم تہذیب سینکڑوں برس سے موجود تھی وہاں مرابطیوں کو ابھی دولت اور شہری آسائشوں نے آلودہ نہیں کیا تھا۔ بربر جنگجو سخت جان تھے اور لڑنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کی یہ خوبیاں اندلس کے طائفہ بادشاہوں سے پوشیدہ نہ تھیں۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پس اگر ایک ان میں دوسرے پر ظلم کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔

القرآن 9:49

جب عیسائی استرداد نے مسلم سپین کو خطرے میں ڈالا تو طائفہ بادشاہوں نے ان سے مدد مانگی۔ گیارھویں صدی کے آخر میں کاسٹائل کے الفانسو پنجم کی زیرِ قیادت ایک عیسائی لشکر سپین کے سیاسی اسلام کے اہم مرکز سیوائل تک آ گیا۔ سیوائل کے طائفہ بادشاہ اور باہم دست و گریبان دیگر رہنماؤں نے مسیحی دشمن کے خلاف اور مسلم وحدت کے نام پر مرابطیوں کو بلا بھیجا۔ 1086ء میں یوسف بن تاشفین کی زیرِ قیادت بارہ ہزار مرابطی سپاہیوں نے آبنائے جبرالٹر پار کی۔ 375 سال پہلے مسلمانوں نے آئبیریا پر مسلم تسلط کے لیے یہی آبنائے ابن زیادؒ کی قیادت میں عبور کی تھی۔ یوسف بن تاشفین اسی تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے آ رہا تھا اور یہ مہم فتوحات کی غرض سے نہ تھی۔ ابن تاشفین پہلے سے موجود اندلسی بادشاہوں کی درخواست پر آ رہا تھا۔ اس کا مقصد علاقے کو مرابطی سلطنت میں شامل کرنا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی فوج سیوائل سپاہیوں سے مل کر اکتوبر 1086ء میں Badajoz کے قریب جنگِ ذلاقہ (Zallaqa) میں الفانسو کی فوج سے ٹکرائی۔ اس متحدہ فوج کو کاسٹائل والوں پر فیصلہ کن فتح ہوئی۔ الفانسو کو اپنے زیرِ تسلط علاقوں سے پسپا ہونا پڑا اور یوں بچا کھچا مسلم سپین وقتی طور پر بچا لیا گیا۔ اگرچہ ابن تاشفین نے واضح بالادستی حاصل کی تھی لیکن اس نے اپنی فتح کو زیادہ موثر بنانے کے لیے مزید فتوحات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بجائے وہ اپنی زیادہ تر فوج لے کر واپس شمالی افریقہ چلا گیا جہاں اندلس کے طائفہ جیسی پیچیدہ صورتحال موجود نہ تھی۔

حالانکہ اندلس پر حکومت کرنے والے مرابطی غیر ملکی اقلیت تھے لیکن وہ بڑے مقبول تھے۔ مقامی مسلم علماء کو حکومتی عہدوں پر فائز کرنے اور ٹیکس کی شرح کم رکھنے کی وجہ سے عام لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔

مرابطی بھی اپنے شمال کی سیاست اور اس کے تنازعات سے دامن نہ بچا سکے۔ 1088ء میں یوسف ابن تاشفین کو الفانسو کے خلاف مدد کے لیے دوبارہ بلایا گیا۔ ظاہر یہی کیا گیا کہ اسے بلانے کا مقصد مختلف طائفہ بادشاہوں کی افواج اور مرابطیوں کو ملا کر ایک متحدہ مسلم فوج تیار کرنا ہے۔ لیکن اس بار کی مہم جوئی تاشفین کے لیے حوصلہ شکن تھی۔ طائفہ بادشاہوں کی وجہ سے اس مہم کو جابجا رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ طائفہ بادشاہ ایک دوسرے کے خلاف تاشفین کے کان بھرتے اور اپنے اس معاون کو پریشان کرتے تھے۔ یہ مہم ناکام رہی اور تاشفین ایک بار پھر افریقہ لوٹ گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ اندلسی سیاسی معاملات میں نہیں الجھے گا۔

طائفہ اندلس اپنی ساخت میں کمزور تھا اور بادشاہوں کی باہمی رقابت نے معاملات اور بھی بگاڑ دیے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر الفانسو ششم کو اسلامی آئبیریا کی بقاء کے لیے خطرہ بن جانا تھا۔ شکست سے بچنے کے لیے ایک بار یوسف ابن تاشفین اور مرابطیوں سے مدد کی درخواست کی گئی۔ تاشفین اس بار اندلس آیا تو اس کے پاس امام غزالی جیسے جید عالم کا فتویٰ موجود تھا۔ امام صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ اندلسی حکمران بدعنوان ہیں اور حکومت کے لیے نااہل ہیں چنانچہ انھیں اقتدار سے الگ کر دینا چاہیے۔ 1090ء میں مرابطیوں نے اندلس فتح کرنا شروع کیا۔ طائفہ عہد کے خاتمے کی اس مہم میں یوسف خود فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے طائفہ بادشاہ اپنے علاقے مرابطیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کچھ تو مرابطیوں کے خلاف مزاحمت کے لیے عیسائی بادشاہتوں کے حلیف بن گئے۔ اس طرزِ عمل نے علماء کے اس موقف کو تقویت دی کہ طائف بادشاہوں کی دلچسپی فقط ذاتی مفادات میں ہے اور انھیں اسلامی دنیا کے دفاع سے کچھ غرض نہیں۔ اندلس میں عام لوگ مرابطیوں کے حق میں اٹھ کھڑے ہوے۔ ان کی قیادت سابقہ عظمت کی بحالی کے نام پر مقامی علماء کر رہے تھے۔ اس طرح اندلس کے مسلم علاقوں کی یوسف ابن تاشفین کو منتقلی کے دوران نسبتاً کم خون ریزی ہوئی۔ طائف بادشاہوں کو سبکدوشی کے بعد ایک ایک کر کے شمالی افریقہ بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کے گھٹیا تنازعات اندلس کی تقسیم کا سبب نہیں بن سکتے تھے۔ دس سال کے اندر اندر سوائے زاراگوزا کے تمام اندلسی ریاستیں مرابطیوں کی مطیع ہو چکی تھیں۔ لیکن زاراگوزا کے بادشاہ نے بھی عقلمندی دکھائی، مرابطی

برتری کو تسلیم کیا اور ان کے ساتھ معاہدے کیے۔ گیارھویں صدی کے آخر میں اندلس سے گھانا تک کے 3000 کلومیٹر تک پھیلی سلطنت کے ساتھ وہ دنیا کے طاقتور ترین لوگوں میں شامل تھا۔

شروع میں حیرت ہوتی ہے کہ اندلسوں نے اندلس پر مرابطی تسلط کیونکر برداشت کر لیا۔ معمول کے حالات میں تو 400 سال پرانی اور مستحکم جمی جمائی تہذیب کو اسلام کی تعبیر میں خانہ بدوش بربروں کی مزاحمت کرنا چاہیے تھی۔ لیکن یہاں ہمیں اسلامی تاریخ میں کئی بار سامنے آنے والے منفرد چلنوں میں سے ایک دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب بھی مسلم دنیا کا کوئی حصہ سیاسی ٹوٹ پھوٹ سے گزرتا ہے یا اس پر حملے کے خطرات منڈلاتے ہیں تو انھیں اسلامی وحدت کے جھنڈے تلے کسی ایک رہنما کے گرد اکٹھے ہونے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ اسلام کی اس بعید مغرب سرزمین کی مثال صلیبی جنگوں کے دوران دہرائی گئی جب مصر اور شام صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں متحد ہو گئے۔ اسی طرح چودھویں صدی میں Beylik یعنی بے کی عملداریوں کا ترک سلطنت میں انجذاب بھی اسی رویے کی مثال ہے۔ اہلِ اندلس کے لیے غیر ملکی زبان اور خیالات کے باوجود بربر زیادہ قابلِ برداشت تھے۔ ان کے مقابلے میں ہسپانوی عیسائی تو اندلس سے خود اسلام کو نکال دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ خالص اور عملی اسلام سے رجوع کا مرابطی پیغام، غیر منصفانہ قوانین کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی کم شرح نے بھی بربری حکومت کو عامتہ الناس میں مقبول کر دیا۔

اندلس میں تمام تر مقبولیت اور کامیابی کے باوجود مرابطی بھی سلطنتوں کے قدرتی عروج وزوال سے محفوظ نہ رہے۔ یوسف ابن تاشفین کی قیادت میں مرابطیوں نے آئبیریا کے زیادہ تر مسلم علاقوں کو شامل کر کے اپنی سلطنت کو پھیلایا اور اسے بین البراعظمی بنا دیا لیکن وہ عیسائیوں کے قبضائے ہوئے علاقے حاصل نہ کر سکے۔ ٹولیڈو، جو کبھی عظیم مسلم شہر ہوا کرتا تھا، ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ عیسائی بادشاہتوں کو بھی فقط روکا جا سکا لیکن وہ ختم نہ ہوئیں۔ یوسف ابن تاشفین کا بیٹا علی (دورِ حکومت 1106ء تا 1143ء)، اپنے باپ کے برعکس صحرا میں ہونے والی نشوونما اور تربیت سے محروم رہا۔ اس کی خواہشات اور ارادے بہتر لگتے تھے لیکن اس میں جنگ وجدل کے ذریعے سلطنت کو پھیلانے کی وہ اہلیت نہیں تھی جو اس کے باپ کی خاصیت تھی۔ جب مسلمان گیارھویں صدی کے اواخر میں اندلس

میں داخل ہوئے تو ان کی مقبولیت کا بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے عیسائی ریاستوں کو پھیلنے سے روکا۔ جب مرابطیوں کی فوجی قوت کو زوال آیا اور عیسائی فوجیں بارھویں صدی میں ایک بار پھر میدانِ جنگ میں کامیابیاں حاصل کرنے لگیں تو اندلس میں ان کے موجود ہونے پر سوال اٹھنے لگے۔ حتیٰ کہ امویوں کے پرانے دارالحکومت قرطبہ میں ان کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ لوگ شہر پر حکومت کرنے والے ناقابلِ رسائی غیر ملکیوں سے اکتا گئے تھے۔

لیکن مرابطین کا اصل زوال شمالی افریقہ سے شروع ہوا جہاں سے یہ لوگ اٹھے تھے۔ مرابطیوں کے دارالحکومت مراکش پر سایہ فگن پہاڑ جبل الاطلس کے سلسلے میں بربر مسلمانوں کی ایک اور مذہبی تحریک شروع ہوئی۔ وہ خود کو موحدین یعنی توحید کے پیروکار کہتے تھے۔ اس تحریک کا سربراہ ابن تومرت (Tumart) تھا۔ ان کا پرچار تھا کہ مرابطی اسلام کے صحیح اعمال سے ہٹ گئے ہیں، انھیں اندلس کی عیش وعشرت نے بدعنوان، آسائش پسند اور کاہل کر دیا ہے۔ موحدی تحریک نے یہ مضبوط الہیاتی موقف بھی اختیار کیا کہ اندلس اور شمالی افریقہ میں بدعات (مذہب میں اضافے) بری طرح پھیل رہی ہیں۔ بارھویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں مرابطیوں کے سابقہ حلیف قبیلے اپنی وابستگی بدل کر موحدین کے ساتھ منسلک ہونے لگے۔ وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ انھوں نے 1147ء میں مرابطیوں کو کھل کر چیلنج دیا، پہاڑوں سے نیچے اترے اور مراکش پر کامیاب حملہ کیا۔ ایک سال کے اندر وہ پورے ملک پر قابض ہو گئے۔

جب مرابطی افریقہ میں موحدین کے ساتھ الجھے ہوئے تھے تو وہ اندلس کے عسکری معاملات سے غافل ہو گئے۔ ان کی غفلت اور عام لوگوں میں بے چینی نے مل کر ایک بار پھر طائفہ دور کو زندہ کر دیا جس کا آغاز 1144ء سے ہوا۔ ایک بار پھر اندلسی مسلمان متحارب بادشاہتوں میں بٹ گئے۔ ہر فریق کی کوشش تھی کہ دوسری مسلمان ریاست کی قیمت پر اپنا اقتدار مضبوط بنا لے۔ ان تنازعات سے عیسائی ریاستیں ہی فاتح ثابت ہوئیں۔ عوام الناس مرابطیوں کو تو واقعتاً ہٹانا چاہتے تھے لیکن لگتا ہے کہ وہ کوئی معقول اور مناسب متبادل سامنے لانے کے اہل نہ تھے۔ وہ اب بھی ہتھیار اٹھانے اور جہادی افواج کے ساتھ مل جانے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ پہلے طائفہ دور کی طرح اس دوسرے طائفے کے

بادشاہوں کو بھی عیسائی بادشاہتوں کی فوجی مدد پر انحصار کرنا پڑا اور اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔

یوسف ابن تاشفین اور طارق بن زیادؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ابن تومرت کے جانشین عبدالمومن کی قیادت میں 1145ء میں موحدی طائفہ مسلم ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لیے اندلس میں داخل ہوا۔ ان کا حملہ عین اس وقت ہوا جب عیسائی پرتگیزی اور ہسپانوی بادشاہوں نے مسلم طائفوں کی طرف پیش قدمی شروع کی تھی۔ ایک سال کے اندر موحدی ملاگا (Malaga) اور سیوائل لے چکے تھے۔ 1150ء تک قرطبہ اور جیان (Jaen) بھی طائفہ بادشاہوں سے لیے جا چکے تھے۔ عبدالمومن کی وفات 1163ء میں ہوئی۔ تب تک سارا مسلم سپین موحدی ریاست میں ضم کیا جا چکا تھا۔ سپین کے مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ جزیرہ نما کا جنوبی حصہ ان کی دسترس سے بچ گیا۔ جزیرہ نما آئبیریا کے وسطی میدان اور مشرقی ساحلی ریاستیں ان کی مضبوط گرفت میں تھے۔ ان ریاستوں کی قیادت کاسٹائل، پرتگال اور اراگون (Aragon) کے پاس تھی۔ اموی دور میں ہسپانوی مسلمانوں کی بنائی سلطنت اور دیگر کارناموں کی صرف یاد باقی رہ گئی تھی۔ اس وقت تک اندلسی مسلمانوں پر واضح ہو گیا تھا کہ وقت کا دھارا عیسائیوں کے حق میں ہے اور اب ان کی اصل ترجیح بڑے بڑے شہر بسانا اور علم و ہنر کو ترقی دینا نہیں بلکہ عیسائی ابتلاء کے سامنے اپنا وجود باقی رکھنا ہے۔

موحدین کی آمد نے اسلامی احیاء کے خیال کو حوصلہ دیا۔ اندلسیوں نے ایک بار پھر اسلامی تعلیمات سے رجوع کیا۔ اس دور میں جزیرہ نما میں بہت سے علماء کا سامنے آنا اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ ان میں سے نمایاں ترین ابن رشد (1126ء تا 1198ء) ہے جسے باقی یورپ میں ایوروس (Averroes) کہا گیا۔ ابن رشد مسلم زریں دور کے علماء کی یاد دلاتا ہے۔ اس جامع العلوم شخص نے فلسفہ سے فزکس اور نفسیات تک بہت سے موضوعات پر لکھا۔ اس کا سب سے دیرپا کام فقہ پر ہے۔ شمالی افریقہ اور اندلس کی اکثریت کی طرح ابن رشد بھی مالکی تھا لیکن اس نے **بدایة المجتهد و نهایة المقتصد** کے نام سے تقابلی فقہ کا ایک انسائیکلوپیڈیا لکھا۔ اسلام میں مختلف فقہی مکاتب کے مابین آرا کے اختلاف پر اسے صدیوں تک مبسوط ترین کتب میں سے ایک مانا جاتا رہا۔ ابن عربی اور ابوالحسن الشاذلی جیسے صوفیاء بھی موحدین کے عہد میں سامنے آئے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے

تعلقات روحانی سطح پر بہتر بنائیں۔ ان صوفیا کی مقبولیت جزواً شمالی افریقہ اور اندلس کی تاریک سیاسی صورتحال کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔

موحدین کے طور طریقے بھی زیادہ تر مرابطیوں کے سے تھے۔ دونوں تحریکیں مراکش کے سخت صحرائی ماحول کی پیداوار تھیں۔ دونوں نے جس طرزِ عمل کو معاشرتی برائی اور سیاسی کمزوری خیال کیا، اسے ٹھیک کرنے کے لیے کام کیا۔ دونوں نے آئبیریا میں عیسائی استرداد کو وہ علاقے دوبارہ فتح کرنے سے روک لیا جو مسلم بادشاہتوں کا حصہ بن گئے تھے۔ دونوں تحریکیں وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی چلی گئیں۔ اس لیے کہ آنے والی نسلوں میں وہ تحریک اور قوتِ ارادی موجود نہ تھیں جو شمالی افریقہ کی صحرائی نشوونما نے ان کے اجداد میں پیدا کر دی تھی۔ جب موحدین میں اختیارات کے تنازعے سامنے آئے تو انھیں بھی زوال آ گیا۔ بارھویں صدی کے اواخر میں اندلس خانہ جنگی کا شکار ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ عیسائی بادشاہتوں کی پیش قدمی بھی جاری رہی۔ لیکن اب موحدین کی جگہ لینے کے لیے کوئی بربر تحریک سامنے نہ آئی۔

غرناطہ

سپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی کمزوری اور باہمی پھوٹ سے اسی طرح فائدہ اٹھایا جیسے وہ سینکڑوں سال سے اٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ پوپ انوسنٹ سوم (Innocent III) نے اہلِ یورپ سے کہا کہ وہ متحد ہو کر موحدین پر حملہ کریں۔ 1212ء میں ہسپانوی، پرتگالی اور انگریز نائٹ سیرا مورینا (Sierra Morena) پہاڑی سلسلے کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ پہاڑی سلسلہ آئبیریا کے مسلم اور عیسائی علاقے کی سرحد پر واقع تھا۔ کاسٹائل کے الفانسو ہشتم کی قیادت میں عیسائی فوج ایک پہاڑی درے میں سے گزر کر مسلم فوج پر حملہ آور ہوئی۔ اس جنگ میں، جسے مسلمانوں نے العقاب کا نام دیا، مسلم فوج پوری طرح تباہ ہو گئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ کے جانی نقصان کا مطلب تھا کہ اندلس میں موحدین کی کمر ٹوٹ گئی۔

جنگ ہار جانے کی وجوہات اتنی اہم نہ تھیں جتنے اہم اس کے نتائج و عواقب ثابت ہوئے۔ عیسائی حملوں کی مزاحمت کے اہل نہ ہونے کے باعث مسلم شہر ایک ایک کر کے شکست کھانے لگے۔

1228ء سے 1248ء تک ویلنشیا، سیوائل، بطلیوس (Badajoz)، مایورکا (Majorca)، مرسیہ (Murcia) اور خاین (Jaen) عیسائی حملوں کی نذر ہو گئے۔ 1236ء میں کاسٹائل نے مسلم سپین کا اولین دارالحکومت قرطبہ فتح کر لیا۔ عظیم مساجد، کتب خانوں اور باغات سے مزین یہ شہر کاسٹائلی فوج کی مزاحمت نہ کر سکا۔ عظیم مسجد قرطبہ کیتھولک کیتھڈرل میں بدل دی گئی۔ اس کی عمارت کے صحن میں چیپل بنا دیا گیا۔ اس مسجد کی عمارت کا اصل خاکہ، کعبہ رخ محراب، اور قرآنی آیات سے منقش صحن اسی طرح رہا اور بتاتا رہا کہ یہ کبھی مسلم عبادت گاہ ہوا کرتی تھی۔ سولھویں صدی میں ہولی رومن ایمپائر کے ایک شہنشاہ نے اس مسجد کو چرچ میں بدلنے پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے تبصرہ کیا تھا کہ ایسی منفرد خوبصورتی کی حامل عمارت کو ایک عام سی عمارت میں بدل دیا گیا۔

لیکن موحدین کے زوال کے بعد بھی اندلس کا کچھ حصہ باقی بچ گیا۔ آئبیریا کے جنوبی ساحل کے ساتھ لگتی غرناطہ کی امارت عیسائی تسلط سے باہر رہی۔ غرناطہ میں بنونصر حکومت میں آئے اور انھوں نے مزید دو سو سال تک اس عرب سلطنت کو برقرار رکھا۔ یہ لوگ اپنا شجرہ بنوخزرج سے جا ملاتے تھے۔ حضرت محمدؐ کو 622ء میں مدینہ سے نکالا گیا تو انھیں مدینہ میں خوش آمدید کہنے والے دو قبیلوں میں سے ایک بنوخزرج تھا۔ اپنے اجداد کی طرح ہجرت کے 600 سال کے بعد، بنونصر نے بھی عیسائی آئبیریا سے نکالے گئے حضرت محمدؐ کے ماننے والوں کو پناہ دی۔ حضرت محمدؐ کی ہجرت جزیرہ نما عرب میں مسلم اقتدار کا آغاز ثابت ہوئی تھی۔ اس کے برعکس غرناطہ میں باقی آئبیریا سے مسلمانوں کی آمد سے مسلم حکومت کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ یہ اندلس کی آخری مسلم ریاست تھی۔

لیکن بنونصر کا غرناطہ حقیقی معنوں میں آزاد ریاست کبھی نہ رہا۔ وہ کاسٹائل والوں کے باجگزار بن گئے۔ اس طرح انھوں نے غرناطہ کو کاسٹائل کے قبضے سے بچا لیا۔ موحدین کے زوال کے بعد اپنی اپنی بقاء کے لیے باہم متصادم اور دست و گریباں طائفہ ریاستیں اسی پہلے والی گندی سیاست میں پڑ گئیں۔ اس طرح کی بے اتفاقی کا نتیجہ تھا کہ غرناطہ کو کاسٹائل والوں کے لیے اپنی افادیت ثابت کرنا پڑی اور یوں وہ اس کے قبضے میں جانے سے بچ پایا۔ بنونصر نے مغربی افریقہ میں واقع مالی کی کانوں سے آنے والے سونے کا ایک حصہ بطور باج اور بوقت ضرورت فوجی مدد دینے کا وعدہ بھی

کیا۔ یہ نظام اندلس میں شمال کی عیسائی ریاستوں کو مضبوط سے مضبوط تر اور اندلس اور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں کو کمزور تر کرتا چلا گیا۔ وسط تیرھویں صدی میں کچھ اندلسی شہروں پر عیسائی فتح میں بنونصر کی مدد بھی شامل تھی۔ غرناطہ کی معیشت پر بھی غیر ملکی عیسائیوں کی گرفت تھی۔ مثال کے طور پر یورپ کو ہونے والی برآمدات پر اٹلی کی ابھرتی شہری ریاستوں کا تسلط تھا۔ باقی مسلم دنیا سے دوطرفہ تجارت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غرناطہ کے تیزی سے کم ہوتے وسائل سے صرف یورپی عیسائیوں کو فائدہ ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا نظام تا دیر نہیں چل سکتا تھا۔

حالانکہ اندلس کے طویل اور پرشور اختتام کے بعد اسلام آئبیریا کے ایک جنوبی کنارے سے چمٹا رہ گیا تھا لیکن فنِ تعمیر میں شکوہ اور حسن کی اسلامی روایت اپنا اظہار مسلم سپین کی آخری یادگار میں کیے بغیر نہ رہ سکی۔ الحمرا اصل میں ایک قلعہ بندی تھی جو شہر پر چھائی ایک چٹان پر بنی تھی اور بنونصر کے زمانے تک سینکڑوں سال سے دفاعی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ امیر غرناطہ نے اس قلعہ بندی کو وسعت تزئین و آرائش کے بعد ایک محل بنا دیا۔ باقی اندلس سے مسلمانوں کی آمد جاری رہی اور یہ عمارت مسلم سپین کی جمالیاتی تاریخ کی تجسیم بن گئی۔ اس میں بنوامیہ کی نعل نما محرابیں، مرابطیوں اور موحدین کے ہندسی نمونے، غرناطہ والوں کی جدتیں اور ہسپانوی مسیحی فنِ تعمیر ملا کر استعمال کیا گیا اور اس طرح سپین کی مسلم تعمیرات میں سے شاہکار وجود میں آیا۔ اس کے باغات، فوارے اور برآمدے مل کر وہ ماحول بناتے تھے جو قرطبہ اور سیوائل جیسے مفتوح مسلم شہروں کے باغات کی یاد دلاتا تھا لیکن الحمرا فقط پرانی یادگاروں کی نقلوں کا مجموعہ نہیں تھا، اس کا اپنا ایک نیا انداز بھی تھا جس کی نقل یورپ اور مسلم دنیا دونوں میں کی گئی۔ کاسٹائلیوں نے الحمرا کے فوراً بعد الکازار (Alcazar) کے نام سے ایک شاہی محل سیوائل میں بنایا۔ اس میں باغوں، صحنوں اور محرابوں سمیت ہر چیز بنونصر کے محل کی نقل تھی۔ پورے شمالی افریقہ میں بننے والے سکول اور مساجد میں الحمرا کے اثرات ملتے ہیں۔ فنِ تعمیر کے اس ورثے نے صدیوں کئی براعظموں پر اپنے اثرات ڈالے۔ الحمرا کی سب سے حیران کن شے غالباً امارت غرناطہ کا موٹو ''ولا غالب الا اللہ'' ہے جسے اس کی دیواروں پر ابھارا گیا ہے۔ اندلس کی عظیم الشان تہذیب کی باقی رہ جانے والی یادگار کے لیے یہی نعرہ موزوں ترین تھا۔ جب غیر محفوظ

غرناطہ کو دشمن افواج نے گھیرا تو بھی یہ موٹو مومنوں کو اس قادر مطلق پر ایمان کی یاد دلاتا رہا جو جزیرہ نما میں ان کے زوال کے باوجود ناقابلِ شکست ہے۔ شاید سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ 1492ء میں جب فاتح عیسائی بادشاہوں نے محل پر قبضہ کیا تو خدا کی حتمی فتح کا آئینہ دار یہ موٹو دیواروں پر موجود رہا۔

جب غرناطہ اندلس کے تمدنی زریں دور کی معراج پر تھا تو گردوپیش کے حالات اسے کمزور کرتے ہوئے بالآخر انہدام کی طرف دھکیل رہے تھے۔ بنونصر کو شمال کی مسیحی کاسٹائلی ریاست سے مستقل خطرہ لاحق رہتا تھا۔ کاسٹائل کو جانے والا بھاری سالانہ خراج اسے طاقتور اور غرناطہ کو کمزور تر کرتا چلا جارہا تھا۔ اسی اثنا میں شمالی افریقہ میں بنومرین کی حکومت آگئی۔ غرناطہ کو اس سے بھی خطرہ لاحق تھا۔ مختصر یہ کہ غرناطہ ہر طرف سے خطروں میں گھر گیا۔

ان مشکل حالات کے باوجود غرناطہ عیسائی پیش قدمی کے سامنے ٹِک جانے کا اہل تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی راہ میں حائل پہاڑی سلسلوں اور اندرون ملک موجود جابجا قلعوں کی وجہ سے اس کا دفاع کافی مضبوط تھا۔ اسی لیے غرناطہ کی امارت، دیگر اندلسی امارتوں کے برعکس، مسیحی تسلط سے بچتی چلی آرہی تھی۔ بالآخر غرناطہ کا زوال بیرونی حملوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اندرونی اختلافات کی وجہ سے ہوا۔ پندرھویں صدی کی اسی کی دہائی درباری سازشوں اور اندرونِ خانہ پھوٹ کی دہائی تھی۔ 1482ء میں امیر غرناطہ ابوالحسن کے بیٹے ابوعبداللہ محمد دوازدہم (XII) نے اپنے باپ کا تختہ الٹا اور اسے جلاوطن کر دیا۔ اہلِ غرناطہ اسے ''بوبدل'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ غرناطہ کے عالموں نے اسے خدا کا باغی قرار دیا۔ اسی کے اعمال تھے کہ آئبیریا کا سیاسی اسلام مسلسل زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔

جیسے ہی وہ اپنی فوجوں کو لے کر اپنے باپ کے خلاف لڑنے کے لیے بڑھا، کاسٹائلیوں نے غرناطہ پر قبضے کے لیے چڑھائی کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ مسلم نااتفاقی اور عیسائیوں کی زیادہ بہتر آرٹلری کی بدولت پورے غرناطہ کے تزویراتی اعتبار سے اہم قلعے عیسائی قبضے میں چلے گئے۔ 1453ء میں عثمانیوں نے توپ خانے کی مدد سے قسطنطنیہ فتح کیا اور اسلام کو مشرقی یورپ میں داخل کیا تھا۔ عیسائیوں نے چند دہائیوں کے بعد اسی ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے اسلام کو مغربی یورپ سے

بے دخل کر دیا۔ اس کے علاوہ اندلس کی پوری تاریخ میں حالات جب بھی عیسائیوں کے لیے ساز گار ہوئے تھے شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے اپنے ہم مذہبوں کو بچایا تھا۔ لیکن پندرھویں صدی کے اواخر میں اس طرح کی معاونت بھی نہ ملی۔ شمالی افریقہ میں جاری خانہ جنگی کی وجہ سے حکمران اپنے اپنے مسائل سے دوچار تھے۔ علاوہ ازیں کاسٹائلی سفارتکاری نے بھی انھیں اندلسی معاملات میں دخل اندازی سے روکے رکھا۔ غرناطہ والوں نے مصر کے مملوکوں سے بھی مدد مانگی لیکن انھوں نے بھی فقط علامتی مدد کی پیش کش کی۔ غرناطہ والوں کو اپنی خانہ جنگی سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ عیسائی فوجوں کے خلاف بھی کچھ چارہ کرنا تھا۔ دونوں کام اپنے وسائل سے اور بیک وقت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔

محمد ہفتم کی قیادت نے غرناطہ والوں کے مصائب میں اضافہ ہی کیا۔ اسے 1486ء میں کاسٹائلیوں نے گرفتار کر لیا۔ اس کی قید کے دوران اس کے باپ نے دوبارہ تخت سنبھال لیا۔ محمد ہفتم کو ایک سال تک قید رکھا گیا اور پھر عیسائی ریاست کے ساتھ وفاداری کے وعدے پر رہا کر دیا گیا۔ کاسٹائلیوں کے فراہم کردہ ہتھیاروں اور فوجیوں کی مدد سے اس نے ایک بار پھر امیر ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ غرناطہ میں خانہ جنگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس بار محمد ہفتم نے اپنے چچا کے خلاف جنگ کی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے چچا اور کاسٹائلیوں کے درمیان جاری جنگ سے باہر رہے گا۔ تب تک کاسٹائلی غرناطہ کا زیادہ تر حصہ فتح کر چکے تھے۔ 1490ء تک غرناطہ پورے جزیرہ نما آئبیریا کا واحد شہر بچا تھا جس پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ محمد ہفتم کا کاسٹائلی ریاست کا حلیف ہونا بے معنی ہو چکا تھا۔ مشہور عیسائی حکمرانوں ازابیل (Isabella) اور فرڈی نینڈ (Ferdinand) نے کاسٹائل اور اراگان کا الحاق کرتے ہوئے جدید سپین کی بنیاد رکھ دی۔ اگرچہ انھوں نے ماضی میں محمد ہفتم کو مدد دی تھی لیکن انھیں ایک متحدہ مسیحی سپین کے اندر ایک مسلم شہر غرناطہ کو آزاد رہنے دینے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

1490ء اور 1491ء میں، سقوطِ غرناطہ سے ذرا پہلے، ہسپانویوں نے اس اکیلے شہر کو گھیر لیا۔ شہر کو جاتی رسد منقطع کر دی گئی۔ مضافات سے پناہ گزیں شہر میں داخل ہونے لگے۔ شہر کی آبادی سراسیمہ اور مایوس ہو گئی۔ شمالی افریقہ سے مسلم معاونت کے بغیر خود اپنے بل بوتے پر شہری تعداد میں زیادہ اور ٹیکنالوجی

میں برتر ہسپانویوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور محمد ہفتم یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے 25 نومبر 1491ء کو اپنا وزیر ہتھیار ڈالنے کی بات چیت کے لیے عیسائی بادشاہ کے پاس بھیجا۔ یکم جنوری 1492ء کو شہر باقاعدہ اور سرکاری طور پر سپین کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی صبح محمد الثانی عشر نے شہر اور الحمرا کی چابیاں فاتحین کے حوالے کر دیں۔ جب شہر کے باسی جاگے تو انھوں نے الحمرا پر لہراتا ''لاغالب الااللہ'' کے طغرے والا جھنڈا آخری بار اترتے دیکھا اور پھر کاسٹائلی جھنڈے نے اس کی جگہ لے لی۔ جزیرہ نما آئبیریا کو عیسائی بنانے کی صدیوں طویل جدوجہد میں کامیابی کا یہ لمحہ عیسائیوں کے لیے نشاط انگیز تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ اسلامی تاریخ کے ایک باب کا اختتام تھا؛ ایک ایسا باب جس نے دنیا کی سب سے زیادہ روشن خیال، خوشحال اور طاقتور ریاستیں دیکھی تھیں۔ جلاوطنی اس امیر کا مقدر ٹھہری جس کی سیاسی نااہلیت نے مسلم سپین کا یہ بچا کھچا ٹکڑا بھی کھو دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہر سے باہر جاتے راستے پر رک کر وہ مڑا، شہر پر ایک نظر ڈالی اور رونے لگا۔ اس کی ماں نے ڈانٹا اور یہ مشہور فقرہ کہا، ''جس کی حفاظت مردوں کی طرح نہیں کر سکے اس پر عورتوں کی طرح نہ روؤ۔''

مولدین

اندلس کی سیاسی تاریخ 1492ء میں ختم ہو گئی۔ لیکن سپین کی مسلم آبادی کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ سپین میں ستر تا اسی ملین کی کل آبادی میں پانچ سے سات لاکھ مسلمان سارے آئبیریا میں پھیلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد سب سے آخر میں گرنے والی ریاست غرناطہ میں تھی۔ کیتھولک بادشاہ کے لیے سپین کی آبادی کے اتنے بڑے حصے کو اچانک نکال دینا ممکن نہ تھا۔ پورے جزیرہ نما میں بہت سے علاقے تھے جن کی معیشت کا انحصار مسلم آبادی پر تھا۔ پھر سپین کی باقی آبادی اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ خالی ہو جانے والے شہروں کو آباد کر سکے۔ چنانچہ شروع میں ازابیلا اور فرڈی نینڈ نے اس اقلیت کے لیے برداشت کی حکمت عملی اپنائی۔ مسلمانوں کا وہ سماجی مرتبہ تو نہ رہا جو ان کے ہم مذہب حکمرانوں کے دور میں تھا لیکن انھیں نئی بادشاہت میں مرضی سے عبادت کی اجازت تھی۔

1492ء میں ہسپانوی حکومت نے اپنے علاقوں سے یہودی نکال دیے۔عثمانی سلطان بایزید ثانی نے اپنی فوج اور گورنروں کو حکم دیا کہ سپین سے آنے والے ہر یہودی کو خوش آمدید کہیں۔ان ہسپانوی یہودیوں کی اولاد پر مشتمل ایک قابلِ ذکر کمیونٹی بیسویں صدی میں بھی استنبول میں آباد تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ عیسائیوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش نہیں کی۔کوئی بھی مسلمان جو رضا کارانہ مذہب بدلتا اسے تحائف، سونے، گھوڑوں اور دیگر قیمتی اشیا سے نوازا جاتا تھا۔ اسی لیے 1492ء کے بعد کے سالوں میں کئی مسلمانوں نے مسیحیت اختیار کی۔لیکن عیسائیوں کو یہ دیکھ کر حیرت اور مایوسی ہوئی کہ مذہب تبدیل کرنے والے لوگ تحائف وغیرہ وصول کرنے کے کچھ عرصے کے بعد مساجد میں نماز ادا کرتے اور قرآن پڑھتے پائے گئے۔جب دیکھا گیا کہ مذہب کی تبدیلی کے لیے رکھی گئی مراعات زیادہ موثر نہیں یا مذہب کی تبدیلی بھی صدق دل سے نہیں ہوتی تو کیتھولک چرچ نے زیادہ سخت لائحہ عمل اپنانے کا سوچا۔ 1499ء میں ایک کیتھولک آرچ بشپ فرانسسکو خمینز دی سنیروس (Francisco Jiménez de Cisneros) کو خاص طور پر تعینات کیا گیا کہ وہ اندھا دھند دارو گیر، خوف و ہراس اور قید و بند سے کام لے کر تبدیلیٔ مذہب کی رفتار بڑھائے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں، ''اگر کافر راہ نجات کی طرف نہیں آتے تو انھیں اس طرف گھسیٹنا پڑے گا۔'' نتیجہ متوقع تھا۔سپین کے مسلمانوں نے اس جبر کے خلاف بغاوت کر دی۔غرناطہ کے مسلمانوں نے آٹھ سال عیسائی حکومت میں گزارے تھے لیکن وہ نئے بشپ کے مظالم برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔چنانچہ انھوں نے شہر کی تنگ گلیوں میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور ڈی سنیروس کی کوششوں سے سرکشی اختیار کی۔

اس بغاوت سے کیتھولک بادشاہت کو موقع مل گیا کہ سپین کے مسلمانوں کو سبق سکھائیں۔ مسلمانوں کو دو میں سے ایک راستے کا اختیار دیا گیا: عیسائی ہو جائیں تو باقاعدہ معاف کر دیا جائے گا یا پھر سزائے موت ہوگی۔ ہمیشہ کے عملیت پسند غرناطہ کے مسلمانوں نے عیسائی ہونا قبول کر لیا۔ غالب مسلم آبادی کے اس شہر میں بڑے پیمانے پر بپتسمہ دیا گیا۔گرد و پیش کے مضافات میں ہونے

والی بغاوتیں بھی اس انجام سے دوچار ہوئیں۔ 1502ء میں جب بغاوتوں کو دبایا جا چکا تو عیسائی حکمرانوں نے پورے سپین میں اسلام کو غیر قانونی قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ تمام مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ مذہب بدل لیں، ملک چھوڑ دیں یا موت قبول کر لیں۔ غرناطہ کے لوگوں کی طرح پورے سپین کے مسلمانوں نے مذہب بدل لیا۔ سپین کے حاکم بڑے فخر سے کہنے کے قابل ہو گئے کہ انھوں نے چند سالوں میں ایک پوری قوم کو عیسائی بنا لیا ہے۔

تاہم سپین میں اسلام زیرِ زمین زندہ رہا۔ سپین والوں نے ان مفروضہ سابقہ مسلمانوں کو Moriscos یا مولدین کا نام دیا۔ انھوں نے مسلسل دارو گیر اور پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لیے عیسائیت کا اقرار کیا لیکن اندرون خانہ خفیہ طور پر بطور مسلم زندگی گزارتے رہے۔ سپین کی حکومت کو بھی شک تھا کہ قبول عیسائیت میں مولدین مخلص نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے احتساب کے لیے کئی قوانین بنائے۔ سولھویں صدی کے اوائل میں کام کرنے والی ان احتسابی عدالتوں کا مقصد مولدین کو ان کے سابقہ مذہب سے پوری طرح پاک کرنا تھا۔ 1511ء میں جانوروں کا اسلامی ذبیحہ منع کر دیا گیا۔ 1513ء میں عورتوں کے لیے چہرے کا نقاب ممنوع قرار پایا۔ 1523ء میں مسلمانوں کی طرح کے کپڑے پہننے پر پابندی لگائی گئی۔ مولدین پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ جمعہ کے روز حمام استعمال نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنے گھروں کے دروازے بند رکھ سکیں گے کہ مبادا وہ عبادت نہ کرنے لگیں۔ شادی کی تقریبات میں "پرانے عیسائیوں" کی شرکت لازمی قرار پائی تاکہ نکاح کی اسلامی رسوم ادا نہ کرنے کو یقینی بنایا جائے۔ 1526ء میں عربی بولنے پر پابندی لگا دی گئی۔ قانون بنا کہ مولدین ہر وقت، گھروں میں بھی، کاسٹائلی زبان بولیں۔ مولدین کو ان کے مذہبی اور ثقافتی ورثے سے محروم کرنے کی کوشش نے انھیں اپنے عقائد پر اور بھی پختہ کر دیا اور وہ مزید زیرِ زمین ہو گئے۔

مختصراً یہ کہ احتسابی عمل زیادہ تر مولدین کے دل سے اسلام کو نہ نکال سکا۔ اس کی بجائے وہ ان قوانین سے بچنے کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔ بہت سے مسلم علماء نے فتوے دیے کہ وہ حکومتی نگاہوں سے پوشیدہ رہنے کے لیے عبادات غیر روایتی انداز میں کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ الجیریا کے علاقے وہران (Oran) کے مفتی نے 1502ء میں مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ پانی سے وضو

کرنے کی بجائے کسی صاف دیوار کے ساتھ ہاتھ مس کر سکتے ہیں، نماز پنجگانہ کی بجائے رات کو ادا کر سکتے ہیں اور مجبور ہوں تو خنزیر کھا سکتے ہیں۔ ان ہدایات پر بھی گھروں میں ہی عمل ہو سکتا تھا کیونکہ مساجد اور مدرسے بند کر دیے گئے تھے یا پھر چرچوں میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ لیکن عربی زبان گھروں میں زندہ تھی۔ اس لیے کہ والدین بچوں کے لیے اسلامی عبادات اور قرآن کی تعلیم کو یقینی بناتے تھے۔ عیسائی ناموں والے مولدین اتوار کو چرچ جاتے، کیتھولک طریق پر رسومات بجالاتے، پھر گھر آتے، وہاں اپنے مسلم ناموں سے مخاطب کیے جاتے، قرآن پڑھتے اور اسلامی طریق پر عبادات کرتے۔

سپین کے حکمران مولدین کے خفیہ عقائد سے بے خبر نہیں تھے۔ غرناطہ فتح کرنے کے سو سال بعد بھی سپین کے حکمران اور چرچ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ مولدین کو عیسائی بنانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ احتسابی عدالت کے ہاتھوں عین اسلامی عبادات کے دوران پکڑے جانے اور سزا پانے والے مولدین کی تعداد بڑھتی گئی لیکن انھیں دی گئی سزا دوسروں کو سبق نہ سکھا سکی۔ فلپ سوم انتہا پسند چرچ کے زیرِ اثر تھا۔ 1609ء میں اس نے حکم دیا کہ سپین میں رہ جانے والے تمام مولدین کو ملک بدر کر دیا جائے۔ سپین بھر کی اشرافیہ کو یقین تھا کہ یہ اقدام ملکی معیشت کے لیے تباہ کن ہے۔ ان کے احتجاج کے باوجود شاہی حکم نامے پر اس سال کے آخر میں عملدر آمد کیا گیا۔

مولدین کے تمام دیہات خالی کروا لیے گئے۔ آبادی کو جبراً ساحل پر لے جایا گیا جہاں سارے یورپ کے جہاز انھیں شمالی افریقہ لے جانے کے لیے کھڑے تھے۔ انھیں کہا گیا کہ جو کچھ اٹھا سکتے ہیں، ساتھ لے جائیں۔ لیکن ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ چار سال سے کم عمر بچوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ انھیں ماں باپ سے لے لیا گیا تا کہ بطور عیسائی پروان چڑھایا جا سکے۔ یوں وطن بدر کیے جانے کا مطلب تھا کہ سپین میں بکھرے مسلمان اپنا مذہب ظاہر کر بھی دیں تو انھیں مزید نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔ انھیں سپین میں اسلام کے اظہار کا آخری موقع مل رہا تھا۔ سو سال کے بعد پہلی بار سپین کے پہاڑوں اور وادیوں میں اذان کی آواز سنائی دی۔ سپین میں اسلام کی شان و شوکت کا زمانہ گزر گیا تھا لیکن باغیوں نے اندلس کی 800 سالہ تاریخ میں اس کی یاد کو آخری بار تازہ کیا۔ یہ

اور بات ہے کہ وہ جلد ہی شکست کھا گئے۔ 1614 تک تمام مولدین جا چکے تھے اور تمام بغاوتیں کچلی جا چکی تھیں۔ اسلام سپین سے چلا گیا تھا۔ کچھ روایات ایسی بھی ہیں کہ کچھ مولدین کسی نہ کسی طرح سپین میں رکنے میں کامیاب رہے۔ وہ صدیوں تک اسلامی عبادات خفیہ طور پر ادا کرتے رہے۔ لیکن ان معدودے چند لوگوں کو اندلس کے سائے کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ جزیرہ نما آئبیریا اور باقی یورپ کی تاریخ میں اپنے مقام اور حصے کے باوجود سپین اسلام سے خالی ہو گیا۔ لیکن جب اسلام کا سورج اپنے مغربی افق پر غروب ہو رہا تھا تو مشرق میں اس کا احیاء ہو رہا تھا۔ عثمانیوں نے یورپ کو اسلام سے ایک بار پھر متعارف کروانا تھا اور ایک نئے عہدِ زریں کا آغاز کرنا تھا۔

نواں باب

کنارہ

(The Edge)

ایک بڑی اکثریت کچھ زیادہ ہی شدومد سے سمجھتی ہے کہ مشرق وسطیٰ ہی مسلم دنیا ہے اوراس سے ماسوا کچھ نہیں۔ بے شک اسلام کی ابتدا جزیرہ نما عرب میں ہوئی اور عظیم ترین اسلامی سلطنت کا ظہور بھی دریائے نیل اور دریائے آمو کے درمیانی خطے میں ہوا لیکن توجہ کو اسی خطے پر مرکوز رکھا جائے تو مسلم دنیا کی تاریخ کے بعض نہایت بھرپور باب نظرانداز ہو جائیں گے۔ اسلام اور باقی دنیا کے مابین تعلق، اپنی تمام تر پیچیدگی سمیت صحارا کے ساتھ لگتے افریقی علاقوں، چین اور جنوب مشرقی ایشیا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مغربی افریقہ

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی وفات کے چند عشروں کے بعد جب اسلام شمالی افریقہ میں آیا تو زیادہ تر اس کے ساحلی علاقوں تک محدود رہا۔ اپنے سے قبل کے رومیوں اور بازنطینیوں کی طرح مسلمانوں نے بھی بحیرہ روم کے ساتھ ساتھ لگتے شہروں میں آباد ہونے کو ترجیح دی۔ ان کے اس رجحان کی کچھ عملی وجوہات تھیں۔ ایک تو انھیں بحیرہ روم میں ہونے والی جہازرانی کے ساتھ رابطے میں رہنا تھا اور دوسرے یہ کہ صحارا میں زیادہ اندر جانے سے کسی تہذیبی مرکز کے پہنچنے کے امکانات معدوم ہو جاتے۔

شمالی افریقہ کے قیروان، طرابلس (Tripoli) اور طنجہ (Tangier) جیسے شہروں میں جو تہذیب پھلی پھولی وہ بربر اور عرب اثرات کا امتزاج تھی۔ یہ اثرات اسلام کے جھنڈے تلے ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ اس تہذیب کا مشرق وسطیٰ اور اندلس کی تہذیبوں سے قریبی تعلق تھا۔

بحیرہ روم کے ساحلوں پر واقع اپنے شہری مراکز سے اسلام صحارا کے اندر جنوب رخ نفوذ کرنے لگا۔ مغربی افریقہ میں پورے ماحول پر جھاڑی دار قطعات اور دریائے نائیجر (Niger) چھایا نظر آتا ہے۔ دریا کے شمال کا صحرائی علاقہ سوائے گھاس کے کچھ پیدا نہیں کرتا اور، اسی لیے، قائم رہنے کے قابل آبادیاں بسانے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس دریا کے، جنوب میں موجود گھنے جنگلات بھی آبادکاری کے اعتبار سے اسی طرح کے ہیں۔ اسی لیے، اسلام کی آمد سے پہلے اور بعد میں بھی، مغربی افریقہ کی زیادہ تر بادشاہتیں دریائے نائیجر کے گرد مجتمع تھیں۔ دریا کے اندرونی ڈیلٹا کی زمین زرخیز اور آبادکاری کے لیے خاص طور پر موزوں تھی۔ مسلمان بربروں کا ایک خانہ بدوش گروہ (Tuareg) شمالی افریقی شہروں سے نکل کر صحرائی خرابوں میں سے ہوتے ہوئے مغربی افریقی گھاس کے میدان (Savannah) تک کی شاہراہ پر غالب تھا۔ اس خطے میں ابھرنے والی بادشاہتوں کا صحارا میں سے گزرتے اس راستے پر انحصار تھا۔ یہاں کے سامان، بالخصوص نمک اور سونے کی منڈی تھا۔

اس تجارتی راستے سے صرف دولت ہی نہیں بلکہ اسلام بھی مغربی افریقہ آیا۔ صحرائی راستوں پر سفر کرنے والے مسلمان تاجروں نے مغربی افریقہ میں آباد ہونا شروع کیا اور گیارھویں صدی تک مسلم آبادیاں اس خطے کے شہروں اور قصبوں میں نظر آنے لگیں۔ چونکہ مغربی افریقہ میں موجود مسلمانوں کی اکثریت مبلغ نہیں بلکہ تاجر تھی چنانچہ مقامی آبادی میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار بہت سست تھی۔ عموماً یہ ہوتا کہ مغربی افریقہ کے لوگ مسلم ہو جانے کے بعد بھی نسلوں سے چلے آنے والے اپنے رواج اور عقائد پر قائم رہے اور اپنے جادوگروں کو بھی مانتے رہے۔ شمالی افریقہ کے برعکس، جہاں اسلام مضبوط سیاسی قوت کے طور پر اور یکدم چلا آیا، مغربی افریقہ میں اسلام آہستہ آہستہ مقامی تمدن میں نفوذ کرتا رہا۔ لوگوں کو تمام اسلامی عقائد پر ایمان لانے کا مطالبہ کیے بغیر بھی اسلام میں داخل کیا جاتا رہا۔ مرابطی تحریک کو اس سارے منظرنامے کا واحد استثنیٰ کہنا چاہیے۔ اس نے گیارھویں صدی میں ایک

عشرے کے لیے مغربی افریقہ کا کچھ علاقہ فتح کر لیا تھا لیکن لگتا ہے کہ کوئی دیرپا اثر نہیں ڈال سکے تھے۔

مغربی افریقہ میں پہلی مقامی مسلم حکومت مالی کی تھی۔ اس کی بنیاد تیرھویں صدی میں داستانوی کردار سونجاتا کیتا (Sundiata Keita) نے رکھی تھی۔ یہ مندینکا (Mandinka) قبائل کا جزوا مسلم حکمران تھا اور Lion King کے نام سے معروف تھا۔ داستان کے مطابق اسے کسی ظالم حکمران نے باہر نکال دیا تھا۔ جلاوطنی کے دوران اس نے مندینکا لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کی مدد سے وہ تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جو اس کا جائز حق تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے مانسا کا لقب اختیار کیا جس کا مندینکا میں مطلب ہے ''شاہوں کا شاہ''۔ کہانی کی جزئیات تو نسل در نسل کی زبانی تکرار میں دھندلا گئی ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ مغربی افریقہ میں نائیجر کے اندرونی ڈیلٹا میں قائم کردہ سونجاتا کی ریاست ترقی کرتے اس دور کی امیر ترین اور قوی ترین ریاستوں میں سے ایک بن گئی۔

مانسا موسیٰ کی حکومت 1312ء سے 1337ء تک رہی۔ اس دور میں مالی کی خوشحالی اپنے عروج پر تھی۔ مانسا نے اس وقت حکومت سنبھالی جب اس کا بھائی نئی زمینوں کی تلاش میں بحیرۂ اوقیانوس میں مغرب رخ ایک سفر کو روانہ ہوا۔ مانسا موسیٰ نے مالی کا اقتدار سنبھالا تو یہ مسلم دنیا کی سب سے دولت مند سلطنت تھی۔ جب مشرقِ وسطیٰ منگول حملوں کے نتائج و عواقب بھگتنے میں مصروف تھا اور اندلس میں صرف غرناطہ کی مسلم ریاست بچی تھی تو صحارا کے جنوبی سرسبز میدانوں میں مالی ابھرا اور خطہ کی بڑی سیاسی مسلم قوت بن گیا۔ لیکن یہ باقی مسلم دنیا سے بہت دور اور اوجھل تھا۔ اس دور کے مالی کے متعلق ہمیں جتنا معلوم ہے اس کا بڑا حصہ مانسا موسیٰ کے 1324ء کے حج احوال سے ماخوذ ہے۔ اس حج سے مسلم دنیا کو مالی کی دولت اور طاقت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

مانسا موسیٰ مغربی افریقہ کے میدان سے نکلا تو اس کے حج کاروان میں ساٹھ ہزار لوگ تھے۔ خود بادشاہ کے مصاحبین کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ انھوں نے قیمتی ریشمی عبائیں پہن رکھی تھیں اور ہر ایک کے پاس مالی کی کانوں سے نکلنے والا دو کلوگرام سونا تھا۔ اونٹوں پر بھی سونے کے چورے سے بھرے بورے لدے تھے جو رستے میں تقسیم کیے گئے۔ راہ کے بے شمار قصبوں اور شہروں کے لوگ نامعلوم مغربی افریقی ملک سے آنے والوں کی شان و شوکت پر حیران رہ گئے۔ مانسا موسیٰ مصر پہنچا تو وہاں کی

مملوک شاہی کے اہلکار بھی ان سے بے پناہ متاثر ہوے۔ انھوں نے اپنے تاثرات لکھے کہ اہلِ قافلہ بڑے دیندار تھے، نماز قضا نہیں کرتے تھے اور انھیں قرآن پر عبور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ نے مصر میں لوگوں کو سونا ایسی بھاری مقدار میں بانٹا کہ افراطِ زر پیدا ہو گیا جو اس کا منشا بہرحال نہیں تھا۔ دس سال کے بعد شمالی افریقہ کا مشہور سیاح ابن بطوطہ مصر سے گزرا اس نے دیکھا کہ قیمتی دھات کی بہتات سے پیدا ہونے والی معاشی بدحالی تب تک بھی موجود تھی۔

حج کے سفر سے بھی زیادہ قابلِ ذکر موسیٰ کی حج سے واپسی کے احوال ہیں۔ مالی تب تک بھی اسلامی تمدن کے لمبے سفر میں کہیں وسط میں تھا اور اصل اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ مقامی عقائد بھی لوگوں میں موجود تھے۔ موسیٰ نے محسوس کیا کہ اس کے ہاں زیادہ تعلیم یافتہ عالموں کی ضرورت ہے۔ وہ مالی کی ترقی کے لیے بہترین عالم، استاد اور فنکار واپس جاتے ہوے ساتھ لے گیا۔ موسیٰ نے انھیں مائل کرنے کے لیے اپنے مالی وسائل استعمال کیے تھے۔ اس کے ہمراہ جانے والوں میں عرب، ایرانی اور اندلسی سب شامل تھے۔ چودھویں صدی کی تیسری دہائی کے اس وقوعے کا نتیجہ ہے کہ مغربی افریقہ میں باقی مسلم دنیا کے اثرات صاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔ منگول یلغار کے ہاتھوں بغداد میں بیت الحکمت کی بربادی کے پچاس سال کے بعد اسلامی علم کا ایک نیا مرکز مغربی افریقہ کے میدانوں میں ابھرا۔

پندرھویں صدی کے اوائل میں فقہ کا ایک عالم عبدالرحمٰن التمیمی حجاز سے ٹمبکٹو (Timbuktu) پہنچا تو اس نے دیکھا کہ علمی معیار بہت اونچا ہے اور اس کو مالی عالموں سے استفادے کے لیے فاس (Fez) جا کر ابتدائی مطلوبہ کورس کرنا ہوں گے۔

مالی کا علمی مرکز ٹمبکٹو تھا۔ دریائے نائیجر سے بیس کلومیٹر شمال میں، ٹمبکٹو صحارا صحرا کے کنارے واقع تھا۔ تب یہ صحارا کے آر پار کے تجارتی قافلوں کے لیے ایک بڑا پڑاؤ تھا۔ یہ مالی کے زیرِ اختیار مانسہ موسیٰ کے دورِ حکومت میں آیا۔ یہاں فوراً ہی کتب خانوں، مسجدوں اور یونیورسٹیوں کا ایک

سلسلہ وجود میں آ گیا۔ یوں شہر کو منفرد اسلامی رنگ ملا۔ موسیٰ کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک بڑا نام اندلسی معمار ابو اسحاق تھا۔ بادشاہ نے اسے پورے ٹمبکٹو میں مساجد، محلات اور مدرسے بنانے پر لگا دیا۔ اسے امید تھی کہ یوں ٹمبکٹو دیگر اور پرانے اسلامی علمی مراکز کی ہمسری کرنے لگے گا۔ موسیٰ نے اپنے عالم پرانے اور مانے ہوئے علمی اداروں سے استفادے کے لیے مراکش بھیجے تا کہ اس کے لوگ اسلامی علوم پر جدید کام سے محروم نہ رہیں۔ مالی، اور پندرھویں صدی کے اواخر میں اس کی جگہ لینے والی سونگھائی (Songhai) سلطنت دونوں میں عالموں کو خصوصی مراعات دی جاتی تھیں۔ انھیں بالعموم زمین کے قطعات اور مراعات نامے جاری کیے جاتے تھے۔ جب مسلم تہذیب اپنے پرانے اور روایتی مراکز میں مائل بہ زوال تھی تو عرب اسلامی دنیا سے آنے والے علماء اور مقامی علمی ترقی کے باعث ٹمبکٹو اسلامی علوم کا ممتاز مرکز بنا رہا۔

مشرقی افریقہ

مشرقی ساحلوں کو بھی اسلام سے آشنا ہوتے دیر نہ لگی۔ حضرت محمدؐ کی مدینہ ہجرت سے بھی پہلے ان کے ساتھیوں کا ایک گروہ قریش کے ظلم و ستم سے بھاگ کر اکسوم (Aksum) (آج کے ایتھوپیا) میں آباد ہو گئے۔ وہاں کے عیسائی بادشاہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ کچھ لوگ ادھر سے عرب بھی گئے تھے، مثلاً آپؐ کے ایک صحابی حضرت بلالؓ، جو مدینہ میں مؤذن تھے، سابقہ غلام تھے اور ان کا تعلق ایتھوپیا سے تھا۔ اگر دیکھا جائے کہ ساتویں صدی میں آمد سے پہلے بھی جزیرہ نما عرب اور مغربی افریقہ کے درمیان تجارتی تعلق موجود تھا تو یہ سب اتنا عجیب نہیں لگتا۔ جیسا کہ مغربی افریقہ میں ہوا تھا، اسلام بحر ہند کے افریقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ بھی تجارتی راستوں کے ذریعے پھیلا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ میں ایک مسلم غلام بلال نے مغربی افریقہ کے تعلیمی نصاب کی بنیاد پر تیرہ صفحات پر مشتمل اسلامی قانون کا ایک مسودہ تحریر کیا تھا۔ وہ شجر کاری پر اپنے ساتھی غلاموں کو تعلیم دینا چاہتا تھا۔

یمن میں قبولِ اسلام کے بعد کی صدیوں میں جزیرہ نما عرب اور خصوصاً اس کے علاقے حضرموت (Hadramawt) سے لوگ نکل کر مشرقی افریقہ کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ آباد ہونے لگے۔ مشرقی افریقہ میں اسلام کی موجودگی ثابت کرنے والی مصنوعات آٹھویں صدی کے اواخر سے نویں صدی کے اوائل تک کی ہیں۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے ساحل کے شمالی ترین کونے میں آباد افریقیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی لوگ عرب سے قریب ترین تھے۔ کینیا میں دسویں صدی کی مساجد بھی کھدائی میں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ جگہ اسلام کی جائے پیدائش سے 2500 کلومیٹر جنوب میں ہے۔ تیرھویں صدی کے آتے آتے اسلام کی جڑیں ساحل کے ساتھ ساتھ آگے، آج کے، تنزانیہ تک پہنچ چکی تھیں۔ خطے میں اسلام کی ترقی کا بڑا ذریعہ تجارت تھی۔ بحرِ ہند کی تجارت بڑھی تو مشرقی افریقہ کی شہری ریاستوں نے مسلم تاجروں کو خوش آمدید کہا۔ ان علاقوں سے اسلام پھیلتا ہوا ساحلی خطوں تک چلا گیا۔

ساحل پر قبولِ اسلام کا مظہر اسلامی دنیا میں منفرد رہا ہے۔ مشرقی افریقہ اتنی دور تھا کہ بڑے پیمانے پر آبادی کی نقل و حمل ممکن نہ تھی۔ لیکن یہ علاقے اتنے قابلِ رسائی ضرور تھے کہ تاجروں کی ایک قابلِ ذکر تعداد یہاں باقاعدگی سے آتی جاتی تھی اور کچھ نے یہاں سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ آباد ہونے والے دولت مند تاجروں نے افریقی عورتوں کے ساتھ شادی بیاہ کیے اور مقامی ثقافت پر اثرات ڈالے۔ اسلام بھی ان اثرات میں سے ایک تھا۔ یہاں عربوں اور ایرانیوں نے مستقل آبادیاں نہیں بنائیں کہ وہ افریقیوں کو مغلوب کر سکیں۔ یہ تمدنوں کا ایک حقیقی امتزاج تھا۔ اس طرح ایک نئے امتزاجی تمدن نے جنم لیا جس کا محور اسلام تھا۔ جب مسلم تاجر اپنے کاروباری سفروں پر کثرت سے مختلف شہروں کے مابین آنے جانے لگے تو مشرقی افریقہ کی ایک مقامی زبان بنتو (Bantu) ساحلی خطے کی افہام و تفہیم کی زبان بن گئی۔ عرب تاجروں کی وجہ سے اس میں عربی کے بہت سے الفاظ داخل ہو گئے لیکن اپنی اصل میں یہ افریقی ہی رہی۔ اسی طرح ساحلی شہروں کے افریقیوں نے عربی اور ایرانی تمدن کے کچھ پہلو اپنا لیے، جیسا کہ اسلام اختیار کرنے والے دنیا کے دیگر خطوں میں بھی ہوا تھا، نئے مذہب کی آمد نے پرانی روایات اور ثقافت کو معدوم نہیں کیا۔

جب مقامی آبادی نے اسلام اختیار کیا تو ساحلی خطے میں طاقتور تاجر مسلم ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان کے متعلق معتبر ترین معلومات کا ماخذ وہی ابن بطوطہ ہے جس نے چودھویں صدی میں مغربی افریقہ کے سفر بھی کیے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ ساحل کے ساتھ ساتھ واقع یہ شہری ریاستیں فقط کاروباری نہیں بلکہ مذہبی بھی تھیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ موغادیشو (Mogadishu) (آج کے صومالیہ) کا سلطان ریاست کے روزمرہ معاملات میں اپنے مذہبی علماء سے مشاورت کرتا تھا جن کا سربراہ مصر سے لایا گیا ایک عالم تھا۔ وہ کلوا اور ممباسا کے لوگوں کے مذہبی جذبے کی تعریف کرتے ہوئے ان کی مساجد کا حال بھی لکھتا ہے جن کی بڑی اچھی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ وہ کلوا کے سلطان کی خاص طور پر توصیف کرتا ہے جو مذہبی علماء اور آلِ رسولؐ سے خصوصاً اچھا سلوک کرتا اور شہر کے غرباء کے ساتھ باقاعدگی سے کھانا کھایا کرتا تھا۔

مشرقی افریقی ساحلوں کے اسلامی پہلو پر چند اچٹتے ہوئے فقرے کہہ دینے کی بجائے ساحلی لوگوں کی زندگی میں اسلام کے عمل دخل کو زیرِ غور لانا زیادہ اہم ہے۔ اسلام کو کہیں باہر سے آنے والا مذہب نہیں سمجھا گیا جسے عرب ایرانی تارکین وطن نے مقامی افریقیوں پر تھوپ دیا تھا۔ انھوں نے اسلام کو ایک مقامی افریقی مذہب ہی سمجھا تھا۔ آپؐ کے افریقی صحابی حضرت بلالؓ اور حبشہ میں مسلم تارکین وطن کا قیام مقامیوں کے لیے بڑا اہم تھا۔ اہلِ افریقہ ان دو واقعات کی وجہ سے اسلام میں ایسا تشخص دیکھتے تھے جو کلیتاً مقامی اور افریقی تھا۔ بیرونی ثقافتی اثرات بھی تھے جو زیادہ تر جنوبی عرب اور ہندوستان سے آنے والے تاجر لائے تھے۔ لیکن، جیسا کہ اسلامی دنیا کے دیگر حصوں میں تھا، ان سب عوامل نے ایسی ثقافت پیدا کی جس کی بنیاد خطے کے اسلام سے پہلے زمانے کے خواص پر تھی۔ مقامی قبلِ اسلام خصائص کو اسلامی قوانین کے مطابق بدل دیا گیا تھا لیکن اس میں کئی طرح کی اقوام کے اثرات دیکھے جا سکتے تھے۔ مشترکہ عقیدے نے ان اجزاء کو ملا کر یکجان کر دیا تھا۔

افریقی غلامی اور براعظم امریکہ

افریقہ میں اسلام آنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر اسلام اوقیانوس کے پار شمالی اور جنوبی امریکہ تک جا

پہنچا۔ 1492ء میں کولمبس کے امریکہ کے سفر کے بعد نئی دنیا میں اہلِ یورپ کی نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یورپ کی ان نوآبادیات میں کارکنوں کی ضرورت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اصل منصوبہ مقامی امریکیوں کو غلام بنانے کا تھا لیکن اس سے کارکنوں کی مطلوبہ تعداد حاصل نہ ہو سکی۔ یورپیوں کے باعث امریکہ آنے والی بیماریوں نے مقامی باشندوں کو نیست و نابود کرنا شروع کر دیا۔ سولھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں دسیوں لاکھ مقامی امریکی ہلاک ہو گئے۔ امریکی نوآبادکاروں نے شمالی صحرائے اعظم افریقہ اور اس کی سیاہ فام آبادی کو غلام بنا کر یہ مسئلہ حل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ غلاموں کے یورپی سوداگر مغربی افریقہ کے ساحلوں پر بڑی تعداد میں غلام خریدنے کے لیے اترے۔ انھوں نے مقامی افریقی بادشاہوں سے سودے کیے جو اپنے ہم وطنوں کو جنگ میں پکڑ کر یورپی سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے۔ بدلے میں ان کو ہتھیار ملتے جنھیں وہ مزید غلام پکڑنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس تخریبی چکر نے خطے کو سیاسی طور پر تباہ کر دیا۔ مغربی اور وسطی افریقہ کے وسیع علاقوں کی آبادی ختم ہوگئی۔ یہاں کے لوگوں کو غلام بنا کر غیر انسانی حالات میں اوقیانوس پار امریکہ بھیج دیا گیا۔

سولھویں صدی تک امریکہ کی سیاہ فام آبادی کا ایک بڑا حصہ اسلام لا چکا تھا۔ امریکہ بھیجے گئے غلاموں میں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ تخمینوں کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن غلاموں کی تجارت کے دوران امریکہ لائے گئے ڈیڑھ دو کروڑ میں سے تیس تا ساٹھ لاکھ سیاہ فاموں کے مسلمان ہونے کا امکان ہے۔ امریکہ میں انھیں سفید فاموں کی محکومی اور ذلت کی زندگی کے سوا کسی چیز کا تجربہ نہ ہوا۔ غلاموں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے کوئی قانون موجود نہ تھے۔ چنانچہ غلاموں کے مالکان موقع کی مناسبت سے انھیں پیٹنے، ذلیل کرنے اور، حتیٰ کہ، ہلاک کر دینے کے ہر طرح سے مجاز تھے۔ غلاموں سے بالعموم شمالی امریکہ کے جنوب، کریبین اور جنوبی امریکہ کے کھیتوں میں کام لیا جاتا تھا۔ انھیں موسم کی سختیوں سے بچانے کا نہ تو کوئی انتظام ہوتا تھا اور نہ ہی اوقات کار مقرر تھے۔ مالک کی توقعات کے مطابق کام نہ کرنے والے یا حکم عدولی کرنے والے غلاموں کو کوڑے مارنا یا کسی اور طرح کی اذیت دینا عام تھا۔ غلاموں کو زیادہ ذلیل کرنے کے لیے کھردرے چیتھڑوں پر مشتمل ایک ہی

جوڑا کپڑوں کا دیا جاتا یا مکمل ننگے بدن کام پر مجبور کیا جاتا تھا۔
نسلی برتری کے زعم میں مبتلا سفید فام تمام غلاموں کو ایک سی اذیت دیتے تھے لیکن مسلمان غلاموں کی کچھ اور طرح کی مشکلات بھی تھیں۔ نمازوں کے لیے کام میں روزانہ پانچ بار وقفہ تو شاذ و نادر ممکن تھا لیکن حج کے لیے مکہ کے سفر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر اسلام کی مزید تعلیم کے مواقع بھی نہیں تھے۔ چند غلام جنھوں نے قید ہونے سے پہلے قرآن حفظ کر لیا تھا وہ اپنے حافظے سے اس کے کچھ حصے دوسروں کو سکھا سکتے تھے لیکن اسلامی روایت کے تسلسل کے لیے تعلیمی ادارے موجود نہیں تھے۔ چنانچہ سولھویں سے انیسویں صدی تک کے زمانے میں نسل در نسل مسلمان غلاموں میں اسلام کا علم کمزور پڑتا گیا۔ ان غلاموں نے زائد کام کر کے کچھ رقم کمائی اور یورپ سے درآمد قرآن خریدے تو اسلامی معلومات میں آنے والے زوال کی رفتار قدرے کم ہوگئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے انتظام مغربی افریقہ میں موجود اسلامی تعلیم کے شاندار مرکز کا نعم البدل نہیں ہوسکتے تھے۔

انیسویں صدی کے ریو ڈی جنیرو (Rio de Janeiro) میں مسلم غلاموں کی بدولت قرآن کی اتنی زیادہ طلب تھی کہ ایک کتب فروش سالانہ 100 قرآن درآمد کرتا تھا۔ قرآن کی قیمت ادا کرنے کے لیے غلاموں کو کئی سال تک فاضل کام کرنا پڑتا۔

افریقی مسلم غلاموں کو دیگر افریقی غلاموں پر ایک اعتبار سے فوقیت حاصل تھی۔ امریکہ کی غلام آبادی میں سے مسلمان بڑے تعلیم یافتہ تھے۔ بعض اوقات وہ اپنے مالکان سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں بالعموم اور مغربی افریقی ریاستوں میں بالخصوص تعلیم پر زور کی روایت کے باعث امریکہ میں، غیر مسلم غلاموں اور حتیٰ کہ کئی یورپیوں کے برعکس، غلام مسلمانوں کا ایک پورا خواندہ طبقہ موجود تھا۔ اس تعلیمی اہلیت کے باعث وہ کبھی کبھی اکاؤنٹنگ جیسے نسبتاً آسان کام حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ اسی تعلیم کی بدولت وہ بغاوت ابھارنے اور اسے منظم کرنے کے بھی قابل تھے۔ اس کی ایک قابلِ ذکر مثال 1835ء میں برازیل کی ریاست باہیا (Bahia) میں

ہونے والی بغاوت تھی۔ غلام بنا کر لے جانے والے مسلمانوں میں کچھ عالم دین بھی موجود تھے۔ انھوں نے اپنا علم اور اپنی کمیونٹی میں مقام و مرتبہ استعمال کرتے ہوئے سلواڈور (Salvador) میں سفید فام آقاؤں کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کے مقاصد اور جزئیات کو جماعت میں پھیلانے کے لیے عربی میں لکھے گئے نوٹس استعمال ہوئے۔ اس بغاوت میں 300 غلام شامل تھے۔ برازیلی سپاہیوں نے وحشیانہ تشدد سے اس بغاوت کو کچل دیا۔ لیکن برازیلیوں میں مسلمان غلاموں کا اتنا خوف ضرور پیدا ہو گیا کہ پورے برازیل سے بہت سے مسلمان واپس افریقہ بھیج دیے گئے۔ سفید فاموں کو امید تھی کہ اس طرح مزید بغاوتوں کا سدباب ہو جائے گا۔

صدیوں تک مسلمان غلاموں پر یہ ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا اور اس کے نتائج و عواقب بھی ظاہر ہوئے۔ پوری اسلامی تاریخ میں جزیرہ نما عرب سے دور دراز واقع خطوں کے مسلمانوں نے بھی اسلام کے مقام پیدائش اور اس کے مرکزی خطوں سے اپنے علمی اور اقتصادی روابط برقرار رکھے۔ لیکن قبل از جدید دور میں امریکہ میں موجود مسلمان جغرافیائی اور علمی اعتبار سے باقی مسلم دنیا سے بہت دور تھے اور اسی لیے ان کی کمیونٹی بتدریج ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے دوچار ہو گئی۔ اسی لیے ہر آنے والی نسل کو اسلام کی مبادیات اور اعمال و عبادات کا ورثے میں ملنے والا علم پچھلی نسلوں کے مقابلے میں کمتر ہوتا چلا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک امریکی سیاہ فاموں میں اسلام سے واقف تقریباً کوئی شخص موجود نہ تھا۔ بیسویں صدی کے آتے آتے غلاموں کی اولادوں کی اولادوں میں سے شاید ہی کسی کو وہ عجیب سی عبادتی رسوم یاد ہوں جو ان کے اجداد بجا لاتے تھے اور جو امریکہ میں عام عبادتی رسوم سے مختلف تھیں۔ تاہم بیسویں صدی میں ان غلاموں کی اولادوں میں سے کچھ میں اسلام کی یاد ایک بار پھر جاگی۔ سیاہ فام امریکیوں کی ترقی اور بہتری کے لیے مسیحی اور اسلامی رسوم و عقائد کے امتزاج سے ایک تکثیری اور نسلی۔مذہبی تنظیم کی تشکیل ہوئی۔ تاہم بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں میلکم ایکس (Malcolm X) اور ڈبلیو ڈی محمد جیسے ارکان ہزاروں ہم خیال افریقی امریکیوں سمیت نیشن سے الگ ہو گئے۔ ان کا مقصد اپنے عقائد کو اس مرکزی اسلامی دھارے سے ہم آہنگ کرنا تھا جو صدیوں پہلے ان کے اجداد سے چھین لیا گیا تھا۔

چین

ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلام سپین سے ہندوستان تک کے علاقے میں جڑیں جما چکا تو اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر بھی اسلام پھولنے پھیلنے لگا اور بالآخر وہ مسلم اکثریت کے علاقے بن گئے۔ مشرقی اور مغربی افریقہ، وسط ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا ایسے ہی خطے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں اسلام آہستہ آہستہ چین میں بھی پھیل رہا تھا۔ تاہم مذکورہ بالا دیگر خطوں کے برعکس یہاں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے اور کسی علاقے کا غالب مذہب اسلام نہ بنا۔ اس کے باوجود مسلمان چین کی تاریخ میں صدیوں تک اہم کردار ادا کرتے رہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

چین میں اسلام کی ابتدا حضرت عثمانؓ بن عفان کی خلافت میں ہوئی جنھوں نے پہلے پہل مسلمان ہونے والوں میں سے ایک صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو تقریباً 650ء میں بطور سفیر چین بھیجا جہاں چینگ (Tang) دورِ حکومت چل رہا تھا۔ ساتویں صدی میں حضرت محمدؐ کی زیرِ قیادت آنے والے انقلاب کے چند عشروں کے بعد ہی مسلمان مشرقِ بعید میں بہت دور تک رسائی پا چکے تھے لیکن چین میں پائیدار مسلم کمیونٹی کہیں آٹھویں صدی میں بن پائی۔ آٹھویں صدی کے وسط میں چینگ حکومت نے مسلمان فوجیوں کو چینی فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی۔ مسلمانوں کے کئی گروہ چین پہنچے اور وہاں چینی حکومت کے فوجی اور سول نظام کا حصہ بنے۔ انھوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کیں اور وہاں مستقلاً آباد ہو گئے۔ اس طرح انھیں چینی معاشرت میں اہم اور مستقل کردار مل گیا۔ انھوں نے جلد ہی سول اور فوجی کاموں میں اپنی اہمیت منوا لی۔ چین کے مسلمان آج بھی ان دو شعبوں میں اپنا مقام پیدا کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

چینی معاشرت کے بالائی طبقوں میں اہم کردار کے باوجود مسلم کمیونٹی اور عام چینیوں کے درمیان رکاوٹیں موجود تھیں۔ چین میں اکثریت مشرقی مذاہب بدھ مت اور کنفیوشس مت کے ماننے والوں کی تھی جو اسلام سے قطعی مختلف تھے۔ مغرب میں تو مسلمانوں کی عیسائیوں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے ایک مشترکہ تاریخ موجود تھی اور ابلاغ کو آسان بناتی تھی۔ لیکن چین میں مسلمانوں کو ایسی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ اسی لیے مسلم طبقوں کو معاشرت کے

مرکزی دھارے سے الگ تھلگ رکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ انھیں دیگر معاشرت سے الگ رکھنے کے لیے خاص حد بندیاں کی گئیں لیکن انھی کی بدولت اسلام کے متعلق معلومات کے وہ رستے وضع ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کو عرب اور ایران جیسے دور دراز علاقوں میں موجود اپنے ہم مذہبوں سے منسلک رکھا۔ اگر چہ چینی شہروں کے بیچوں بیچ بسنے والی یہ کمیونٹیاں مسلم دنیا سے الگ تھلگ تھیں لیکن اسلامی مراکز سے ہزاروں میل دور بھی وہ اپنا مسلم تشخص برقرار رکھنے کی جدوجہد میں کامیاب رہیں۔ لیکن جب تیرھویں صدی کی منگول فتوحات کا زمانہ آیا تو ان کی یہ تنہائی ختم ہو گئی۔ منگولوں کی سلطنت میں چین کے علاوہ وسطی ایشیا اور ایران کے علاقے بھی شامل تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں منگولوں کے ہاتھوں پورے پورے شہروں اور خطوں کی تباہی کے باعث بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی۔ جب چینی مسلم کمیونٹیاں اور اسلام کے مرکزی علاقے ایک ہی سیاسی انتظام کے تحت آ گئے تو رابطے کے نئے راستے کھل گئے۔ مسلمانوں کی چین کو ہونے والی بڑی نقل مکانی کے باعث وہاں مسلم آبادی میں بھی قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کو چینی تمدن کے مرکزی دھارے میں ضم کرنے کی منگول حکمتِ عملی نے بھی مسلم تنہائی ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اب مسلم کمیونٹیاں غیر مسلموں کے سمندروں میں محصور جزیرے نہ رہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ معاشرے میں سرگرم کردار ادا کریں۔ انھیں وسیع منگول سلطنت کے مسلم علاقوں میں اہم انتظامی ذمہ داریاں دی گئیں۔

چودھویں صدی میں شہنشاہ ہانگ وو (Hongwu) نے پیغمبر حضرت محمدؐ کی مدح میں ''سولفظی قصیدہ'' لکھا اور اس کی نقول چین کی تمام مساجد میں تقسیم کروائی گئیں۔

چین پر منگول حکومت اور اس کے بعد آنے والی منگ سلطنت کے دوران مسلمان پوری طرح چینی معاشرت میں ضم ہو گئے۔ اب انھیں غیر ملکی نہیں بلکہ چینی سمجھا جانے لگا۔ انھیں ''ہوئی'' (Hui) کے نام سے الگ شناخت دی گئی۔ اگر انھیں مذہبی تشخص سے الگ کر کے دیکھا جائے تو ہوتی اکثریتی چینی نسلی گروہ ہان (Han) سے کسی طور پر مختلف نہ تھے۔ مسلمان سینکڑوں سال کے بعد بالآخر چینی

معاشرے کا حصہ بن گئے۔ منگ (Ming) عہد میں انھوں نے مقامی تمدن اور اس کے رسوم و رواج کو بھی اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے نام بھی چینی روایت کے مطابق رکھنے لگے۔ اس سارے دورانیے میں انھوں نے چینی سول اور فوجی اعلیٰ انتظامیہ کا حصہ بن جانے کی روایت بھی نہ چھوڑی۔

یہی زمانہ تھا کہ مشہور ترین چینی مسلمان چنگ ہا (Zheng He، 1371ء تا 1433ء) چین کا عظیم ترین سیاح بن کر ابھرا۔ اس ہوتی کا تعلق جنوب کے خطے یونان سے تھا۔ منگ حکومت اس پر بہت مہربان تھی۔ اسے بہترین بحری جہازوں کے ایک بیڑے کی کمان دی گئی۔ بعض اتنے بڑے تھے کہ کولمبس کے تینوں جہاز ان میں سے ایک میں آ سکتے تھے۔ ان سینکڑوں جہازوں اور دسیوں ہزار جہازیوں کے ساتھ اسے منگ سلطنت اور دور دراز ممالک کے درمیان تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ وہ اپنے بحری سفروں کے دوران آج کے ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں واقع درجنوں ممالک کی بندرگاہوں پر رُکا۔ لیکن اسے جنوب مشرقی ایشیا میں شاید سب سے زیادہ محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے مجمع الجزائر مالے میں اسلام پھیلانے میں مدد کی۔ اس پورے خطے میں مسجدوں کے نام اس معروف ایڈمرل کے نام پر رکھے جاتے ہیں جسے مقامی طور پر چنگ ہا کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ مسلمانوں میں ہی ممتاز حیثیت نہیں رکھتا بلکہ غیر مسلم چینی بھی اسے عظیم چینی سیاح کے طور پر یاد رکھتے ہیں۔ چنگ ہا کو اسلام میں مسلمانوں اور اسلام کا شناختی نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ پوری طرح چینی اور مکمل مسلمان تھا۔ اس کا چینی اور مسلمان ہونا باہم متصادم نہ تھا۔

ہندوستان

آٹھویں صدی کے اوائل میں محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کی وادی پر چڑھائی کی۔ لیکن اسلام سیاسی اعتبار سے برصغیر میں زیادہ اندر تک نہیں گیا۔ سندھ میں ایک مستقر بنایا گیا لیکن مسلم دارالحکومتوں یعنی دمشق اور پھر بغداد سے اس کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ مزید فوجی مہم جوئی عملاً مشکل اور مالی اعتبار سے بے فائدہ تھی۔

جب مسلم دنیا پر ترک غالب آئے تو مسلم سلطنت کی حدود برصغیر میں مزید اندر تک پھیل گئیں۔ اولین شخصیات میں سے خاص اہمیت کا حامل محمود غزنوی (دورِ حکومت 997ء تا 1030ء) ہے۔ یہ پہلا ترک سلطان تھا جس نے ہندوستان کے مرکزی علاقوں تک حملے کیے۔ اس نے افغانستان کے پہاڑی خطے میں واقع غزنی کو اپنا دارالحکومت بنا کر ایک خودمختار ریاست تشکیل دی۔ وہ ہندوستان کے اتنا قریب تھا کہ اس پر توجہ مرکوز رکھ سکتا تھا۔ اس نے شمالی ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ ان حملوں کی وجہ سے اس نے اپنی حکومت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ بلاشبہ اس کے حملوں نے مقامی حکومتوں اور ثقافت کو نقصان پہنچایا لیکن اس نے قابلِ ذکر ثقافتی مراکز قائم بھی کیے اور اپنے دورِ حکومت میں ایرانی ثقافت کو پھیلایا۔ دائرہ اسلام میں آنے سے قبل کے ایران کی ثقافت کے احیاء میں سب سے زیادہ کام کرنے والا داستانوی شہرت کا مالک فارسی شاعر فردوسی اور مورخ، سائنسدان، ارضیات دان اور طبیعات دان البیرونی دونوں محمود کے دربار میں شامل تھے۔ وہ فنون کے سرپرست اور ہندوستان پر بے رحم حملہ آور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اسی لیے آج کے ہندوستان میں محمود کے ورثے کو اتنے مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اپنی سائنسی ایجادات کے علاوہ البیرونی نے ہندوستانی تاریخ اور ثقافت پر جو کچھ لکھا، کئی جلدوں کا مواد ہے۔ اس کی تحریروں کا ترجمہ ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان کے حالات کا اہم ذریعہ رہا ہے۔

اپنے ورثے سے قطع نظر محمود غزنوی سلطنت نے ہندوستان کی مسلم فتوحات کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد غوری آئے۔ یہ بھی افغانستان سے نکل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور مزید اندر تک چلے گئے۔ انھوں نے 1192ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ غوریوں نے ترک الاصل غلاموں پر انحصار کیا جو ان کی فوج کا مرکزی حصہ تھے۔ اس اعتبار سے وہ اسلامی دنیا کے مغرب میں واقع اپنے معاصر ایوبیوں کے سے تھے۔ مملوک سلاطین نے انھی غلاموں کی فوج سے مصر پر اپنی حکومت بنائی تھی۔ اپنے مصری ہم عصروں کی طرح ہندوستان میں بھی غلام فوجیوں نے بالآخر اپنے مالکوں کے تخت الٹائے اور خود

اپنا دورِ حکومت قائم کیا جسے سلاطین دہلی کا دور کہا جاتا ہے۔

سلاطین دہلی، 1526ء میں مغلوں کی آمد تک ہندوستان کے مختلف حصوں پر حکومت کرتے رہے۔ سلاطین کا دورِ حکومت تین صدیوں تک چلتا رہا۔ انھوں نے دہلی کو پایہ تخت بنایا اور مملوک، خلجی، تغلق، سید اور لودھی خاندانوں کے نام سے ہندوستان پر حکومت کی۔ جانشینوں کی ترتیب اور ان کے باہمی اختلاف اتنے ضروری نہیں کہ تفصیلاً بیان کیے جائیں لیکن سلاطینِ دہلی کے کچھ خاص سیاسی رجحانات ضرور بیان ہو سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ سلطنت کو ترک غلام سلطنت کے طور پر چلایا گیا۔ اس اعتبار سے یہ مصر کے مملوک عہدِ حکومت کی طرح تھی۔ بہت کم ہوتا تھا کہ باپ کی جگہ بیٹا حکمران بنے۔ اس کی بجائے سلطان کے مرنے پر سلطنت کے امراءل کر نیا جنرل چنتے جو مرحوم کی جگہ لیتا۔ اگر سلطان اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہتا تو اس کے ماتحت اسے ہٹا بھی سکتے تھے۔ اس نظام کی بدولت سلطنت کو کاہلی اور نااہلی سے بچایا جا سکتا تھا جو پشتینی بادشاہت کی صورت میں دو ایک نسلوں کے بعد لازماً پیدا ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں دہلی کے سلاطین نے اپنے لیے کبھی خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ وہ عباسیوں کو ہی مسلم دنیا کا حتمی رہنما خیال کرتے تھے۔ وہ اصولاً خود کو خلیفہ کا نائب خیال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بغداد کی تباہی کے بعد بھی، جب عباسی قاہرہ میں برائے نام رہ گئے، ہندوستانی حکمران خلیفہ سے اپنے لیے منظوری اور اس کے نائب کے طور پر حکومت کی اجازت لینے کے لیے باقاعدگی سے سفارتیں بھیجتے رہے۔ اونچے ہمالیائی ہندوکش سلسلوں کے حائل ہونے کے باوجود سلاطینِ دہلی، باقی مسلم دنیا سے تعلق رکھنے کی کوشش کرتے تھے خواہ یہ برائے نام ہی تھا۔

سلاطین کا زمانہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے اعتبار سے بھی بڑا اہم تھا۔ بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں عرب تاجروں کی آمدورفت کے باعث اسلام ساتویں صدی کے اوائل سے ہی برصغیر میں موجود تھا۔ لیکن ہندوستانی آبادی کے قابلِ ذکر حصے میں اسلام کی ترویج کے لیے کسی سیاسی حکومت کی سرپرستی ضروری تھی۔ سلاطین دہلی نے یہ موقع فراہم کیا۔ صوفی سلسلوں کو شاہی معاونت حاصل تھی اور وہ ہندوستان بھر کی آبادی کے تمام طبقوں میں اسلام کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ ہندوستان کی تقریباً ساری آبادی کثیر خدائی مذاہب کی پیروکار تھی۔ باطنی روحانی جہات کے بغیر ان کے لیے کسی

بھی وحدانی مذہب کو قبول کرنا بڑا دشوار ہوتا۔ اسی لیے روحانیت سے سرشار صوفیوں کے لیے ہندوستانی معاشرت بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ اسی لیے جہاں گرد مسلم علماء، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق عرب اور ایران سے تھا، نے روحانی تسکین اور خدا کے ساتھ ایک نئے تعلق کا پرچار کیا۔ انھوں نے اپنے طویل سفروں کے دوران بہت سے لوگوں کو اپنا پیروکار بنالیا۔ اسلام کے درس مساوات نے بھی لوگوں کو ذات پات کے بے لچک اور غیر منصفانہ ہندو نظام سے نکلنے میں مدد دی۔ وہی درسِ مساوات جس کی بہترین مثال آپؐ کا فرمان ہے کہ خدا کی نظر میں تمام اہلِ ایمان برابر ہیں۔ درست تعداد کی گنتی تو ممکن نہیں لیکن ان جہاں گشت مبلغین اور بغرض تجارت بحر ہند کے راستے بنگال اور گجرات آنے والے مسلم تاجروں کی مشترکہ کاوشوں سے اسلام نے ہندوستانی معاشرت میں اپنے پاؤں پورے برصغیر میں مضبوطی سے جما لیے اگرچہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے ہمیشہ کم رہی۔

جنوب مشرقی ایشیا

برصغیر سے آگے مشرق کی طرف جائیں تو مجمع الجزائر مالے کے مقامی باشندوں کو مسلمان بنانے میں بغرض تجارت سفر کرتے تاجروں اور مبلغین کا کردار اور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ خطہ طویل عرصے سے ہندوستان اور چین میں کاروباری اڈے رکھنے والے تاجروں کی گزرگاہ چلا آ رہا تھا۔ لچکدار رویے کے حامل ہندوستانیوں کے مقابلے میں بے لچک بیوروکریسی اور سامراجی روایات کے حامل چینیوں میں یہ صلاحیت کم تھی کہ وہ اس مجمع الجزائر میں اپنا تمدن اور حکومتی خیالات متعارف کروا سکیں۔ چنانچہ پہلے ہزاریے کا اختتام ہونے سے پہلے تک جنوب مشرقی ایشیا میں ہندوستان سے برآمدہ ہندومت اور بدھ مت کا زور تھا۔ بدھ مت کو ماننے والوں کی دو بڑی حکومتیں تھیں، ایک سری وجایا (Srivijaya) سلطنت جس کا مرکز جزیرہ ساٹرا تھا اور دوسری میدانگ (Medang) سلطنت جس کا مرکز جاوا تھا۔ دیگر سلطنتوں کے علاوہ ان دونے ہندوستانی اثرات پھیلانے میں کافی کامیابی حاصل کی۔ لیکن جب ہندوستانی ساحلی آبادیوں میں اسلام کے قدم جم گئے تو ہندوستان کے مبلغین اور تاجروں کو جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام پھیلانے کا موقع مل گیا۔

ایک بار پھر اس کی جائے پیدائش یعنی صحرائے عرب سے بہت دور کے علاقے میں اسلام کی اشاعت میں تجارت کا کردار بڑا اہم رہا۔ اسلام کی بدولت ملنے والے اقتصادی مواقع نے بھی کئی مقامی بادشاہوں کو قبول اسلام پر مائل کیا۔ مشرقی افریقہ کی شہری ریاستوں سے عرب اور پھر ہندوستانی ساحلوں تک بحر ہند کی تجارتی سرگرمیوں کے باہمی ربط میں اسلام کا مرکزی کردار تھا۔ مشترکہ عقائد اور واسطے کی زبان یعنی عربی کی بدولت ایسے خطوں کے مابین بھی بسہولت تجارت ہو رہی تھی جو باقی ہر طرح سے باہم مختلف تھے۔ اگر جنوب مشرقی ایشیا کا ایک بادشاہ مسلمان ہو جاتا تو وہ بھی اس کمیونٹی کی منافع بخش رکنیت حاصل کر لیتا تھا۔ جب بارھویں صدی کے آس پاس مجمع الجزائر کے مقامی حکمرانوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو خطے میں طاقتور مسلم بادشاہتیں بنیں۔ ان کی بنیاد اسلام کے لائے ہوئے اقتصادی مواقع تھے۔

ان حاکموں کی بدولت اسلام مجمع الجزائر مالے کی آبادی میں پھیلنے لگا۔ اس خطے کی لوک کہانیوں میں عام ملتا ہے کہ پہلے بادشاہ نے، پھر اس کے اہلِ خانہ اور قریبی حواریوں اور آخر میں عام آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ مطلب یہ کہ اسلام اوپر سے نیچے کی جانب پھیلتا چلا گیا۔ ان بادشاہوں نے ہی مغرب سے آنے والے اور بذریعہ تصوف اسلام پھیلانے والے مبلغین کے لیے مواقع پیدا کیے ہوں گے کہ وہ مقامی آبادی میں اسی طرح اسلام کی اشاعت کریں جیسے وہ دہلی سلطنت میں کر چکے تھے۔ تاہم ایک قابلِ ذکر فرق موجود تھا کہ شمالی ہندوستان کے اشاعت اسلام میں ایرانی عنصر کا کلیدی کردار تھا جبکہ جنوب مشرقی ایشیا آنے والے مبلغین بحر ہند کے کناروں اور بالخصوص یمن سے تھے۔ اب چونکہ یمن بحر ہند کی تجارت کا محور تھا اور یہاں امام شافعی کی فقہ کا زور تھا چنانچہ مشرقی افریقہ، ساحلی ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا میں شافعی فقہ زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے برعکس ایران اور وسطی ایشیا میں مقبولیت کے باعث شمالی ہند میں حنفی فقہ کے پیروکار زیادہ ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام پھیلنے کے دوران اور اس کے بعد بننے والی مسلم بادشاہتیں باقی مسلم دنیا کے ساتھ تجارتی روابط کے ذریعے بندھی ہوئی تھیں۔ جزیرہ سماٹرا پر مشتمل پہلی مسلم ریاست پاسائی (Pasai) تھی۔ اس کے لوگ تیرھویں صدی تک بہرحال اسلام لا چکے تھے۔ مارکو پولو نے اسی

صدی میں جزیرے کی سیاحت کی تھی۔ وہ اس ریاست کے ساحلی شہروں کے مسلمان ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ ایک صدی کے بعد ابن بطوطہ نے اس سلطنت میں تنظیمی ڈھانچے اور یہاں کے بادشاہ کی قوت کا ذکر کیا ہے۔ پاسائی سے اسلام مشرقی رخ واقع ملاکا بادشاہت تک پہنچا جو 1400ء کے آس پاس قائم ہوئی۔ یہ ایک ایسی آبنائے پر واقع تھا جس میں سے ہندوستان اور چین کے درمیان آتے جاتے سارے تجارتی جہاز گزرتے تھے۔ اس محلِ وقوع نے اسے خطہ کی اہم ترین بادشاہت بنا دیا تھا۔ اپنے پانیوں سے گزرتے تجارتی جہازوں سے وصول ہونے والی دولت کے بل بوتے پر ملاکا نے گردو پیش کے علاقے میں بے پناہ اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ تمام نزدیکی ریاستوں نے اس کی مالے زبان اور رسوم ورواج اختیار کر لیے۔ آج کے ملائیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن کے مختلف علاقے ثقافتی اعتبار سے اس ریاست سے وابستہ ہو گئے۔ یہ ثقافتی اثر بھی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن گیا۔ مالے تشخص اس حد تک اسلام سے منتخص ہوا کہ جب کوئی اسلام قبول کرتا تو کہا جاتا کہ وہ اس مالے ریاست میں داخل ہو گیا یا ہو گئی۔ مقامی ثقافت اور نسلیت میں گندھے اس اسلامی تشخص کو ملاکا سے مزید مشرق کی طرف پورے مجمع الجزائر ملاکا میں پھیلنا تھا اور پہلے پرتگالی پھر ولندیزی (Dutch) اور انگریز حملوں اور قبضوں کے بعد بھی زندہ رہنا تھا۔

دسواں باب

احیاء

چودھویں صدی کے فلسفی اور مورخ ابن خلدون کے مطابق سلطنتوں کا بھی ایک فطری دورِ حیات ہوتا ہے۔ کسی سلطنت کے ابتدائی سالوں میں اس کی نشوونما اور توسیع ہوتی ہے۔ اس میں ''صحرائی سخت جانی'' پائی جاتی ہے اور اسے عام عیش وعشرت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ سلطنت کے بانیوں کی دوسری نسل ملنے والے ورثے کو محفوظ رکھتی ہے لیکن توسیع رک جاتی ہے کیونکہ یہ نئی قیادت انتظام اور قیادت کی ذمہ داری پر شہری محلاتی زندگی کی آسائشوں کو ترجیح دینے لگتی ہے۔ تیسری نسل کے حاکم اور وزیر تعیش اور لذتوں میں کھو کر اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ سلطنت کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے نہیں بچاتے اور یوں اسے زوال آ جاتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب سلطنت کا چکر از سرِنو شروع ہوتا ہے اور پرانی کی جگہ نئی سلطنت آ جاتی ہے۔

ابن خلدون کے سلطنت کے نظریے کا اطلاق اسلامی دنیا پر کیا جائے تو وسط تا اواخر تیرھویں صدی میں یہ واضح طور پر تیسرے مرحلے میں نظر آتی ہے۔ نااہل قیادت، جنگجو طبقے کی لاتعلقی اور دولت اور تعیش کی فراوانی نے مسلم دنیا سے بیرونی حملوں کے خلاف مدافعت کی اہلیت چھین لی تھی۔ ابن خلدون کے فلسفے کے عین مطابق پرانے نظام کی جگہ لینے کے لیے ایک نئی سلطنت ابھر کر سامنے آئی۔ مغربی اناطولیہ کے ایک ترک جنگجو عثمان خاندان نے چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں

سلطنت عثمانیہ قائم کی جو اس دور کی سب سے بڑی مسلم طاقت بن گئی۔ اس کی بدولت استحکام، ترقی اور شکوہ وسطوت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ خلدونی فلسفے کے برعکس یہ نئی سلطنت تین نسلوں سے بہت زیادہ دیر تک قائم رہی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جنگ عظیم اول کے بعد ختم ہونے تک یہ عالمی طاقت چلی آ رہی تھی۔

بیٹے! دیگر تمام فرائض سے پہلے مذہبی معاملات کی احتیاط کرو۔ مضبوط سلطنت اصولوں پر ہی بنی ہے۔
عثمان کی اورخان سے گفتگو

عثمانیہ سلطنت کی اصل

منگول مصیبت کی وجہ سے ترک خاندان وسط ایشیا سے بھاگ کر پناہ لینے مسلم دنیا کے سرحدی علاقوں میں پہنچے۔ ترک روایتاً خانہ بدوش تھے اس لیے وہ سابقہ بازنطینی علاقوں سمیت جہاں بھی پہنچے جلد ہی وہاں کے حالات کے مطابق ڈھل گئے۔ 1701ء کی مانزکرٹ جنگ میں سلجوقوں کے ہاتھوں بازنطینیوں کی شکست کے بعد سے اناطولیہ ترک فتوحات اور آبادکاری کے لیے کھل گیا تھا۔ تیرھویں صدی میں جب منگول اس خطے میں داخل ہوئے تو سلجوقی سلطنت کی باقیات ہمیشہ کے لیے کچل دی گئیں۔ چھوٹی چھوٹی بہت سی ترک حکومتیں پورے جزیرہ نما میں بکھری پڑی تھیں۔ اناطولیہ پر ان میں سے کبھی ایک حکومت قابض ہوتی کبھی دوسری۔ یہ حکومتیں بیلک کہلاتی تھیں۔ انھیں باصلاحیت فوجی لیڈر قائم کرتے جنھیں ''بے'' کہا جاتا تھا۔

ان میں سے عثمان نامی ایک بے نے بازنطینی سرحد کے ساتھ لگتے ایک علاقے میں چھوٹی سی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اناطولیہ کی ایسی بہت سی ریاستوں میں سے یہ بعدازاں عالمی طاقت بن گئی۔ اسی ایک بیلک کے اتنی بڑی سلطنت بن جانے کی وجوہات کا حتمی تعین مشکل ہے لیکن ایک بہت اہم وجہ اس کا ٹوٹتی بکھرتی بازنطینی سلطنت کے نزدیک ہونا تھا۔ بازنطینی اپنے پرشکوہ ماضی کے محض سائے رہ گئے تھے۔ چودھویں صدی کے اوائل میں ماضی کی اس شاندار سلطنت کے پاس فقط قسطنطنیہ، یونان اور بلقان

کے کچھ علاقے رہ گئے تھے۔ وہ ابھی تک قسطنطنیہ کی حکمران تباہ کن لاطینی حکومت (1204ء تا 1261ء) سے نہیں سنبھل پائے تھے۔ اس دورانیے میں قسطنطنیہ کا وہ زمانہ ختم ہو گیا جب یہ دنیا کا عظیم ترین اور سب سے بڑا شہر ہوا کرتا تھا۔ عثمان میں بازنطینی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ وہ اپنی سلطنت کو بازنطینی علاقوں میں وسیع کرتا چلا گیا۔ منگول قتلِ عام سے بچنے کے لیے باقی مسلم دنیا سے آنے والی آبادی نے بھی اس چھوٹی سی ریاست کو افرادی قوت فراہم کی۔ عثمان نے اپنے مخالفین کو اسلام دشمن قرار دے کر اپنی لڑائی کو جہاد کا رنگ دیا۔ انھی دشمنوں کے خلاف خلفائے راشدین، بنوامیہ اور بنوعباس بھی تو لڑتے چلے آئے تھے۔ عثمان نے ان حملوں کے دوران خود فوج کی قیادت کی۔

سلطنت عثمان کا ترک نام عثمانی ہے جو بگڑ کر اوٹومن بن گیا۔ روایتاً عثمانیہ ریاست کا باقاعدہ قیام 1299ء میں عمل میں آیا۔ لیکن اس سال کی تخصیص کا بھی کوئی تاریخی استدلال نہیں ہے۔ عثمان اور اس کے بیٹے اورخان کی زیرِ قیادت ترک لڑاکا گروہ بازنطینی ریاست کے علاقے قبضاتے رہے اور بالآخر ترک خانہ بدوش کے زیرِ تسلط علاقہ ایک ریاست لگنے لگا۔ 1326ء میں عثمان کی وفات ہوئی تو عثمانیوں نے پہلا بڑا شہر برسا (Bursa) فتح کر لیا تھا جو ان کا دارالحکومت قرار پایا۔ اورخان نے باپ کی غازیانہ روایت کو برقرار رکھا اور اپنے جنگجوؤں کی قیادت کرتا انھیں بحیرۂ مرمرہ (Marmara) کے ساحلوں تک لے گیا جہاں سے قسطنطنیہ 100 کلومیٹر دور تھا۔ اس نے ترکوں کو مائل کرنا شروع کیا کہ وہ خانہ بدوشی کی بجائے سکونتی معاشرہ اختیار کریں۔ اناطولیہ کے بازنطینی شہر مستحکم شہری مراکز تھے جن کے گرد مضبوط فصیلیں تھیں۔ ترکوں نے سینکڑوں سال چھاپہ ماری اور حملوں کی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھایا تھا لیکن اب اس حکمتِ عملی کی افادیت کم ہونے لگی تھی۔ اس کی بجائے اب ترکوں نے شہروں کا محاصرہ کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ وہ شہر پناہ یا قلعے کا محاصرہ کرتے اور اس کے فتح ہونے تک لڑائی جاری رکھتے تھے۔ چودھویں صدی کی شروعات میں بازنطینیوں کو اپنے بلقانی علاقوں میں اندرونی شہری شورشوں نے مصروف رکھا۔ وہ ایشیا میں اپنی بچی کھچی چوکیوں کا دفاع نہ کر سکے اور یوں عثمانیوں نے اپنے علاقے کو تیزی سے وسیع کیا۔ جوں جوں بازنطینی کمزور ہوئے، عثمانی مضبوط ہوتے چلے گئے۔ چودھویں صدی کے پہلے چند عشروں میں ہی وہ جنگجوؤں کے چھوٹے سے قبائلی گروہ سے بڑھ

کر اناطولیہ کی سب سے طاقتور بیلک بن چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں بازنطینی سلطنت کا تسلسل خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس طرح کا خطرہ اتنا زیادہ تھا کہ بازنطینی شہنشاہ ایڈرونیکس (Adronicus) 1333 میں اورخان سے ملاقات کرنے اور باقی ماندہ بازنطینی قلعوں کی سلامتی کے عوض کچھ خراج پر گفت وشنید کرنے پر مجبور ہو گیا۔

چودھویں صدی کے وسط تک ترک ان علاقوں میں بھی داخل ہو گئے جنھوں نے سات سو سال پہلے بنوامیہ کے قسطنطنیہ پر حملے کے بعد سے اسلامی فوج نہیں دیکھی تھی۔ چودھویں صدی کی ساٹھ کی دہائی میں ترکوں نے آبنائے ڈارڈینیلز (Dardanelles) عبور کی اور پہلی بار یورپ میں داخل ہو گئے۔ اس خطے میں بازنطینیوں کی باہمی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر اورخان اور اس کے بیٹے مراد اول نے تھریس (Thrace) کے کچھ حصوں پر اپنا تسلط مضبوط کر لیا۔ خانہ بدوشی کی روایت کے باعث ترک خاندان اور قبیلے فوراً نو مفتوحہ علاقوں میں یورپی سرحدوں تک آباد ہو گئے۔ انھوں نے پورے مفتوحہ علاقے میں کئی نئے قصبے بھی آباد کر دیے۔ اس پیمانے پر ہونے والی نقل مکانی نے علاقے میں عثمانیوں کو استحکام دیا جو بصورت دیگر ممکن نہ ہوتا۔

چودھویں صدی میں ترک ایک چھوٹی سے بیلک سے اٹھے اور قابلِ ذکر توسیع و تعمیر کے بعد ایک بڑی علاقائی قوت بن گئے۔ ان کی اس کامیابی کی وجہ ترکوں کی قائم کردہ علمی روایات تھیں۔ شروع کے عثمانیوں کے نزدیک بازنطینیوں کے خلاف ان کی جنگ مذہبی فریضہ تھی۔ عثمان، اورخان اور مراد کی زیرِ قیادت لڑنے والے ترک غازی خود کو بازنطینیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو اولین مسلمانوں کی روایت کا تسلسل سمجھتے تھے۔ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو باہم متحد کر دیا تھا۔ دین کے محافظوں کا کردار سنبھال کر عثمانی سلاطین نے اپنی زیرِ قیادت لڑنے کو تیار ہزارہا ترک جنگجو جمع کر لیے تھے۔ ترکوں کے ذہنوں میں منگولوں کے ہاتھوں ہونے والی مشرقِ وسطیٰ کی تباہی ابھی تازہ تھی اور وہ سلسلہ ابھی رکا نہیں تھا۔ ترکوں کو اس خیال نے بھی تحریک دی ہو گی کہ انھیں اسلام کی شکوہ وسطوت کو واپس لانے کے قابل ہو جانا چاہیے۔ چودھویں صدی کے ترکوں جیسے خانہ بدوش، منتشر اور نوع بہ نوع لوگوں کو صرف اسلام کی قوت ہی اکٹھا کر سکتی تھی۔

ترکوں نے اسلامی روایات پر زور دینے کے ساتھ ساتھ جنگ کے اسلامی قواعد کا بھی خیال رکھا۔ ساتویں صدی کی چوتھی دہائی میں جب خلیفہ حضرت ابو بکرؓ نے بازنطینیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی دستے شمال کی طرف بھیجے تو انھیں عام شہریوں اوران کی جائیدادوں کو نقصان نہ پہنچانے اور صرف لڑنے والوں کو مارنے جیسے قواعد پر سختی سے عمل کرنے کو کہا۔ یہ روایت عثمانیوں کے دور میں جاری رہی جو اپنے زیرِحکومت غیر مسلموں کے ساتھ بڑی رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ جب انھوں نے یورپ کے اندر پیش قدمی کی تو مزاحمت اور کھلم کھلا بغاوت نہ کرنے والے دیہات کو نہ چھیڑا گیا۔ عثمانیوں نے آرتھوڈوکس عیسائیوں کو جو آزادی دی وہ اس ایک صدی پہلے کی بدسلوکی سے بالکل الٹ تھی جو ان کے ساتھ لاطینی صلیبیوں نے عشروں روا رکھی۔ عثمانی مقابلتاً منصف مزاج اور نرم خو فاتح تھے۔ جنوب مشرقی یورپ کی اشرافیہ بالعموم عثمانی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے مغرب کے کیتھولکوں سے مدد لینے میں جلدی کرتی تھی۔ لیکن عام لوگ اپنی سرزمین کو ایک بار پھر لاطینی قبضے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے بہت سے وقوعوں میں انھوں نے مذہبی رواداری کی یقین دہانی کے بعد ترکوں کو مدد دی۔ اسی لیے مذہبی اور عملی ہر دو مقاصد کے لیے ترکوں نے مسیحی یورپ کے اندر پیش قدمی کے دوران مذہبی رواداری کو اپنا اصول بنائے رکھا۔

بایزید اول (1389ء تا 1402ء) کا دورِحکومت اوائل عثمانی سلطنت کی تیز رفتار توسیع کا زمانہ تھا۔ وہ اپنی افواج کو یورپ اور ایشیا کے درمیان اس تیزی سے متحرک رکھتا تھا کہ اس کے سپاہی بایزید کو یلدرم (یعنی چمکتی اور کڑکتی بجلی) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ سلطان کی فوج کی سالانہ نقل مکانی کا مطلب تھا کہ آدھا سال سلطنت کو مسیحی یورپ کی طرف وسیع کرنے میں گزرتا جبکہ باقی آدھا ایشیا میں حریف ترکوں اور جزواً مسلمان ہو جانے والے ترکوں سے لڑائی میں صرف ہوتا۔ اس کی یورپی فتوحات انیسویں صدی تک سلطنت کا حصہ رہیں حتیٰ کہ پوری سلطنت میں قومیت پرستی کی لہر چل نکلی۔ اس نے سربیا، بلغاریہ اور یونان کو فتح کر لیا۔ وہ دریائے ڈینیوب عبور کر کے ولیکیا (Wallachia) پہنچنے والا پہلا عثمانی حکمران تھا۔ اس نے خود قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی کیا لیکن تب عثمانی ٹیکنالوجی اور تعداد دونوں طرح سے شہر کو فتح کر لینے کے قابل نہیں تھیں۔ اس شہر پر قبضے کے بغیر بھی عثمانی یورپ اور مسلم دنیا کی

طاقتور ترین سلطنت کے مالک تھے۔

اگلا عظیم فاتح عالم بننے کا خواہاں تیمور اسی لیے عثمانی سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس منگول حکمران کی قلمرو میں وسطی ایشیا اور ایران شامل تھا۔ اگر چہ تیمور بھی مسلمان تھا لیکن اس کے جنگی طور طریقے اپنے اجداد سے کسی طور مختلف نہیں تھے جنھوں نے سو سال پہلے اس علاقے کو برباد کر دیا تھا۔ وہ چنگیز کی قائم کردہ سلطنت کا احیاء چاہتا تھا۔ اس ارادے کی تکمیل کا مطلب تھا کہ عثمانیوں کی بین البراعظمی سلطنت کو مٹا دیا جائے۔ 1402 میں تیمور اور یلدرم کا مقابلہ انقرہ کی جنگ میں ہوا۔ یورپ کی باجگزار ریاستوں سے عیسائی کمک ملنے کے باوجود یلدرم جنگ ہار گیا۔ خود یلدرم قید ہوا اور اسے تیمور کے دارالحکومت سمرقند لے جایا گیا۔ فاتح تیمور نے عثمانی سلطنت کو یلدرم کے چار بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اسے امید تھی کہ ان کی باہمی جنگ سے عثمانیہ سلطنت خود ہی ختم ہو جائے گی۔

یمنی مسلمانوں نے پندرھویں صدی میں کافی متعارف کروائی۔ جب عثمانی سلطنت نے جزیرہ نما عرب کو اپنی سلطنت کا حصہ بنایا تو کافی استنبول اور وہاں سے یورپ پہنچی۔

اگلے گیارہ سال تک عثمانیہ سلطنت مسلسل خانہ جنگی میں مبتلا رہی۔ بایزید کے بیٹوں عیسٰی، موسٰی، سلمان اور محمد نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فوجیں تیار کیں اور یورپ اور ایشیا دونوں میں کئی بار باہم لڑے۔ چاروں میں سے ہر کوئی باپ کی سلطنت کا تنہا وارث بننا چاہتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں ساختی سطح کی خامیوں میں سے ایک کا عکاس وقفۂ حکمرانی تھا۔ ایک بادشاہ کے بعد اس کی جانشینی کا کوئی باقاعدہ طریقہ موجود نہیں تھا۔ عثمانیوں کی سوچ شاید یہ تھی کہ باپ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں سے اہل ترین کسی نہ کسی طور تخت حاصل کر ہی لے گا۔ یوں بادشاہت اہل ترین شخص کو ہی ملے گی اور ریاست ہمیشہ طاقتور رہے گی۔ لیکن عملاً اس روایت کا نتیجہ تھا کہ ہر سلطان کی وفات کے بعد بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ یہ روایت سترھویں صدی میں سلطان احمد اول کی بدولت جانشینی کی شاہی حکمت عملی بننے تک جاری رہی۔

تاہم پندرھویں صدی کے اول میں ابھی شہزادوں کو آخری دم تک لڑتے رہنا تھا۔1413ء میں محمد کو بھائیوں پر حتمی فتح ہوئی اور وہ باپ کے سارے علاقوں کو اپنے زیرِ تسلط لے آیا۔ یہ اتنا اہم نہیں کہ وہ اس سارے عمل کے لیے کون سی عسکری حکمتِ عملی بروئے کار لایا جتنا یہ کہ گیارہ سالہ خانہ جنگی کے بعد بھی عثمانی سلطنت اپنی تشکیل نو میں کیسے کامیاب ہوگئی۔ اس کی وجہ وہ ادارے تھے جنھیں عثمانی اپنی سلطنت میں چودھویں صدی کے دوران بناتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ محمد نے خانہ جنگی جیتنے کے بعد اسلام کا نام استعمال کیا اور ترک سرداروں کو اپنے جھنڈے تلے لے آیا۔ اناطولیہ اور بلقان کی مسلم آبادی اسلامی سرحدوں کے محافظ ہونے کے ناتے عثمانیوں کا احترام کرتی تھی۔ سلطنت کے چار حصوں میں بٹ جانے کا مطلب بازنطینیوں کے مقابلے میں کمزور پڑنا تھا۔ محمد فاتح بنا تو اس خطے کے مسلمان، پہلے کی طرح، ایک بار پھر بازنطینیوں اور دیگر عیسائی ریاستوں کے خلاف ایک مضبوط اسلامی ریاست کی صورت متحد ہوسکتے تھے۔ علاوہ ازیں ترکوں نے اقتصادی میدان میں بھی ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں یعنی گلڈ سسٹم کو رواج دیا اور اس میں ترک اسلامی تشخص کو شامل کیا۔ ان میں سے ہر انجمن اخی (akhis) کہلاتی تھی۔ اس کے ذمے صنعتی پیداوار اور کاروبار کو قاعدے کلیے میں رکھنا تھا۔ یہ انجمنیں بالعموم صوفی سلسلوں سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔ کاروباری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے علاوہ اپنے اراکین کی روحانی اور مذہبی بہتری کی ذمہ دار بھی تھیں۔ یہی وہ اقتصادی بنیاد تھی جس کے بل بوتے پر عثمانی سلطانی وقفے (interregnum) کے بعد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتحادِ نو میں فوجی روایات کا بھی عمل دخل تھا۔ اورخان کے دور میں براہِ راست سلطان کی قیادت میں خدمات سرانجام دینے والے خاص فوجی دستے ترتیب دیے گئے تھے۔ ان دستوں کو ینی چری (yeniçeri) (نئے دستے) کا نام دیا گیا۔ سلطان بایزید کے زمانے تک ان دستوں میں شامل فوجیوں کی تعداد ہزاروں کو چھو رہی تھی۔ ینی چری میں زیادہ تر بھرتی بلقان کی عیسائی آبادیوں سے کی جاتی تھی۔ متنوع نسلی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگ سلطنت عثمانیہ سے وفادار دستوں کا حصہ بنتے تو عثمانیہ سلطنت کے تحت بسنے والے مختلف تمدنوں اور نسلوں کو باہم جوڑنے کا باعث بھی بنتے۔ عثمانیہ سلطنت کے موقر اداروں میں سے ایک میں بلغاروی، سرب، یونانی اور البانوی سب شامل کیے جاتے۔ کیتھولک لاطینی ممالک اور

بازنطینی سلطنت میں شاید اس کا تصور بھی محال تھا۔

مختصراً یہ کہ جب محمد نے 1410ء میں سلطنت کو متحد کر لیا تو اس کا تسلسل ایک بار پھر بحال ہوا لیکن وقفۂ سلطانی کے کچھ آثار بہرحال موجود رہے۔ سلطان مراد دوم (1421ء تا 1444ء اور 1446ء تا 1451ء) کے دورِ حکومت میں بازنطینی علاقے سلطنت میں شامل کیے جاتے رہے حتیٰ کہ اس کے پاس صرف قسطنطنیہ اور اس کا گرد و پیش رہ گیا۔ مراد نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے بازنطینی سلطنت کا یہ آخری نشان بھی مٹانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ محاصرہ کرنے کے باوجود وہ شہر کی بھاری بھرکم دیواریں نہ توڑ سکا۔ بظاہر ناقابلِ تسخیر اس قلعہ کی فتح کا چیلنج بھی اس کے بیٹے محمد دوم کو ورثے میں مل گیا جسے اسلامی تاریخ کے عظیم ترین جنرلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عثمانیہ سلطنت کی فتح

انیس سالہ محمد دوم 1451ء میں تخت نشین ہوا تو عثمانی بڑی حد تک جنوب مشرقی یورپ اور اناطولیہ کی سب سے بڑی طاقت بن چکے تھے۔ یہ ایک کثیر نسلی، لچکدار اور طاقتور سلطنت بن چکی تھی۔ خود محمد اس سلطنت کا بہترین عکاس اور نمائندہ تھا۔ وہ اپنے زیرِ نگیں علاقے کی کم از کم چھ بڑی زبانیں بڑی روانی سے بول سکتا تھا۔ اسلام پر خاص زور دیا جاتا تھا اور علماء کو بہت نوازا جاتا تھا۔ یہ سلطنت حقیقی اور معنوی ہر دو طرح سے یورپ اور ایشیا کو ملانے والا پل تھی۔ محمد ثانی نے دونوں کی علمی روایات کو باہم ملانے کے لیے بڑا کام کیا۔ اس کے عہد میں روایتی اسلامی علوم کے ماہرین اور یورپی آرٹسٹوں کو ایک جیسا نوازا جاتا رہا۔ اسے دیکھ کر ہارون الرشید اور صلاح الدین جیسے اوائل کے مسلم قائدین یاد آتے تھے جو علمی، فوجی اور سیاسی تینوں طرح کے معاملات میں ماہر تھے۔

دو چیزیں محمد کو مسلسل تکلیف دے رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ نسبتاً ناتجربہ کار تھا۔ اس نے نوعمری میں تخت سنبھال لیا تھا۔ فطری بات تھی کہ اس کے باپ کے ساتھ کام کرنے والے سیاستدان اسے معتبر نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل اس نے ایک بار پہلے بھی مختصر مدت کے لیے تخت سنبھالا تھا۔ تب وہ بارہ سال کا تھا۔ اس کے باپ نے ذمہ داریوں سے تہی پرسکون زندگی گزارنے کے لیے اس کے حق میں

تخت سے سبکدوشی اختیار کی تھی۔ لیکن جب اس کے اپنے وزیرِاعظم نے اس کا تختہ الٹ دیا تو وہ دورِ حکومت ختم ہوا اور اس کا باپ واپس آ گیا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد جب محمد دوبارہ تخت نشین ہوا تو حکومتی اور معاشرتی حلقوں میں شکوک وشبہات تھے کہ آیا وہ اتنی بڑی سلطنت چلا پائے گا۔ دوسری چیز قسطنطنیہ تھا جو اس کے پہلو کا خار بنا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خود کو اس بڑی سلطنت کے لیے اہل سلطان ثابت کرنے کے لیے پہلے اس دوسری خلش سے نجات پائے گا۔ یہ شہر اس کی سلطنت کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔ اگرچہ اب یہ پہلے جیسا طاقتور نہیں رہا تھا لیکن اس کے باوجود عثمانی تجارت اور فوجی نقل وحمل پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اس کو ختم کرنا عملی اعتبار سے بھی ضروری تھا۔ اس شہر کے ساتھ ایک مذہبی عنصر بھی جڑا ہوا تھا۔ حضرت محمدؐ نے 800 سال پہلے پیش گوئی کی تھی کہ مسلمان ایک روز اس شہر کو فتح کر لیں گے اور اس کی فاتح فوج اور جنرل واقعی حیران کن ہوں گے۔ چنانچہ تخت نشین ہوتے ہی محمد نے اس پیش گوئی کو پورا کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ یوں نہ صرف سلطنت مضبوط ہوتی بلکہ بطور سلطان وہ خود بھی مضبوط ہو جاتا۔

نسبتاً کمزور ہو جانے کے بعد بھی قسطنطنیہ ابھی تک ایسا قلعہ تھا جس میں کبھی شگاف نہیں ڈالا جا سکا تھا۔ بظاہر اس کا دفاع ناقابلِ شکست تھا۔ شہر تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ خشکی کی طرف تھوڑی سی دفاعی دیواریں تھیں۔ یہ دوہری دیواریں رومن عہد میں پانچویں صدی میں بنی تھیں۔ ان کی بلندی بارہ اور موٹائی چھ میٹر تھی۔ ان ہزار سالہ دیواروں نے کئی حملہ آور فوجوں کو اپنے سایوں تلے بکھرتے دیکھا تھا۔ ان میں ساتویں صدی کے اواخر میں بنو امیہ کے حملے بھی تھے۔ اگر محمد کو وہ رہنما بننا تھا جس کی تعریف وتوصیف رسولؐ نے کی تھی تو اسے نئی ٹیکنالوجی اور ایک نئی فوج کا انتظام کرنا ضروری تھا۔

اس نے شہر کے شمال میں چند کلومیٹر دور آبنائے باسفورس کے کنارے ایک قلعہ بنوایا۔ اس قلعہ کے سامنے دوسری طرف ایسا ہی ایک قلعہ اس کے پڑدادا بایزید اول نے بھی بنوایا تھا۔ یہ دو قلعے آبی گزرگاہ کی ناکہ بندی کے لیے بنوائے گئے تاکہ بازنطینیوں کو بحیرہ اسود سے کوئی کمک نہ پہنچے۔ شہر کی دیواروں کا توڑ کرنے کے لیے سلطان نے ہنگری کے انجینئر کو ایسی بڑی توپ بنانے کا کہا جیسی دنیا میں کبھی نہ بنی ہو۔ عثمانی بارود سے واقف تھے جو مسلم دنیا نے چین سے لیا تھا لیکن ابھی تک جنگوں

میں فیصلہ کن ہتھیار نہیں بنا تھا۔ اس توپ کی لمبائی آٹھ میٹر تھی۔ یہ 250 کلوگرام کا گولہ ڈیڑھ کلومیٹر دور تک پھینک سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی مضبوط ترین دیوار کے لیے طاقتور ترین توپ کی ضرورت تھی۔ اس نے یورپ اور ایشیا میں موجود اپنی فوجوں سے ایک لاکھ فوج بنائی۔ ان میں بلقان کی باجگزار ریاستوں کے عیسائی بھی شامل تھے۔ محمد اس مہم میں بہت کچھ خطرے میں ڈال رہا تھا۔ اگر اتنی تیاریوں کے بعد بھی وہ ناکام رہتا تو خود سلطنت کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔

خود قسطنطنیہ کے اندر پھوٹ پڑ رہی تھی جو اس نوعمر سلطان کے حق میں تھی۔ بازنطینی شہنشاہ کانسٹنٹائن یازدھم (Constantine XI) کا خیال تھا کہ بچنے کے لیے کیتھولک چرچ سے مدد لینا ضروری ہے۔ لیکن کئی لوگوں کے ذہن میں کیتھولک صلیبیوں کے ہاتھوں تیرھویں صدی میں ہونے والی تباہی کی یادیں موجود تھیں۔ پھر آرتھوڈوکس عیسائیوں کا ایک گروہ موجود تھا جو مغرب کے ساتھ کسی تعاون کے سخت خلاف تھا۔ قلعے کا دفاع کرنے کے لیے اٹلی کے سپاہیوں کے کچھ دستے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس کے باوجود قلعے کو بالآخر فتح ہو جانا تھا۔ اس کی بڑی وجہ شہر کے اندر موجود نااتفاقی تھی۔

قلعے کو فتح کرنے کے باوجود محمد نے قسطنطنیہ کے شہریوں کو جبراً مسلمان نہیں کیا۔ وہ فتح سے پہلے کی طرح اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد تھے۔

اپریل 1453ء میں عثمانی فوجیں اس داستانوی شہر کی دیواروں تک پہنچ گئیں۔ شہر کی مضبوط اور بھاری دیواروں کے پیچھے موجود چند ہزار فوجی بڑی بہادری سے لڑے لیکن حملہ آوروں نے مسلسل گولہ باری کی۔ وہ قلعہ کی دیواروں کے اوپر سے اور ان کے اندر سے مسلسل شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر انھوں نے ستر بحری جہاز دو میل تک خشکی پر پھسلانے کے بعد شہر کی بندرگاہ میں پہنچا دیے۔ اس آخری کوشش نے عثمانیوں کو فتح دلا دی اور بالآخر 29 مئی 1453ء کو وہ اس داستانوی شہر پر قابض ہو گئے۔ اب محمد نے ''فاتح'' کا لقب اختیار کیا اور اس شہر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اب محمد فاتح کے پہلو کا خار نکل گیا تھا۔ ساری اسلامی دنیا میں وہ ایک ایسی سلطنت کے بادشاہ کی حیثیت

سے مشہور ہو گیا جس نے 800 سال پہلے ہونے والی پیش گوئی سچ ثابت کر دی تھی۔ اب عثمانیہ بلاشبہ مسلم دنیا کی عظیم ترین سلطنت کہلا سکتی تھی۔ 195 سال پہلے بغداد کی تباہی کے بعد مسلم دنیا اپنی تاریخ کے سب سے نچلے درجے پر چلی گئی تھی۔ لیکن اب مسلمان اپنی سرحدوں کو پھیلانے اور نئی سرحدیں بنانے کو ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

عثمانیوں کی قسطنطنیہ کی فتح محض ایک پرانے حریف پر فوجی غلبے سے زیادہ اہم تھی۔ یہ بطور کثیر تمدنی اسلامی سلطنت کے اسلام کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی علامت تھی۔ خلفائے راشدین اور بنوامیہ کی فتوحات اور اسلام کے لیے نئے علاقوں کے حصول کو صدیاں گزر چکی تھیں۔ ان ابتدائی سالوں میں مسلمانوں نے دمشق، مدائن اور ٹولیڈو جیسے قدیم شہر فتح کیے اور مقامی روایات کو اسلام میں ملا کر ایک مخلوط تمدن دیا۔ عثمان نے قسطنطنیہ میں، جو بعد ازاں استنبول کے نام سے مشہور ہوا، وہی پرانا امتزاجی عمل دہرایا۔ اس عثمانی دارالحکومت میں بازنطینی، یونانی اور رومن روایات کو اسلامی تناظر میں نئی زندگی ملی۔ تمدنوں کے اس ملاپ کی ایک مثال استنبول میں آج بھی نظر آتی ہے۔ چھٹی صدی میں بازنطینی جسٹینین (Justinian) نے آیا صوفیہ کے نام سے ایک چرچ بنوایا۔ یہ صدیوں تک بازنطینی مسیحی قوت و اختیار کی علامت بنا رہا۔ عثمانی فتوحات کے بعد اسے مسجد میں بدل دیا گیا۔ اس کے باوجود شہر میں اس کا مرکزی مقام باقی رہا۔ اس کا گنبد ترک معماروں کے لیے نمونے اور تحریک کا کام دیتا رہا۔ محمد دوم، سلمان اور احمد اول کی بنوائی مساجد میں اسی ایک گنبد کا بنیادی نمونہ ملتا ہے۔ لیکن اسلامی ضروریات کے مطابق ان میں میناروں کے اضافے کیے گئے اور مسیحی اشکال کی بجائے آیات قرآنی سے سجاوٹ کی گئی۔ تاریخ کی اولین اسلامی فتوحات کے عین مطابق مفتوح کے تمدن کو ہٹا کر فاتح کا تمدن نمایاں نہیں کیا گیا بلکہ دونوں تمدنوں کے امتزاج کی ترویج کی گئی۔

عثمانیوں کا زریں دور

محمد فاتح نے سلطنت کی عسکری توسیع کا سلسلہ جاری رکھا۔ جلد ہی اسلامی پرچم سربیا، بوسنیا، البانیہ اور مالدووا (Moldova) پر لہرانے لگا۔ اس نے اپنے آخری سالوں میں ایک فوجی مہم خود روم پر قبضے کے

لیے اٹلی بھیجی لیکن اس کی وفات کا سن کر یہ مہم ملتوی ہوگئی۔ اس کے جانشینوں یعنی بایزید ثانی اور سلیم اول نے فوجی اور اقتصادی پھیلاؤ کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلیم اول کا زمانہ بڑا مختصر یعنی 1512ء سے 1520ء تک آٹھ سال کا تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں عثمانیوں نے نئی قائم ہونے والی صفوی سلطنت کو شکست دی اور مصر کی ساری مملوک سلطنت عثمانی قلمرو میں شامل کر لی۔ اسلامی دنیا کے روایتی مرکزی علاقے بشمول شام، مصر، مکہ اور مدینہ عثمانی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ دراصل یہ سلطنت اب کچھ مذہبی کردار بھی سنبھالنے لگی تھی۔ مکہ، مدینہ اور یروشلم تینوں کی حفاظت ترک سلطانوں کے حصے میں آ گئی۔ برائے نام عباسی خلافت جو مصر میں مملوکوں کی زیرِ سرپرستی موجود تھی، اس وقت باقاعدہ ختم ہوگئی۔ سلطان سلیم اول کو پہلے عثمانی خلیفہ کا لقب ورثے میں حاصل ہوا۔ مسلم دنیا کی طاقتور ترین ریاست اور خلافت کے حاصل ہونے کے مضمرات میں ایک یہ تھا کہ وہ محافظ اسلام کا کردار اپنائیں۔ یہ اور بات ہے کہ ترک حکمرانوں نے اپنے لیے یہ لقب شاید ہی استعمال کیا ہو۔ درحقیقت سولھویں اور سترھویں صدیوں میں عثمانیوں نے شمالی افریقہ اور انڈونیشیا تک کے دور دراز علاقوں میں بڑھتی ہوئی یورپی قوت کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی۔

عثمانی سلطنت کی ماہیت اسلامی ہونے کا مطلب غیر مسلموں پر جبر واستبداد نہیں تھا۔ غیر مسلموں کو، اسلامی قانون کے عین مطابق، اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ ترک تو ایک قدم اور آگے چلے گئے تھے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو ملک کے اندر نیم خودمختار کمیونٹیاں بنانے کی اجازت دی گئی۔ اسے ملت سسٹم کہا جاتا تھا۔ اس کے تحت اقلیتوں کو اجازت تھی کہ ان کے اپنے منتخب کردہ نمائندے ترک حکومت میں ان کی نمائندگی کریں۔ یہ اقلیتی رہنما عثمانی سلطان اور سلطنت کے اندر مختلف عقائد کی حامل کمیونٹیوں کے درمیان واسطے کا کام کرتے تھے۔ عثمانی سلطنت میں موجود مختلف چرچوں کی نمائندگی کے لیے درجنوں کے حساب سے ملت وجود میں آ گئے۔ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلم حکومت کے لیے اپنی آبادی کو حکومت میں شامل کرنا اور مجتمع رکھنا بڑا اہم کام تھا۔ اس زمانے کی کئی یورپی سلطنتوں کے برعکس ترکوں نے اپنی سرحدوں کے اندر نسلی اور مذہبی متجانس آبادی کو اپنے استحکام اور قوت کی شرط قرار نہیں دیا۔ اس سلطنت کو عظیم بنانے والے امور

میں سے اہم ترین یہ تھا کہ اس میں مختلف طرح کے لوگوں کو اپنے اندر سموئے رکھنے اور ان کی نوع بہ نوع صلاحیتوں کو سلطنت کی فلاح کے لیے استعمال کرنے کی اہلیت موجود تھی۔

بلاشبہ عثمانیہ سلطنت کا زریں دور 1520ء سے 1566ء تک سلطان سلیمان کا چھیالیس سالہ زمانہ تھا۔ ان سالوں میں عثمانیہ سلطنت کی وسعت اپنے عروج پر تھی۔ جزیرہ نما بلقان، جزیرہ نما عرب اور شمالی افریقہ سمیت ساری عرب دنیا، ایران اور کوہ قفقاز کے کئی حصے عثمانیہ سلطنت میں شامل تھے۔ بلغراد (Belgrade) اور رہوڈز (Rhodes) کے غیر مفتوحہ علاقوں پر سلطان نے خود فوج کشی کی۔ تاہم 1526ء میں ویانا کا محاصرہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس طرح یہ سولھویں اور سترھویں صدیوں میں مسلم اور عیسائی دنیاؤں کا سرحدی علاقہ بنا رہا۔ مسلسل توسیع سے مالِ غنیمت حاصل ہو رہا تھا جو سلطنت کے اندر سے گزرتی تجارتی شاہراہوں کی بدولت پہلے سے موجود دولت میں اضافہ کرتا رہا۔ بے پناہ مالی وسائل کی حامل اس سلطنت نے اسی دور میں بہت سے تمدنی کارنامے سرانجام دیے۔

سلطان نے بہت سی انتظامی اصلاحات کیں۔ مثلاً سلطنت کے اندر کاشتکاروں پر ٹیکس کی شرح کم کر دی۔ اس کے نتیجے میں بقیہ یورپ سے بہت سے عیسائی کاشتکار بھی سلطنت عثمانیہ میں رہنے اور کام کرنے کے لیے اٹھ آئے۔

سلیمان کو سارے سیاسی، فوجی اور اقتصادی اختیارات حاصل تھے۔ اس لیے سلطان نے عثمانیہ سلطنت کے قانونی نظام میں بڑی تبدیلیوں کا اہتمام کیا۔ اس نے اپنے مفتی اعظم ابوسعود آفندی کے ساتھ مل کر سلطنت کا سارا قانون از سرِ نو لکھا۔ مفتی اعظم ملک میں اعلیٰ ترین قانونی عہدہ تھا۔ پہلے کی مسلم ریاستوں کی طرح عثمانیہ قانون کی بنیاد بھی قرآن اور حدیث پر رکھی گئی۔ یوں قوانین کا بنیادی ڈھانچہ وہی رہا۔ لیکن روزمرہ کے دنیاوی معاملات سے متعلق سابقہ سلطانوں کے قائم کردہ قوانین پر غور ضروری تھا کہ آیا وہ ایک دوسرے یا شریعت سے متصادم تو نہیں ہیں۔ بیکار، باہم متضاد اور غیر اسلامی قوانین ختم کر دیے گئے۔ اس کام کے نتیجے میں ایک سیدھا اور کارآمد قانونی ضابطہ قائم ہوا جو صدیوں

سلطنت چلانے میں کام دیتا رہا۔ اسی لیے سلطان کی رعایا اسے پیار سے ''قانونی'' (Kanuni) کے نام سے یاد کرتی رہی۔

1566ء میں سلطان کا انتقال ہوا تو اقتدار سلیمان دوم کو منتقل ہو گیا۔ انتظامی اور فوجی صلاحیتوں کے اعتبار سے سلیمان اول کا یہ چہیتا بیٹا کسی طرح بھی اپنے باپ جیسا نہیں تھا۔ اس نے ایک غلط مشورے پر 1571ء میں قبرص پر حملہ کر دیا۔ عثمانیہ سلطنت کے خلاف فوراً ایک متحدہ عیسائی محاذ بن گیا۔ اسی سال لیپانٹو (Lepanto) کی لڑائی میں عیسائی یورپ کو بالآخر سلطان کے خلاف ایک فیصلہ کن کامیابی ملی اور بحیرہ روم میں عثمانی بحری برتری ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لیکن عثمانیہ سلطنت اتنی کمزور نہ تھی کہ یہ ایک شکست اسے کسی بڑے اور مہلک خطرے سے دوچار کر دیتی۔ سلیم دور حکومت کے بعد بھی سینکڑوں سال تک عثمانی ایک بڑی یورپی طاقت سمجھے جاتے رہے۔ تاہم سولھویں صدی کے بعد فتوحات کا عثمانی دور ختم ہو گیا۔ جیسے جیسے عثمانی اپنی فوجی اور سیاسی قوت کی حدوں کو چھو رہے تھے، یورپی اقوام ٹیکنالوجی اور معاشرت میں ان کی ہمسر ہو رہی تھیں۔ عثمانیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا لیکن طاقت کا توازن پوری طرح اٹھنے میں ابھی کئی صدیوں کا وقت باقی تھا۔

صفوی سلطنت

پندرھویں صدی میں ترک بڑی تیزی کے ساتھ عروج پر پہنچے۔ اس کے فوراً بعد مشرق میں ان کی حریف ایک سلطنت وجود میں آئی۔ اس صفوی سلطنت کا آغاز کئی طرح سے عثمانی شروعات سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن دنیا کے متعلق اس کا اندازِ فکر اور مذہبی ڈھانچہ دونوں عثمانیوں سے بالکل مختلف تھے۔ سولھویں سے اٹھارھویں صدی تک ان دو سلطنتوں کے تنازعات نے آئندہ کئی صدیوں کے لیے مشرق وسطیٰ کے مذہبی خدوخال کا تعین کر دیا۔ اس کے نتائج آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

آبپاشی کا پانی اٹھانے اور دھکیلنے کے لیے ہوا چکی گیارھویں صدی کے ایران میں استعمال ہو رہی تھی۔

پندرھویں صدی میں تیمور کی سلطنت کو زوال آیا اور یہ ختم ہوئی تو ایران میں طوائف الملوکی اور بدنظمی کا دور شروع ہوا۔ کوئی ایک گروہ پورے علاقہ کو قابو رکھنے کا اہل نہ تھا۔ علاقے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہمہ وقت باہم لڑتی رہتی تھیں۔ کوئی مرکزی مقتدرہ نہ ہونے کے باعث متنوع خیالات وافکار ابھرتے اور پھیلتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ کچھ مسلمہ فکری ڈھانچوں سے متصادم بھی ہوتے تھے۔ ساتویں صدی میں فتح ہونے کے بعد سے ایران سنی اکثریت کا علاقہ چلا آرہا تھا۔ اب اس کے شمال میں ایک ترک صوفی سلسلے صفویوں کے زیرِ قیادت ایک شیعہ تحریک شروع ہوگئی تھی۔ اس سلسلے کی جڑیں تیرھویں صدی تک جاتی تھیں جب منگول حملوں نے شورش اور بدامنی برپا کررکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ، دیگر صوفی سلسلوں کے برعکس زیادہ سریّت زدہ اور موروثی ہوتا جارہا تھا۔ بالآخر اس سلسلے نے بارہ امامی شیعیت کو اپنا باقاعدہ عقیدہ قرار دیا۔ شیعہ حکومتیں پہلے بھی بنی تھیں لیکن یہ اثناءعشری یعنی بارہ امامی نہ تھے۔ اس کی وجہ اثناءعشریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بارھواں امام غیب میں ہے اور آخری زمانے میں انسان کا نجات دہندہ بن کر آئے گا۔ چنانچہ زیادہ تر اثناءعشری کہتے تھے کہ اس امام کے ظہور تک سیاسی سرگرمی معطل رکھی جائے گی۔ صفویوں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے استدلال کیا کہ چونکہ اس سلسلے کے قائدین حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہیں اور وہ امام غائب کے ساتھ رابطے میں ہیں چنانچہ انھیں موروثی شیعہ گروہ بنانے کا حق حاصل ہے۔

ان سیاسی اور مذہبی جوازوں کو ملا کر صفویوں نے پندرھویں صدی کے اواخر میں سلطنت قائم کرلی۔ عثمان اور اس کے جانشینوں کی طرح صفویوں نے بھی اپنے ساتھ ملحق مسیحی علاقوں اور بالخصوص اپنے آذربائیجانی علاقوں سے شمال میں قفقاز میں اپنی فوج داخل کردی۔ صفویوں کی بڑھتی طاقت اور ان کے غیر روایتی عقائد کے باعث دیگر ایرانی علاقوں کے سنی حکمرانوں نے ان کی مخالفت کا راستہ اپنایا۔ 1488ء میں صفوی رہنما مارا گیا اور اس گروہ کی قیادت اس کے دوسالہ لڑکے اسمٰعیل کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنا سارا بچپن چھپ کر گزارا۔ اس کی حفاظت کے ذمہ داران سرخ ٹوپیاں پہنتے تھے اور اسی لیے قزلباش (ترکی بمعنی سرخ ٹوپی) کہلاتے تھے۔ اسمٰعیل بڑا ہو کر ایک قابل فوجی قائد بنا۔ وہ قزلباشوں کا لشکر لے کر آذربائیجان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے وہاں کے حاکم ترک شہزادے کو شکست

دی اور 1501 میں شہر تبریز کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور 1510 تک وہ ایران کے زیادہ تر علاقوں پر قابض ہو چکا تھا۔

صفوی علاقے کو پھیلانے میں اسمٰعیل نے دو امور کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ان میں سے ایک تو ایران کے باقی علاقوں کے حاکموں کی باہمی لڑائی تھی اور دوسرے اس نے ایرانی معاشرت میں زیریں سطح پر موجود ایرانی قومیت کے احساس کو بھی استعمال کیا۔ ساتویں صدی میں عربوں کا مفتوح ہونے کے بعد سے ایران میں کوئی مقامی ایرانی حکومت نہیں بنی تھی۔ عربوں اور ان کے بعد ترکوں اور منگولوں نے خطے پر تسلط قائم کیے رکھا لیکن عامتہ الناس میں قبل از اسلام کے تشخص کے ساتھ وفاداری موجود تھی۔ اسمٰعیل اسی تشخص کو ابھارنے اور استعمال کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے قبل از اسلام کی عظیم ایرانی سلطنتوں میں بادشاہ کے لیے استعمال ہونے والا لقب ''شاہ'' اپنے لیے اختیار کیا اور عامتہ الناس کے اذہان میں اس دور کو زندہ کیا۔ فارسی زبان کو حکومتی اور رابطے کی زبان کا درجہ دیا گیا۔ سلطنت میں زیادہ علاقائی اہم آہنگی نے ایرانی قومیت اور اثناء عشریت کو باہم ملا دیا۔ شیعیت کی یہ شاخ ریاست کا سرکاری مذہب قرار پائی اور اسے تمام آبادی پر مسلط کر دیا گیا۔ سنی اسلام ممنوع قرار پایا۔ سنی آبادی سے کہا گیا کہ وہ شیعہ ہو جائیں، نکل جائیں یا موت قبول کر لیں۔ دوسرے علاقوں، بالخصوص لبنان اور عراق سے شیعہ عالم منگوائے گئے تاکہ باقی رہ جانے والے سنی علمی آثار کو ختم کریں اور عامتہ الناس کو ان کے نئے مذہب کی تعلیم دیں۔ ابوحنیفہ، ابن سینا اور البخاری جیسے عظیم سنی عالموں کی سرزمین فوراً شیعہ تحریک کا مرکز بن گئی۔ لیکن اسمٰعیل صرف ایرانی حدود میں بسنے والی آبادی کے عقائد بدلنے پر قانع نہ ہوا۔ اس نے اپنے مبلغین اناطولیہ جیسے سنی آبادی کے عثمانی علاقوں میں ملک سے باہر بھی بھیجے۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ وہاں بھی شیعیت قبول کریں اور سنی عثمانیوں کے خلاف بغاوت کر دیں۔

اسمٰعیل کی بدقسمتی تھی کہ سولھویں صدی کی دوسری دہائی میں جب اس نے تبلیغی کام شروع کیا تو عثمانی سلطنت پر سلیم اول کی حکومت تھی۔ سلیم اول کو یاوز (Yavuz) یعنی باعزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی سلطنت میں غیر ملکی مداخلت اور بالخصوص اسلام کی غیر روایتی شکل کی ترویج پر وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے 1514ء میں صفوی سلطنت پر حملہ کیا تاکہ اسمٰعیل اور اس کی فوج

دونوں کو ختم کر دے۔ دونوں افواج کا آمنا سامنا دارالحکومت تبریز کے نزدیک چیلدران (Chaldiran) میں ہوا۔ صفویوں کا مذہبی جوش وخروش عثمانی توپوں اور بندوقوں سے ٹکرایا اور عثمانی جیت گئے۔ اسمٰعیل میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس کے تقدس کا ہیولیٰ ہمیشہ کے لیے داغدار ہو گیا۔ اسمٰعیل نے بقیہ زندگی غالباً یاسیت اور نشے میں گزاری۔ وہ طاقتور سنی ریاست کے ہاتھوں ہونے والی شکست کا مداوا ساری عمر نہ کر سکا لیکن اس کی سلطنت کو نقصان نہیں پہنچا۔ سلیم صفوی علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کر سکا۔ اس کے برعکس جنگ نے صفوی حکومت کو ختم کرنے کی بجائے اس کی سرحدوں کا تعین زیادہ واضح طور پر کر دیا۔ یہ سرحد اگلی صدیوں میں بھی قائم رہی اور آج بھی بڑے ردوبدل کے بغیر سنی ترکی اور شیعہ ایران کو الگ الگ کرتی ہے۔

اسمٰعیل کی قائم کردہ سلطنت اس کے پوتے عباس اول کے زمانے میں یعنی 1587ء تا 1629ء اپنے عروج پر تھی۔ جب صفویوں کی ترک سرحد مستحکم ہو گئی اور لڑائیاں کم ہو گئیں تو عباس نے ایرانی تمدن کے احیاء پر بھرپور توجہ دی۔ سنی علماء کے نزدیک انسانی شبیہہ کی مصوری بالعموم ممنوع رہی ہے۔ یہ مصوری صفوی دور میں خوب پھلی پھولی۔ ایرانی منی ایچر فنکارانہ اظہار کا بڑا واسطہ بنی اور اس نے ہمسایہ مسلم ریاستوں کے آرٹ کو بھی بڑا متاثر کیا۔ معاصر یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کا دور دورہ تھا اور حقیقی مناظر کو مصور کیا جا رہا تھا۔ اس کے برعکس صفوی منی ایچر کا مقصد حقیقی مناظر کی پیش کاری نہیں تھا۔ انھیں مسودات کے مصور مرقع تیار کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دراصل یہ کہانی کے معاون مواد کا کام دیتے تھے۔ منی ایچر کے ساتھ ساتھ داستان نویسی کے ایرانی فن کا احیاء بھی ہوا۔ قبل اسلام کی رزمیہ داستانوں کو حیاتِ نو ملی اور ایرانی لوگوں کی نئی کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ مثلاً شاہنامہ میں قبلِ اسلام کی ایرانی تاریخ نظم کی گئی۔ یہ نظم اس لیے بھی بدنام ہوئی کہ اس میں صفوی رعایا کو قبل اسلام کی تاریخ اور تمدن اپنانے کی ترغیب دی گئی تھی۔ صفوی قوت اور تمدن کا سب سے بڑا منشور اس عہد کے فنِ تعمیر اور شہری آبادکاری میں سامنے آیا۔ شاہ عباس اول کے دارالحکومت اصفہان میں مرصع سرکاری عمارات اور مساجد کی تعمیر ہوئی۔ عمارتوں کے ساتھ وسیع باغات بنائے گئے اور عمارتوں کی سجاوٹ میں جیومیٹری کی پیچیدہ اشکال اور خطاطی سے کام کیا گیا۔ یہ عمارتیں سترھویں صدی کے صفوی ایران

کی دولت کی مظہر ہیں۔ اس عہد کا ایرانی فنِ تعمیر اتنا مسحور کن ہے کہ فارسی میں ہی کہنا پڑتا ہے
''اصفہان نصف جہان۔''

مغل

تیسری عظیم مسلم بارود (gun powder) استعمال کرنے والی سلطنت مشرق کی طرف ہندوستان میں بنی۔ برصغیر ہندوستان کے شمالی علاقوں پر سلاطین دہلی تیرھویں صدی کے اوائل سے حکومت کر رہے تھے۔ عرب، فارسی اور ترکی تمدنوں کا مقامی ہندوستانی تمدن کے ساتھ بتدریج امتزاج ہوا تو منفرد ہند اسلامی تہذیب وجود میں آئی۔ سولھویں صدی کے اوائل میں یہاں مسلم سیاسی قوت ماند پڑنے لگی تھی لیکن آبادی کا اتنا بڑا حصہ ضرور مسلمان ہو کر اسلامی تمدن اپنا چکا تھا کہ کوئی بھی نئی اسلامی سلطنت با آسانی برصغیر پر گرفت رکھ سکتی تھی۔

مغل سلطنت کی بنیاد وسط ایشیا کے ایک ترک فاتح بابر (1483ء تا 1530ء) نے رکھی۔ اسے چنگیز خان اور تیمور کی براہِ راست اولاد ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس کا یقین تھا کہ اسی شجرہ نسب کی بدولت وہ بھی ایک عظیم سلطنت کا بانی بنے گا۔ آج کے ازبکستان میں اس کے باپ کی چھوٹی سی ریاست تھی۔ وہ اس ریاست کے حاکم کی حیثیت سے کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ وہ سمرقند کا بڑا شہر اور وادی فرغانہ میں اپنا آبائی علاقہ کھو بیٹھا اور اسے وفاداروں کے ایک مختصر دستے کے ہمراہ علاقے سے بے دخل کر دیا گیا۔ بالآخر اس نے افغان پہاڑی علاقے کابل میں اپنی حکومت مستحکم کر لی۔ اس نے خطے کے باہمی عدم اتفاق اور سیاسی عدم استحکام سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ اپنے اس ٹھکانے سے بابر نے کئی بار اپنے وسط ایشیا والے علاقے فتح کرنے کے لیے حملے کیے اور بعض اوقات صفویوں سے بھی مدد لی لیکن بالآخر ناکام رہا۔ تب اس نے ہندوکش پہاڑی سلسلے کے دوسری طرف ہندوستان پر توجہ دی۔ اس نے 1524ء میں دہلی سلطنت پر حملہ کیا جہاں لودھی خاندان کی حکومت چل رہی تھی۔ اس نے 1526ء کی پانی پت کی لڑائی میں اس خطے کی واحد مسلم ریاست کو فیصلہ کن شکست دی اور دہلی میں تخت نشین ہوا۔ سولھویں صدی کے اواخر میں مغل سلطنت برصغیر کے زیادہ تر حصے پر چھا چکی تھی۔ کئی مثالیں ایسی

بھی ہیں کہ مغلوں سے رسمی وفاداری کے وصف پر مقامی ریاستوں کو فتح نہ کیا گیا۔ ہندوستان بہت سے متنوع اور باہم مختلف ٹکڑوں سے مل کر بنا تھا کہ اس طرح کے انتظام کے بغیر سیاسی استحکام ممکن نہ تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مشترکہ زبان اردو پر عربی، فارسی، ترکی اور ہندی اثرات ہیں۔ اس کا نام ہی ترکی لفظ Ordu بمعنی فوج سے ماخوذ ہے۔ اس لیے کہ ترک فوج کے پڑاؤ میں ہی یہ چاروں زبانیں باہم متعامل ہوئی تھیں۔

تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا لیکن کوئی مستقل سلطنت قائم نہ کی۔ اس کے برعکس بابر کی قائم کردہ سلطنت چار صدیوں تک باقی رہی۔ بابر خود کو منگول بتاتا تھا اس لیے اس کی قائم کردہ حکومت مغل کہلائی۔ لیکن مغل سلطنت میں منگول تمدن اور روایت کا اثر بہت معمولی تھا۔ بلکہ مغل حکومت نے عرب، ترک، ایرانی اور ہندی تمدنوں کے امتزاج کو سہولت دی۔ اپنے معاصر عثمانیوں کی طرح مغلوں نے بھی مختلف لوگوں اور متنوع روایات کو باہم قریب لانے کا اہتمام کیا۔ حالانکہ فارسی مسلم دنیا کی علمی اور ادبی زبان تھی لیکن مغل سلطنت کے بہت سے ہندو یہ زبان لکھ پڑھ سکتے تھے۔ اسی طرح ایرانی پس منظر کا حامل مسلم ماہرِ تعمیرات مقامی ہندو طرزِ تعمیر سے متاثر ہو سکتا تھا۔ ماہرِ تعمیرات معمار سینان (Mimar Sinan) کا ایک شاگرد عثمان تاج محل کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے ہندوستان آیا۔ مسلم دنیا کے دیگر حصوں کے مذہبی علماء کے لیے بھی ہندوستان میں بڑی کشش تھی۔ انھیں یہاں بذریعہ تبلیغ اسلام پھیلانے کے وسیع مواقع نظر آتے تھے۔

مغل بادشاہ اکبر (حکومت 1556 تا 1605ء) کے دور میں امتزاجی تمدن اور خیالات کا ماحول اپنے عروج پر تھا۔ وہ خود کو علوم وفنون کا سرپرست سمجھتا تھا اور بلالحاظ مذہب وملت علماء کی معاونت و سرپرستی کو تیار رہتا تھا۔ اس کی ایک وجۂ شہرت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دربار میں مختلف عقائد کے علماء کے مابین بحث ومباحثے بھی کرواتا تھا۔ ہندو، بدھ، عیسائی اور یہودی علماء کو دعوت دی جاتی کہ وہ دربار میں خدا اور مذہب کے اپنے اپنے عقیدے پر مسلم علماء کے ساتھ بحث کریں۔ بالآخر اکبر نے اپنے

مذہبی نظریات متشکل کر لیے۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اس طرح ہمہ نوع مذاہب کے مابین موجود خلیجوں اور فاصلوں کو پاٹ سکتا ہے۔ اس نے اپنے اس نئے مذہب کو دینِ الٰہی کا نام دیا۔ وحدانی اسلام اور تکثیری ہندومت اپنی ساخت کے اعتبار سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اکبر نے اپنے مذہب میں الوہی معاملات سے زیادہ توجہ انفرادی اور شخصی رویے کو دی۔ مختصر یہ کہ دینِ الٰہی کچھ زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ لگتا تھا کہ اس کے اقرار کرنے والے بھی محض بادشاہ کے قریب ہونے میں کوشاں تھے۔ یہ مذہب اکبر کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس کا مختصر دورانیہ بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ ہمہ نوع مغل ہندوستان میں تمدنی، معاشرتی اور حتیٰ کہ، مذہبی امتزاج کس اعلیٰ سطح پر موجود تھا۔

اس کے بعد آنے والے بادشاہوں نے روایتی اسلام کی طرف مراجعت کا راستہ اپنایا۔ اس مراجعت کی معراج چھٹے مغل بادشاہ اورنگ زیب (حکومت 1658ء تا 1707ء) میں نظر آئی۔ اس کا دورِ حکومت مغل عروج کا زمانہ تھا۔ اس کا شاہی لقب عالمگیر تھا یعنی فاتحِ عالم۔ اس لقب کی وجہ پورے ہندوستان کی فوجی مہمات تھیں۔ اس کے انچاس سالہ دورِ حکومت کی امتیازی خصوصیات بڑھتی ہوئی فوجی سرگرمیاں، ذاتی تقویٰ اور اسلامی علوم کی سرپرستی تھیں۔ مشہور ہے کہ اورنگ زیب کے باپ شاہجہاں نے زرِ کثیر سے اپنی بیوی اور اس کی ماں کا مقبرہ تاج محل کے نام سے بنوایا تو اس نے اختلاف کیا۔ وہ اسے سرمائے کا زیاں اور پیغمبرؐ کی تعلیمات کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق شرعی مسائل پر ایک مبسوط مجموعہ تیار کروانے کے لیے سینکڑوں علماء سے کام کروایا۔ اس کاوش کا نتیجہ فتاویٰ عالمگیری کے نام سے سامنے آیا۔ مذہبی احکامات کا یہ مجموعہ حنفی مکتبِ فکر پر مبنی ہے۔ یہ عالمگیری حکومت کا سرکاری ضابطہ قانون تھا۔ اس نے مدینہ کی اولین مسلم ریاست کی طرز پر ہندوستان میں شرعی قوانین نافذ کر دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان بھر میں اس کی مقبولیت زیادہ بڑھنے لگی۔ اس لیے کہ پہلے سے چلے آنے والے کئی ٹیکس غیر اسلامی قرار دے کر ختم کر دیے گئے اور عوام پر مالی بوجھ کم ہو گیا۔

عوام کے ساتھ تعلق کے حوالے سے آج اورنگ زیب کو متعصب اور تنگ نظر حکمران کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے متعلق عام تاثرات سے پتہ چلتا ہے کہ جدید سیاست ماضی کے متعلق عوام

کے ذہنوں پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے عہد میں ہندوستانی طول وعرض میں کئی مندر گرائے گئے تھے۔ اس حقیقت کا باریک بینی سے تجزیہ ضروری ہے۔ جدید مورخین اور مصنفین نے اس تاریخی صداقت کو اس کے اسلامی جذبے کے ساتھ ملا کر اورنگ زیب کو تنگ نظر اور متعصب حاکم بنا دیا۔ لیکن اگر بطور حاکم اورنگ زیب اور خود ہندوستان کی مغل حکومت کا تجزیہ کرنا ہے تو مندر گرانے کے وقوعات کو سمجھنا ہوگا۔ سترھویں صدی کے ہندوستان میں مندر عبادت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی مراکز بھی تھے۔ ان مندروں کے ذمہ داران اپنے اپنے علاقوں میں مغل حکومت کے سیاسی افسران کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ ان کا کام امن وامان قائم رکھنا اور حکومتی عملداری کو برقرار رکھنا تھا۔ کچھ مندروں کے ذمہ داران نے مغل حکومت کے خلاف سیاسی بغاوت منظم کرنا شروع کر دی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں اور خصوصاً سترھویں صدی کے اواخر میں مرہٹہ کنفیڈریشن بننے کے بعد ان سرگرمیوں میں تیزی آ گئی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں گرائے گئے مندر اسی طرح کے تھے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں مغل شہنشاہ کی نظر میں ان مندروں کی تباہی سیاسی جبر نہیں بلکہ سیاسی بقاء کا مسئلہ تھا۔ درحقیقت اورنگ زیب عہد میں پورے ہندوستان کے اندر بہت سے نئے مندر بنائے گئے۔ بہت سے ہندو اورنگ زیب کے مشیروں میں شامل تھے۔ آج تاریخ کا سطحی مطالعہ بہت سے خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ ان میں سے ایک خطرہ جدید سیاسی تنازعات کو پرانی سیاسی شخصیات پر منطبق کرنے کا ہے اور یہ آج کے سیاسی تناؤ کے ماحول میں خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔

بارودی سلطنتیں

عثمانی، صفوی اور مغل تینوں سلطنتوں کو بارودی سلطنتیں کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مسلم دنیا میں حکومتوں کا ایک نیا سلسلہ قائم کیا۔ تباہ کن منگول حملوں کی راکھ سے جنم لینے والی یہ حکومتیں مسلم دنیا کے ازسرِنو ابھرنے کی علامت تھیں۔ ان کے زیرِنگیں خطے الگ الگ تھے، سیاسی اہداف مختلف تھے اور باہمی مذہبی اختلافات کے باوجود ان کا اسلام پر مبنی ایک مشترکہ مرکزی تمدن موجود تھا۔ اسی آخری حقیقت کے باعث ان کے مابین مشابہت زیادہ ہے اور فرق کم۔ ایک تو تینوں کا مذہب عرب سے اٹھنے والا

اسلام تھا۔ دوسرے انھوں نے ایرانی دربار کے انتظامی اور تمدنی نمونے سے استفادہ کیا۔ تیسرے یہ کہ ان کا شجرہ ترک الاصل تھا۔ اگر سترھویں صدی کا ایک مسلمان جزیرہ نما بلقان سے چلتا، وسطی عرب سے گزر کر ایرانی بالائی علاقوں سے ہوتا ہوا ہندوکش کے پار برصغیر ہندوستان پہنچ جاتا تو اسے بے گانگی اور اجنبیت کا کچھ زیادہ احساس نہ ہوتا۔ مذکورہ بالا سلطنتوں کے زیرِنگیں علاقوں میں ایک ایسی ثقافتی وحدت پیدا ہوئی جس نے دنیا کے اس بڑے حصے کو باہم جوڑ دیا۔ اس اعتبار سے پرانی اور رومن بادشاہتوں میں ایسی کامیابی نظر نہیں آتی۔ ان تینوں کے درمیان ٹیکنالوجی کا تعاون بھی موجود تھا۔ بارود اور توپ کو بڑے پیمانے پر سب سے پہلے عثمانیوں نے استعمال کیا تھا۔ صفوی اور مغل ان کے نقشِ قدم پر چلے۔ یقیناً ان کے ہاں سائنسی اور تکنیکی کارنامے ویسے بلند پایہ نہ تھے جیسے عباسی زریں دور میں سامنے آئے۔ ان کا زمانہ مسلم تکنیکی برتری کا آخری دور تھا۔ جلد ہی یورپی طاقتوں کو برتری لے جانا اور بالآخر اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں میں ان تینوں کو تباہ کر دینا تھا۔

جدید مسلم دنیا کے حوالے سے ان تینوں کی ایک اہم اور مشترک صفت یہ تھی کہ وہ مسلم وحدت کو اپنے زمانے میں ناقابل عمل سمجھنے لگے تھے۔ امویوں اور عباسیوں نے سپین سے ہندوستان تک کے علاقوں پر حکومت کی تھی لیکن وہ سیاسی ماڈل بھی اب کارگر نظر نہیں آتا تھا۔ اگرچہ خلافت عثمانیوں کے پاس تھی لیکن اسلامی قانون کے بعض عالموں نے ہر خطے کے لیے الگ خلیفہ کا خیال بھی متعارف کروا دیا تھا۔ ایسا زمانہ بھی تھا کہ عثمانی سلطان مغل حکمرانوں کو خطوط لکھتے ہوئے انھیں امیر المومنین کہہ کر مخاطب کرتے۔ بعدازاں، اور بالخصوص انیسویں صدی کے اواخر میں عثمانی سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد میں، علامتی مسلم وحدت کے لیے کچھ کوششیں بھی ہوئیں لیکن ان بارودی سلطنتوں کے ابھرنے تک واحد مسلم سلطنت کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

گیارھواں باب

زوال

عثمانی سلطنت کے مسائل

اسلامی تاریخ ادوار میں چلتی نظر آتی ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں اسلام نے عرب کے صحراؤں سے اٹھ کر ایسی سلطنتیں بنائیں جنھیں تاریخ عالم کی طاقتور ترین سلطنتوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ گیارھویں سے تیرھویں صدی تک کے حملوں نے تاریخ کو الٹ کر رکھ دیا۔ مسلم دنیا سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے بکھر گئی۔ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں عثمانی، صفوی اور مغل سلطنتیں ابھریں تو دنیا کے سٹیج پر ایک بار پھر مسلم عروج کے آثار نظر آئے۔ سولھویں صدی کی تیسری دہائی میں ترک وسطی یورپ میں ویانا کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ ویانا فتح نہیں ہوا لیکن عثمانی یورپ کی سب سے طاقتور سلطنت رہے۔

عثمانیوں کا عروج بڑا تیز رفتار تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جمود اور پھر زوال کا سست اور لمبا دورانیہ دیکھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ 1566ء میں سلطان سلیمان کا عہد ختم ہوا تو ترکوں کا زوال شروع ہو گیا۔ اگرچہ اب بھی عثمانی یورپ کی طاقتور سلطنت تھے اور کئی دہائیوں تک رہے لیکن بعدازاں آنے والے زوال کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ عثمانی زوال کا آغاز ہوا تو مغربی یورپ کی ریاستوں کا عروج شروع ہوا۔ ان ریاستوں میں سے انگلینڈ اور فرانس سرفہرست تھیں۔ انھوں نے عثمانیوں کی پسپائی

کے باعث عالمی سٹیج پر پیدا ہونے والے طاقت کے خلا کو بھرنا شروع کر دیا۔

عثمانی زوال کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اب میدانِ جنگ میں فیصلہ کن فتح کے اہل نہیں رہے تھے۔ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں عثمانی ٹیکنالوجی کو دشمنوں پر واضح برتری حاصل تھی۔ انھوں نے ہی شہروں، مثلاً قسطنطنیہ کی دیواروں کو گرانے کے لیے بڑی توپوں کا استعمال شروع کیا۔ یہی حال ان کے دستی ہتھیاروں کا بھی تھا جنھوں نے بعدازاں رائفلوں کی شکل اختیار کر لی۔ بقیہ یورپ کو اس ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرتے دیر نہ لگی اور یوں میدانِ جنگ میں عثمانیوں کی یہ برتری ختم ہوگئی۔ اسی سے متعلقہ ایک امر یہ تھا کہ سلطنت کے بانی عثمان نے اپنی چھوٹی سی بیلک کے جنگجوؤں میں جو جذبات پیدا کیے تھے وہ سلطنت کی توسیع اور استحکام کا باعث بنے تھے۔ وہ جنگجو بدعنوانی اور نوکر شاہی کا شکار ہو گئے۔ سترھویں صدی کے آتے آتے یہ موثر لڑاکا فوج نہیں رہ گئے تھے۔ سلطنت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ اپنی وسعت کی اس حد کو جا پہنچی تھی جو اس کے لیے فطری طور پر ممکن ہو سکتا تھا۔ عثمانیوں میں سالانہ مہم جوئی کی ایک روایت موجود چلی آ رہی تھی۔ یہ فوجی مہم ہر سال بہار کے مہینوں میں استنبول سے نکلتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ انھیں علاقوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھی جہاں یہ خزاں کی آمد سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ یہ بات خصوصاً سلطنت کے شمالی علاقوں کے لیے ٹھیک تھی جہاں سردیاں پہلے آ جاتی تھیں۔ ویانا کا 1529ء کا محاصرہ اس کی اچھی مثال ہے۔ عثمانی فوج مئی میں استنبول سے نکلی اور سارا گرما بلقان میں سفر کرتی ہوئی ستمبر میں ویانا پہنچی۔ دوبارہ استنبول کی طرف چلنے پر مجبور ہو جانے سے پہلے سلطان کے پاس محاصرے کے لیے صرف چند ہفتے کا وقت تھا۔ نقل و حمل کی اس مجبوری کا مطلب تھا کہ عثمانی فوج ہنگری سے آگے پیش قدمی نہیں کر سکتی تھی۔ یعنی وسطی یورپ کے جرمن بولنے والے علاقے مستقلاً عثمانی دسترس سے باہر تھے۔ 1683ء میں ویانا پر ہونے والا دوسرا حملہ بھی اسی لیے ناکامی کا شکار ہوا۔

1699ء میں ہونے والے کارلوٹز (Karlowitz) معاہدے کے باعث عثمانی فوجی اہلیت کی حدود کا پتہ چل گیا۔ یہ معاہدہ اس چودہ سالہ جنگ کا اختتام تھا جس میں ایک طرف ترکی اور دوسری طرف زیادہ تر یورپ متحد تھا۔ اس میں عثمانیوں کو ان کی تاریخ میں پہلی بار اپنے کسی علاقے سے

دستبرداری پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ ہنگری جس میں سلیمان عثمانی افواج کی قیادت کرتا سولھویں صدی میں داخل ہوا تھا، مجبوراً ٹرانسلوانیا کے آسٹریا کے حوالے کر دیا گیا۔ یوکرین کے کچھ حصے پولینڈ نے لے لیے۔ اس حصے میں سلطان کے باجگزار مسلم کریمیائی تاتار بھی آباد تھے۔ سلطان کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی سلطنت میں عیسائیوں کے حقوق تسلیم کرے اور ان کی حفاظت کرے۔ عثمانی یہ کام اسلامی قوانین کے مطابق اور ملت سسٹم کے ذریعے کرتے چلے آئے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ عیسائیوں کی حفاظت والا مسئلہ ایک بیرونی طاقت سلطنت پر مسلط کر رہی تھی۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں میں اہلِ یورپ نے عثمانیہ سلطنت کے خلاف اسی حربے کو استعمال کر کے اس کے حصے بخرے کرنا تھے۔

عثمانیہ سلطنت کے لیے عسکری فتوحات کے قابل نہ رہ جانے کے شاخ در شاخ مضمرات تھے جو سلطنت کے دیگر پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوئے۔ اپنی اصل میں تو عثمانیہ ایک عسکری ریاست تھی۔ دولت فوجی فتوحات سے آتی تھی۔ مفتوحہ علاقوں اور ان کے لوگوں سے سلطنت کو مضبوط کیا جاتا تھا اور اس قوت کو مزید فتوحات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ چودھویں صدی سے سولھویں صدی کے وسط تک سلطنت کسی قابلِ ذکر رکاوٹ کے بغیر پھیلتی جا رہی تھی۔ چنانچہ اپنی عسکری ماہیت کے باعث عثمانیہ سلطنت کو اقتصادی اور معاشرتی فوائد حاصل ہو رہے تھے۔ اس طرح ایک کثیر نسلی سلطنت وجود میں آئی جسے جنگ سے وسائل میسر آ رہے تھے۔ فتوحات کا سلسلہ ختم ہونے پر اس سلطنت کو اپنی معیشت کے لیے نئی بنیادیں ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ ریاستی ماہیت میں اتنی بنیادی تبدیلی بہرحال ایک مشکل عمل رہا ہوتا۔ لیکن عثمانی سلطنت کے اسی بحرانی دور میں جو قیادت سامنے آئی وہ نااہل تھی۔ اس طرح اس سلطنت کے لیے ریاستی ماہیت کی تقلیب کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ اور مشکل ہو گیا۔

چودھویں صدی کے اوائل میں عثمان سے لے کر سولھویں سدی کے وسط میں زریں دور کے سلیمان عہد تک سلطنت کے انتظامی امور کا حتمی فیصلہ سلطان کے پاس رہا۔ سلطان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ میدانِ جنگ میں فوجوں کو لڑائے، وزیروں کے ذریعے حکومت چلائے، غیر ملکی ریاستوں کے ساتھ تعلقات پر ہدایات دے اور عالمِ اسلام کے خلیفہ کی حیثیت سے دین کا محافظ رہے۔ لیکن سلیمان کے بعد سلطنت کی ماہیت میں ایک یقینی تبدیلی آئی اور حکومت میں سلطان کا کردار بھی بدل

گیا۔سلیمان کے بعداس کے بیٹے سلیمان دوم کے دور سے سلطان کی دلچسپی ریاستی امور میں کم ہوگئی اور وہ محل کی آسائشوں کو زیادہ وقت دینے لگا۔ایک زمانہ تھا کہ سلطان خود فوجوں کی قیادت کرتا اور میدانِ جنگ میں ان کے پہلو بہ پہلو موجود ہوتا تھا۔ وہ اناطولیہ، بلقان اور مشرق وسطیٰ غرضیکہ ہر جگہ فوج کا حوصلہ بڑھاتا ان کے ہم قدم رہتا تھا۔تاہم سولھویں صدی کے اواخر میں سلطانوں نے فوجی مہمات کی قیادت اپنے نائبوں کے سپرد کرنا شروع کردی اور اپنے لیے استنبول کی آسائش کو ترجیح دی۔

سلطان احمد اول (حکومت 1603ء تا 1617ء) نے سلطنت کے جمود کو پختہ تر کردیا۔عثمانیوں میں تین سو سال سے تخت کے لیے جنگ کی روایت چلی آرہی تھی۔سلطان احمد نے اس روایت کو ختم کردیا۔سابقہ سلطان اپنے خلاف بغاوت کے اندیشے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے بھائیوں کو بالعموم مروادیتے تھے۔اس کی نمایاں مثال بایزید ثانی کے دورِ حکومت کے وقوعات ہیں۔نئے قواعد کی رو سے عثمانیہ خاندان کے تمام لوگوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔بس انھیں محلاتی حرم میں تنہائی کی زندگی گزارنا ہوتی تھی۔ جب سلطان مرجاتا تو حکومتی عہدیداران حرم میں جاتے اور عثمانی خاندان کے معمر ترین شخص کو تخت نشینی کے لیے چن لیتے۔ان میں سے بہت سے سلطان تو اپنی بلوغت کا بڑا حصہ بھی مرصع کمروں کی تنہائی میں گزار کر پہلی بار باہر آتے۔اتنی عمر تک دنیا سے کٹ کر ناز و نعم میں پلنے والے بغیر کسی مناسب تربیت کے سلطان بنادیے جاتے۔ظاہر ہے کہ وہ اتنی بڑی اور اتنی سنجیدہ سلطنت چلانے کے اہل نہیں ہوتے تھے۔حکومت چلانے کی اصل ذمہ داری وزیروں اور دیگر حکومتی اہلکاروں پر جا پڑتی جو اسے سلطان کے نام پر چلاتے تھے۔سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں سلطنت کی قسمت کا انحصار سلطان کی بجائے وزرائے اعظم کی اہلیت پر رہا۔سلطان احمد اول کی نیت سلطنت کو خانہ جنگیوں سے بچانے کی رہی ہوگی لیکن اس کی اصلاحات کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں عثمانیہ سلطنت کو کوئی قابل اور اہل سلطان میسر نہ آسکا۔

عثمانیہ سلطنت کے دورِ انحطاط میں اس کے سیاسی اور سماجی مسائل کو یورپ کی اس اقتصادی صورتحال نے بھی گمبھیر کیا جس کا آغاز سولھویں صدی سے ہوگیا تھا۔سپین، پرتگال، فرانس اور انگلینڈ جیسی یورپی اقوام نئی دنیا کی کھوج میں بازی لے گئیں۔انھوں نے اپنے نودریافتہ اور نومفتوحہ علاقوں

کے استحصال سے سونے اور چاندی کے انبار لگا لیے۔ جب چاندی بڑی مقدار میں عثمانی معیشت میں داخل ہوئی تو اس کی کرنسی گر گئی اور افراط زر نے اسے کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ عثمانی معیشت کو دو محاذوں پر نقصان ہوا۔ ایک تو فتوحات رکنے سے مال آنا بند ہو گیا اور مغرب کی ترقی نے بھی اسے نقصان پہنچایا۔

مسلمان سائنس کو صدیوں سے ترقی دیتے چلے آ رہے تھے لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی عثمانیہ سلطنت میں علمی جمود شروع ہو گیا تھا۔ اہلِ یورپ اپنے تاریک دور سے نکل رہے تھے لیکن عثمانی عالموں نے یورپی علمی ترقی سے فاصلہ برقرار رکھا۔ اس رویے کے لیے شاید انھیں الزام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اہلِ یورپ رومن سلطنت کے زوال کے بعد سے علمی اور سائنسی سرمایہ پیدا کرنے میں کوشاں رہے تھے۔ سترھویں صدی میں یورپ کا تاریک دور تو ختم ہو گیا تھا۔ نشاۃِ ثانیہ اور اس کے بعد روشن خیالی نے یورپ میں علم کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان دونوں تحریکوں کا آغاز صدیوں پرانے مسلم علمی کاموں کے ترجمے سے ہوا۔ عثمانی علمی حلقے اس تبدیلی کے آغاز کا ادراک نہ کر پائے۔ انھوں نے یورپی ترقی کو مشرکانہ اختراعات قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔ اپنے اوائل میں عثمانی ترکوں نے عیسائی اور مسلم دنیا کی علمی خلیج کو پاٹنے کے لیے کام کیا تھا۔ محمد ثانی کے دربار میں یورپی مصور، عالم اور لسانیات دان موجود تھے۔ جب یورپ نے علمی سیاست میں قائدانہ کردار سنبھالا تو یورپی ہمسایوں پر عدم اعتماد کے باعث ان کا اپنا رویہ علم دشمنی کا ہو گیا اور ان کی علمی پیش رفت رک گئی۔

بے تحاشا امریکی چاندی عثمانی سلطنت میں داخل ہوئی تو افراطِ زر آسمان کو چھونے لگا۔ 1580ء میں سونے کا ایک سکہ چاندی کے ساٹھ سکوں میں ملتا تھا، دس سال کے بعد 1590ء میں یہ قیمت 120 سکے اور 1640ء میں 250 سکے ہو گئی۔

ان تمام مشکلات کے باوجود سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں عثمانیہ سلطنت نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کی ایک بڑی سلطنت کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھا۔ عثمانیہ سلطنت اپنے پہلے تین سو سال

میں ناقابلِ یقین تیز رفتاری سے عروج تک پہنچی تھی۔ اسی لیے حالت جمود میں درپیش فوجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی مسائل اسے فوری زوال سے دوچار نہ کر سکے۔ اس سلطنت کو نئے ارضی سیاسی حقائق کے مطابق ڈھلنا اور اپنی بنیادی ماہیت کو بدل لینا چاہیے تھا۔ اس حوالے سے اہم ترین عثمانی سلطنت اور بقیہ یورپ کے تعلقات کی نوعیت تھی۔ سلطنت کے وزراء اتنے عمل پسند ضرور تھے کہ انھیں یورپ کے ساتھ مسلسل تنازعات میں مضمر تباہی کا ادراک تھا۔ جب عثمانیوں کو ادراک ہوا کہ سلطنت کی توسیع کا دور سترھویں صدی تک ختم ہو گیا تھا تو یورپ کے ساتھ تعلقات میں معاندانہ رنگ کم ہو گیا۔

اس نئے اندازِ فکر کا سب سے عمدہ اظہار ٹیولپ دور میں ہوا جو 1718ء سے 1730ء تک جاری رہا۔ اس دور میں عثمانی وزیرِ اعظم نوشہرلی داماد ابراہیم پاشا (Nevsehirli Damat Ibrahim Pasha) نے یورپ کے ساتھ تجارتی تعلقات اور ثقافتی قبولیت کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ عثمانیوں نے یورپ سے فنکارانہ اظہار کے نئے اسلوب لیے اور انھیں روایتی اسلامی انداز کے ساتھ ملا کر اپنا ایک منفرد انداز بنایا۔ ترک یورپی بیرک (Baroque) انداز سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں مغربی یورپ میں ٹیولپ کو بہت استعمال کیا گیا۔ اسے اس دور کی عثمانی مصوری اور عمارتی آرائش میں بکثرت دکھایا گیا۔ اس لیے اس عرصے کو ٹیولپ دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس عہد کی کامیابیوں کے باوجود عثمانیوں اور مغربی یورپ کے تعلقات میں جلد ہی ایک نیا رجحان سامنے آ گیا۔

سترھویں صدی میں عثمانی سلطنت جس جمود اور کمزوری کا شکار ہوئی تھی، اٹھارھویں صدی میں وہ تیز رفتار زوال میں ڈھلنے لگی تھی۔ 1699ء کے معاہدہ کارلوٹز نے عثمانی کمزوریوں کو عیاں کر دیا تھا۔ عثمانیوں نے جنوبی یونان دوبارہ لینے کی کوشش کی تو اٹھارھویں صدی کی دوسری دہائی میں آسٹریا کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔ اٹھارھویں صدی کی دوسری دہائی میں ہونے والی اس جنگ کا نتیجہ پسیرووٹز (Passarowitz) معاہدے کی صورت میں نکلا اور 1718ء میں سربیا کو آسٹریا میں شامل کر دیا گیا۔ عثمانی اپنے سابقہ علاقے واپس لینے کی بجائے مزید علاقہ کھو بیٹھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ عثمانی سلطنت کس بری حالت کو پہنچ چکی ہے۔ روس کے ساتھ 1768ء سے 1774ء تک کی تباہ کن جنگ کے بعد امن کا ایک دور آیا جو چند عشروں پر مشتمل تھا۔ روس کریمیا اور شمالی قفقاز کے علاقے قبضانے میں کامیاب رہا۔ اس نے یہ یقین

دہانی بھی حاصل کی کہ عثمانی علاقوں میں موجود عیسائی محفوظ رہیں گے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں عثمانی سلطنت مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوسکتی تھی۔ انقلاب فرانس کے باعث پورا یورپ ادھر متوجہ ہو گیا اور عثمانی عارضی طور پر نظر انداز کر دیے گئے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک عثمانی اپنے یورپی علاقے کا بڑا حصہ کھو چکے تھے۔ یورپ میں پانسہ ہمیشہ کے لیے عیسائیوں کے حق میں پلٹ چکا تھا۔

عثمانیوں کو جن سیاسی اور اقتصادی مراعات کے لیے مجبور کیا گیا وہ فوجی شکستوں جیسی ہی تباہ کن تھیں۔ عثمانیوں کو اپنی معیشت اور معاشرت کے کئی بڑے حصے مغربی یورپ کے تسلط میں دینے پڑے۔ ان اقدامات کو مشروط اطاعت ہی کہا جاسکتا ہے۔ سلیم اول کے زمانے میں ہی فرانس کے ساتھ ہونے والے بعض معاہدوں کی رو سے اسے سلطنت کے اندر خصوصی تجارتی مراعات دے دی گئی تھیں۔ شروع میں خصوصی مراعات کے یہ معاہدے طرفین کے لیے یکساں مفید تھے۔ اس لیے کہ تب یہ یورپ کی دو مساوی اقتصادی طاقتوں کے درمیان ہوئے تھے اور تجارتی تعلقات کو مضبوط کر رہے تھے۔ لیکن جب عثمانیوں کو زوال آیا تو ان معاہدوں کا کردار بدل گیا۔ بعض مواقع پر عثمانیوں کو فرانسیسی سفارتی معاونت کی ضرورت تھی۔ اس معاونت کے عوض عثمانیوں کو خود اپنی حدود میں فرانسیسیوں پر سے اپنی عملداری اٹھانا پڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب خود عثمانی سلطنت کے اندر موجود فرانسیسیوں پر عثمانی حکومت گرفت نہیں کر سکتی تھی اور نہ انھیں سزا دے سکتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک فرانس نے عثمانی سلطنت میں موجود تمام کیتھولک عیسائیوں کو فرانسیسی شہری تسلیم کروالیا۔ یعنی اب ان پر صرف فرانسیسی قانون کا اطلاق اور گرفت ہوسکتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ کسی بھی عثمانی شہری پر فرانسیسی قانون کا اطلاق کرواسکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ کھلا کہ عثمانی سلطنت کے عیسائی تیزی سے مالی ترقی کرنے لگے۔ فرانسیسی ان کے ساتھ ترجیحی تجارتی معاہدات کرتے اور اپنی تجارت صرف ان تک محدود رکھتے۔ اس طرح عثمانیوں کی تجارت کا زیادہ تر حصہ ان کی گرفت سے نکل گیا۔ پوری اٹھارھویں صدی میں یہی صورتحال رہی بلکہ شرائط سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئیں۔ عثمانیوں کی مجبوری تھی کہ انھیں آسٹریا اور روس کے ہاتھوں اپنی تقسیم سے بچنے کے لیے فرانسیسی سفارتی حمایت کی ضرورت رہتی تھی۔ اپنی خودمختاری اپنے ہاتھوں فرانس کے حوالے کرنے کو تیار عثمانیوں کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ

اٹھارھویں صدی تک کتنے کمزور ہو چکے تھے۔

تباہ کن جنگ کریمیا اور محلات پر سلطان عبدالحمید اول کے بے پناہ اخراجات سے عثمانی خزانے کی حالت پتلی ہوگئی۔ بیرون ملک سے اونچی شرح پر قرضے لیے گئے یوں ملکی مالی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

روشن خیال اصلاحات

انیسویں صدی تک واضح ہو چکا تھا کہ اگر سلطنت کو زندہ رہنا ہے تو کچھ اصلاحات ناگزیر ہیں۔ انیسویں صدی میں آنے والے کچھ سلاطین نے انتظامی امور وزیرِاعظم سے واپس اپنے ہاتھوں میں لینے اور یورپی خطوط پر سلطنت میں اصلاحات پر کام کیا۔ محمود ثانی (حکومت 1808ء تا 1839ء) پہلا اصلاح کار سلطان تھا۔ اس نے انتظامی امور کو یورپی انداز میں چلانے کے لیے کچھ اصلاحات کے لیے کام کیا۔ روایتی وزیر باہم حریف تھے۔ وہ پیچیدہ محلاتی سازشوں اور بیوروکریسی کے ذریعہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ان کی جگہ خارجہ، داخلہ، انصاف، تعلیم اور دیگر حکومتی معاملات کے لیے یورپی خطوط پر محکمے بنائے گئے۔ ینی چری دستے ختم کر دیے گئے۔ اس کے لیے استنبول کی گلیوں میں خونریز لڑائی ہوئی۔ سلطان محمود نے اس کی جگہ فوجی معاملات کا جدید نظام قائم کیا جو یورپی خطوط پر استوار تھا۔ تعلیم کو یورپی معیارات کے برابر کیا گیا اور سکولوں میں ترکی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی بھی پڑھائی جانے لگی۔ حتیٰ کہ لباس بھی اصلاحات کا شکار ہو گیا۔ سرکاری ملازم صدیوں سے پگڑی اور عبا پہنتے چلے آئے تھے۔ انھیں ختم کر کے پتلون، فوجی جیکٹ اور بوٹ رائج کیے گئے۔ سرکاری ملازمین کے ساتھ ساتھ عام شہری بھی پگڑی کی جگہ ترکی ٹوپی پہننے لگے۔ جب محمود نے اس طرح کی اصلاحات کا آغاز کیا تو مذہبی طبقوں سے متوقع مخالفت سامنے آئی جو مغرب سے درآمد ان ثقافتی علامات کو بدعات کہتے تھے۔ زیادہ طاقتور مرکزی حکومت نے انھیں غیر موثر کر دیا۔ پرانے نظام میں دور دراز صوبوں کے گورنر کافی خودمختار ہوتے تھے۔ مرکزی حکومت نے وہاں بھی اپنے اختیارات کا استعمال شروع کر

دیا جس سے گورنروں کے ساتھ تعلقات میں تناؤ آ گیا۔

محمود کے بیٹوں عبدالحمید اول (حکومت 1839ء تا 1861ء) اور عبدالعزیز (حکومت 1861ء تا 1876ء) نے بھی اصلاحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ عبدالحمید کے دور میں بھی تبدیلیوں کا ایک وسیع پروگرام چلایا گیا جسے تنظیمات کا نام دیا گیا۔ عثمانی حکومت اور معاشرت کا شاید ہی کوئی پہلو تنظیمات میں آنے سے بچ گیا ہو۔ یورپ کی قومی ریاستوں کو وقیع اور قابلِ تقلید نمونہ خیال کیا جانے لگا۔ بقیہ یورپ سے ماہرین بلائے جانے لگے جو جائزے لے کر بتاتے کہ عثمانیہ حکومت اور معاشرت کی بہتری کے لیے اس کے کون کون سے پہلوؤں میں کس طرح کی تبدیلی لانا ضروری ہے۔ تعلیمی نظام کو پوری طرح بدل کر فرانسیسی تعلیمی نظام کے خطوط پر استوار کیا گیا۔ مغربی مثالیوں کی پیروی کرتے ہوئے صدیوں سے مروج تعلیمی نظام جس کی بنیاد مذہب پر تھی، بدل دیا گیا اور اس کی غیر مذہبی سائنسی تعلیم متعارف کروائی گئی۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں سائنسی اور مذہبی تعلیم کو الگ الگ نہیں رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ پیغمبرؐ اسلام نے بھی علمی ترویج وترقی کے لیے کام کیا تھا۔ لیکن جب فرانسیسی لادینی رجحانات کو رواج دیا گیا تو مذہبی تعلیم کو عمومی تعلیم سے الگ کر دیا گیا۔ پھر سائنسی تعلیم کو مذہبی تعلیم پر فوقیت دی جانے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانیوں کی نئی نسل انجینئر اور ڈاکٹر بننے کے لیے ان شعبوں کی پیشہ وارانہ تعلیم کو مذہب اور فنونِ عامہ پر ترجیح دینے لگی۔ مسلم ممالک میں آج تک یہی چلن رائج چلا آ رہا ہے اور ایک معیاری رویہ بن چکا ہے۔ عثمانی مصلحین اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ سلطنت کو فعال اور موثر کرنے کے لیے یہ تنظیمی اصلاحات ضروری ہیں۔ پوری انیسویں صدی ان اصلاحات میں گزر گئی۔

زیادہ اہم بات یہ تھی تنظیمات نے عثمانیہ سلطنت کا قانونی طرزِ کار بدل دیا۔

چیچک کی ویکسین عثمانیہ سلطنت میں بنائی گئی۔ استنبول میں کام کرنے والے ایک انگریز سفیر کی بیوی نے اس کا مشاہدہ کیا اور اسے انگلینڈ لے گئی۔

سولھویں صدی میں سلیمان اور اس کے مفتیِ اعظم نے ضابطہ قانون متعارف کروایا تھا۔ اس کی جگہ

فرانسیسی نظام کی بنیاد پر ایک نیا ضابطہ قانون لایا گیا۔ اس میں حکومت اور لوگوں کے درمیان تعلق کی بنیاد فطری حقوق پر تھی۔ فطری حقوق کا تصور روشن خیالی کے دور میں سامنے آنے والے نظریات سے متاثر تھا۔ اب عثمانیہ سلطنت میں ضابطہ قانون کی بنیاد شریعت نہیں تھی۔ معاشرے کے قدامت پسند عناصر نے عثمانیہ سلطنت میں نفوذ کرتی اس لادینیت کی مخالفت کی۔ عثمانیہ سلطنت اپنے اوائل سے ہی خود کو فخریہ اسلام کی نمائندہ اور محافظ کہتی آئی تھی۔ عثمان اسی لیے غازی کہلایا تھا کہ اس نے بازنطینی عیسائیوں کے خلاف حملوں کی قیادت خود کی تھی۔ محمد دوم نے قسطنطنیہ پر اسلامی قبضے کی پیش گوئی پوری کی تھی۔ سلیم اول خلافت کو استنبول لایا تھا۔ اب وہی سلطنت مغرب سے مستعار روشن خیال اور لادین طرزِ فکر کے لیے اسی اسلامی روایت کو جھٹک رہی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ سلطنتوں نے اسلامی نظام پر کتنا عمل کیا لیکن ماضی کی ہر سلطنت نے اپنے قانونی ضابطہ کی بنیاد شریعت پر رکھی اور کسی حکومت نے لادینی نظام کو بنیاد بنانے کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ سلطان اور اس کے مشیروں کا خیال تھا کہ اس طرح کی تبدیلی وقت کا تقاضا بن چکی تھی اور مسیحی یورپ کے خدشات رفع کرنے کے لیے یہ طرزِ عمل ضروری تھا۔

روشن خیالی کے ساتھ لادینیت آئی اور انیسویں صدی میں قوم پرستی ایک طاقتور علمی تحریک بن گئی۔ یورپ بھر میں ایک سی نسلوں کے باہم اتحاد سے بننے والی سلطنتوں کا تصور غیر مقبول ہونے لگا اور ایک نسل یا زبان کی حامل قومی ریاست کا تصور اس کی جگہ لینے لگا۔ عثمانیوں کے لیے قومیت کا یہ نیا تصور مسائل پیدا کر رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کی سلطنت میں ترک، عرب، کرد، آرمینی، یہودی، سرب، بوسنیائی اور یونانی سمیت دیگر بہت سے نسلی اور لسانی گروہ موجود تھے۔ 1830ء میں جب مسیحی یورپ کی مدد سے یونانی عثمانیوں سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئے تو قومیت پرستی کا خطرہ ایک حقیقت بن گیا۔ سلطنت میں شامل دیگر نسلی اور لسانی گروہ بھی آزادی مانگ سکتے تھے اور سلطنت پوری طرح بکھر سکتی تھی۔

قومیت پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے عثمانیہ سلطنت کے اندر تشخص اور شناخت کے نئے تصورات متعارف کروانا ضروری تھا۔ کچھ عہدیداران نے، جن میں سے یورپی تعلیم یافتہ اور قومیت پرستی سے متاثر لوگ قابلِ ذکر تھے، کوشش کی کہ سلطنت کو باہم عثمانیت کے تعلق میں باندھ دیا جائے۔

اس نئے تصور کے تحت مذہبی اور نسلی تعلق سے قطع نظر تمام عثمانی شہری برابر تصور کیے جائیں گے۔ تنظیمات عہد کی اصلاحات شہریوں کے مساوی ہونے کی ضمانت پہلے ہی دے چکی تھیں۔ اب تمام نسلی اور مذہبی گروپوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی کہ وہ کسی بھی اور شناخت پر عثمانی ہونے کو ترجیح دیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ عثمانی سلطنت سب لوگوں کو ایک شناخت پر اکٹھا کرنے میں ناکام رہی۔ یورپ کو دی جانے والی مراعات کا مطلب تھا کہ عیسائیوں کو زیادہ تر ترکوں پر واضح اقتصادی برتری حاصل تھی۔ اب مسلمانوں کو کسی طرح کی قانونی یا معاشرتی برتری بھی حاصل نہیں رہی تھی۔ ساری سلطنت میں عیسائی اور مسلم آبادی کے درمیان تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس لیے مسلمانوں میں عیسائیوں کے مقابلے میں مسلسل پیچھے رہ جانے کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ عیسائی زیادہ سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ ہوتے جا رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ عثمانیوں کو ایک قوم بنانے کی کوشش میں مذہبی اور نسلی گروہوں میں چپقلش اور بڑھ گئی۔

تنظیمات کا دور 1876ء تک جاری رہا۔ اس عہد کی اصلاحات بھی عثمانیہ سلطنت کے زوال کی رفتار کم نہ کر سکیں۔ عثمانی مالیاتی حالت بھی نہیں سنبھلی تھی۔ بلقانی نسلی گروہوں کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ عثمانیت اور صوبوں کی تنظیم نو بھی قومیت پرستی کے جذبات ٹھنڈے نہ کر سکی تھی۔ جب سامراجیت اور نوآبادیات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو مغربی حکومتوں کی قوت اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھنے لگا۔ کچھ مغربی تعلیم یافتہ عہدیداران، جنھیں ینگ عثمانی کہا جاتا تھا، کا خیال تھا کہ تنظیمات اس لیے ناکام ہوئی کہ اصلاحات میں آزاد خیالی کی کمی تھی۔ انھوں نے زیادہ یورپی لادینیت لانے اور سلطان کے اختیارات مزید محدود کرنے کا سوچا۔ اس طاقتور گروہ نے 1876ء میں سلطان عبدالعزیز کو تخت سے اتارا اور اس کی جگہ اس کے بھتیجے مراد پنجم کو بٹھا دیا۔ لیکن نیا سلطان اپنے پیشرو سے بھی زیادہ نااہل تھا۔ اقتدار میں آنے کے چند ماہ بعد ہی اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ چنانچہ اسے بھی اتار دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی عبدالحمید ثانی (حکومت 1876ء تا 1909ء) لایا گیا۔ سلطانوں کو اس طرح لانے لے جانے کا مقصد تنظیمات عہد کی آزاد خیال اصلاحات کو جاری رکھنا تھا۔ عبدالحمید ثانی کا عہد حکومت بھی منصوبے پر پورا نہ اتر سکا۔

عبدالحمید ثانی نے 1908ء میں چین کے ہوئی (Hui) مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بیجنگ، چین، میں ایک اسلامی یونیورسٹی بنائی۔

اسلامی وحدت

صدیوں کے بعد عبدالحمید کی صورت میں عثمانیوں کو ایسا سلطان ملا جو اچھی طرح تیار تھا۔ احمد اول نے جیل کا جو نظام متعارف کروایا تھا، انیسویں صدی تک بے کار ہو چکا تھا۔ جب عبدالحمید شہزادہ تھا تو اس نے سفارتی وفود کے ساتھ یورپ کا دورہ کیا تھا۔ وہ معقول حد تک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ عثمانی سلطانوں کی سی اپنی کلاسیک وضع قطع کے باوجود اس کا ذہن کافی کشادہ اور ہمہ جہت تھا۔ اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اسے پہلوانی میں بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنا فرنیچر بھی خود ڈیزائن کرتا تھا۔ اپنے فضول خرچ پیشروؤں کے برعکس اسے باسفورس کے ساتھ بنے نئے اور مہنگے محلات کی عیاشی سے نفرت تھی۔ اس کی بجائے وہ کہیں چھوٹے اور قدرے دور واقع یلدز پیلس (Yildiz Palace) کو ترجیح دیتا تھا۔

جب وہ تخت نشین ہوا تو عثمانیہ سلطنت کو اہل رہنما کی شدید ضرورت تھی۔ 78-1877ء کی تباہ کن روس ترکی جنگ کے نتیجے میں رومانیہ، سربیا اور مانٹینگرو (Montenegro) آزاد جبکہ بلغاریہ عثمانیہ سلطنت کے اندر ہی خود مختار ہو گیا تھا۔ بلقان میں جو کچھ عثمانیوں کے پاس بچا تھا وہ بھی ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں ملنے والی برطانوی مدد کے باعث سلطنت مزید بکھرنے سے بچی ہوئی تھی۔ برطانیہ اسے روسی سامراج کے خلاف ایک موثر بفر ریاست خیال کرتا تھا۔ عثمانیہ سلطنت نے 1875ء میں ہی دیوالیے کا اعلان کروایا تھا چونکہ زوال کے دوران لیے گئے بھاری قرضوں کے سود ادا کرنے کے لیے بجٹ کا بھاری حصہ مختص کرنا پڑتا تھا۔

اگرچہ عبدالحمید اس وعدے پر اقتدار میں آیا تھا کہ وہ اپنے پیشرو کی اصلاح تنظیمات کو جاری رکھے گا لیکن وہ اپنی سلطنت کو ایک نئے رخ پر لے گیا۔ عبدالحمید کی خواہش تھی کہ سلطان کے روایتی اختیارات بحال ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے وہ اصلاحات ترک کر دیں جو سلطان کے اختیارات پر حد لگا کر انھیں پارلیمان کے حوالے کرتی تھیں۔ اس نے بظاہر روس کے ساتھ جنگ کا بہانہ بنا کر 1878ء

میں وہ آئین غیر معینہ مدت کے لیے معطل کر دیا جسے اس کے روشن خیال وزیرِاعظم نے تیار کیا تھا اور 1876ء میں اس کی تخت نشینی پر نافذ کیا تھا۔ سولھویں صدی میں عثمانی دورعروج کے بعد پہلی بار سلطان حقیقتاً حکمران تھا۔

سلطان کے اختیارات حاصل کرنے کے بعد عبدالحمید سلطنت عثمانیہ کا ایک اور بھولا بسرا پہلو بھی واپس لایا یعنی خلافت۔ عثمانی سلطانوں کے پاس 1517ء میں سلیم اول کے ہاتھوں فتح مصر کے بعد سے خلیفہ کا لقب چلا آ رہا تھا لیکن وہ اسے شاذ ہی استعمال کرتے تھے۔ لیکن عبدالحمید کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے جانشین ہونے کا یہ عہدہ بہت اہم تھا۔ یہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم تھا کہ عیسائی بلقان کا بڑا حصہ کھو بیٹھنے کے بعد عثمانی سلطنت مسلم اکثریت کی ریاست بن گئی تھی۔ سلطنت میں موجود ترک، عرب، البانی اور دیگر مسلمان گروپوں کو مسیحی یورپی ریاستوں سے نکالے گئے مسلم مہاجرین نے باہم جوڑ دیا تھا۔ ان مسلم مہاجرین میں وہ سرکیشیائی بھی شامل تھے جن کا نسلی صفایا روس نے انیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں جنوبی روس سے نسلی بنیادوں پر کیا۔ اس کے لیے اپنی رعایا کو ان کے اسلامی تشخص اور خلافت کی بنیاد پر متحد کرنا اس عثمانیت پر اکٹھا کرنے سے آسان تھا جسے کچھ لوگوں نے بطور تشخص ایجاد کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں یورپیوں کی ہندوستانی، افریقی اور جنوب مشرقی ایشیائی نوآبادیوں میں بہت سے مسلمان رہ رہے تھے۔ وہ یورپی سامراجی قوتوں کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے بطور خلیفہ ان مسلمانوں پر اپنے روحانی اثر ورسوخ سے استفادہ کر سکتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں وحدت اسلامی کے تصور کو بہت ترویج دی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دم توڑتی عثمانی سلطنت کے لیے وحدت اسلامی توانائی کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوگی۔

مسلمانوں کو وحدت اسلامی کے نام پر اکٹھا کرنے کی امید میں عبدالحمید نے بہت سے نئے منصوبے شروع کیے۔ ان منصوبوں کا مقصد تنظیمات کے سالوں میں عثمانی سلطنت کے اسلامی ریاست ہونے کے دھندلا جانے والے تصور کو اجاگر کرنا تھا۔ پوری سلطنت میں ریل کی پٹڑی بچھائی گئی لیکن حجاز ریلوے کو خاص اہمیت دی گئی جو استنبول سے حجاز تک بچھی ہوئی تھی۔ نقل وحمل کے نقطہ نظر سے دور دراز واقع صوبوں کو مرکز سے ملانا بڑا معقول خیال تھا۔ اس کے علاوہ اس ریلوے سے حاجیوں

کے لیے صحرائے عرب کا پر مشقت سفر آسان ہو جانا تھا۔ یہ ریلوے استنبول میں بیٹھے سلطان اور حضرت محمدؐ کی زیر کمان بننے والی اولین مسلم ریاست کے درمیان روحانی تعلق کا مظہر بھی تھی۔ عثمانی حدود سے باہر بسنے والی مسلم کمیونٹیز سے رابطے بڑھانے کے لیے افریقی صحارا سے آئے اور چین تک وفود بھجوائے گئے۔ یورپ کی بڑھتی طاقت کے ساتھ نمٹنے میں دنیا کے مسلمانوں کا اظہارِ وفاداری سلطان کے لیے مفید ہو سکتا تھا۔ مشہور ہے کہ تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl) اور صیہونی تحریک نے فلسطین فروخت کر دینے کی صورت میں سلطنت کے ہر لحظہ بڑھتے قرضوں کا کچھ حصہ ادا کرنے کی پیشکش کی تو سلطان نے اسلامی حمیت کا متاثر کن مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

عبدالحمید نے وحدت اسلامی کے ساتھ تنظیمات کی ان اصلاحات کو بھی جاری رکھا جن کا سلطنت کی دینی شناخت پر منفی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس نے سلطنت کو مضبوط بنانے کے لیے دیگر اصلاحات پر بھی توجہ دی۔ اس نے حکومتی مشینری کی تنظیم نو کے لیے خصوصی وزیر مقرر کیے۔ اسے امید تھی کہ یوں اس کی بیوروکریسی یورپ کی سی مستعد اور کارگر ہو جائے گی۔ اس کے عہد میں سرکاری محاصلات بڑھے اور بدعنوانی میں بھی کمی آئی۔ عثمانی فوج کو جدید بنانے کے لیے جرمن ماہرین کو تربیت کے لیے لایا گیا۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ سے نئے بحری جہاز بنوائے گئے۔ عیسائی تبلیغی مشنریوں کی مالی مدد سے چلنے والے غیر ملکی سکولوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت سے نئے تعلیمی ادارے بنائے گئے اور پرانے سکولوں کی اصلاح کی گئی۔ 1895ء تک سرکاری سکولوں میں دس لاکھ طالب علم داخل کیے جا چکے تھے۔ اس طرح شرح خواندگی میں بڑی کامیابی حاصل کی گئی۔

عبدالحمید نے سلطنت کے اسلامی اور شاہی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید بنانے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا لیکن وہ اپنی قلمرو میں آزاد خیالی اور لادینیت کو پھیلنے سے نہ روک سکا۔ یورپی تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقہ مغربی یورپ کے نمونے پر استوار جدید ترکی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ 1909ء میں ایک خفیہ سوسائٹی ینگ ٹرکس نے عبدالحمید کو تخت سے اتار دیا۔ عیسائی ترکوں اور یورپ سے متاثرہ آزاد خیال ترکوں کی پشت پناہی کی بدولت ینگ ٹرکس نے اس کے تینتیس سالہ دورِ حکومت اور مبنی بر اسلام اصلاحات کو ختم کر دیا۔ تاہم انھوں نے سلطان بطور ادارہ ختم نہیں کیا۔ اگلے تیرہ سال

میں دو سلطان آئے لیکن ان کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ عثمانی سلطنت کی بقیہ تاریخ میں حقیقی اختیار ینگ ٹرکس کے پاس رہا۔

ہندوستان

ہندوستان میں اورنگ زیب کے دور میں آنے والا مسلم عروج کا دور گزر گیا تو ان کی مرکزی حکومت کے تارو پود بکھرنے لگے۔ اپنے ابتدائی زمانے سے مغل حکومت علاقے کے دیگر خودمختار حکمرانوں کو مکمل ختم کرنے کی بجائے انھیں باجگزار بنانے کی حکمتِ عملی کامیابی سے چلا رہی تھی۔ اس اعتبار سے ان کی حکمتِ عملی عثمانیوں کے برعکس تھی۔ اپنے دورِ عروج میں بھی مغل سلطنت ایسے بادشاہوں اور گورنروں کا امتزاج تھی جو مغل شہنشاہ کے اطاعت گزار تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد یہ حکمران رفتہ رفتہ خودمختار ہونے لگے اور انھوں نے اطاعت اور وفاداری ترک کرنا شروع کر دی۔ ان کا رویہ مغل شہنشاہیت کی کمزوری اور عدم استحکام کا نتیجہ تھا جو شہزادوں کے درمیان جانشینی کی جنگوں سے پیدا ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کو حکومت کرتے فقط تین ماہ ہوئے تھے کہ وہ اپنے سوتیلے بھائی کے ہاتھوں 1707ء میں قتل ہو گیا۔ خود بہادر شاہ حکومت میں آنے کے صرف پانچ سال بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد آنے والے بادشاہ بھی نااہل تھے۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب کے بعد بارہ سال میں پانچ بادشاہوں کی حکومت رہی۔

جب مرکزی حکومت ڈانواں ڈول ہوئی تو مقامی حکمرانوں نے خودمختاری کا رستہ اختیار کیا۔ وہ نام کو تو مغل ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرتے تھے لیکن مغلوں کو عملاً صوبائی معاملات سے کچھ سروکار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب محمد شاہ (حکومت 1719ء تا 1748ء) نے سلطنت کو قدرے مستحکم کر لیا اور تیس سال تک حکومت کرتا رہا لیکن وہ مقامی حکمرانوں کی اطاعت حاصل نہ کر سکا۔ مغل حکومت کے بکھرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں دنیا کی دولت کا پچیس فیصد ہندوستان کی ملکیت تھا۔

پوری اٹھارھویں صدی میں سلطنت ٹوٹتی اور بکھرتی رہی اور آزاد ٹکڑوں میں بٹتی رہی چنانچہ عدمِ استحکام اور بدامنی کا دور دورہ رہا۔ یہاں بھی اندلس کے طائفہ دور کی تاریخ دہرائی جارہی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بن گئی تھیں اور ہرایک برصغیر کی غالب قوت بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان میں پٹھان، بنگالی، سکھ، ہندو، مرہٹے اور حتیٰ کہ انگریز بھی برصغیر پر تسلط کے لیے کوشاں تھے۔ شمال کے پٹھانوں نے احمد شاہ درانی کی زیرِ قیادت ایک آزاد بادشاہت قائم کرلی۔ اسی بادشاہت نے بعد ازاں زوال پذیر ہندوستان اور صفوی ایران کے علاقے ملا کر ایک نئی ریاست بنائی جو آج کا افغانستان ہے۔ اکبر کی وفات کے بعد سے سکھ مغلوں کے خلاف چلے آرہے تھے۔ انھوں نے عسکری ذرائع سے پنجاب پر غلبہ حاصل کرلیا۔ مغربی دکن میں ہندوؤں کا ایک اتحاد مرہٹوں کے نام سے موجود تھا اور مغل حکومت کے سب سے بڑے اور خطرناک مسائل میں سے ایک بنا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی کے وسط تک شمالی اور وسطی ہندوستان کا زیادہ تر علاقہ فتح کر لیا تھا۔ ان کے شمال میں افغان اور صفوی اور جنوب میں میسور کی ریاست انھیں محدود رکھے ہوے تھی۔

جب اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں اقتدار کے لیے لڑتی ریاستیں عروج و زوال سے گزر رہی تھیں تو برطانوی بھی اس ہنگامے میں داخل ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو سترھویں صدی سے ہندوستان میں کاروبار کر رہی تھی، ہندوستان میں اس عدم اتفاق کو دیکھ کر برصغیر پر حکومت کی منصوبہ بندی کرنے لگی۔ اٹھارھویں صدی کے پانچویں عشرے میں کمپنی دکن کی جنگوں میں ملوث ہونے لگی۔ یہ خصوصی تجارتی مراعات کے عوض مقامی حکمرانوں کو مالی اور فوجی مدد فراہم کرنے لگی۔ برطانوی نقطہ نظر سے یہ سرگرمیاں دوہرے فائدے کی حامل تھیں۔ ایک تو ہندوستان میں تجارتی مواقع وسیع ہونے لگے اور دوسرے فرانسیسیوں کو یہاں سے بے دخل کرنے کے امکانات پیدا ہوے۔ چند عشروں میں برطانویوں نے اتنی طاقت حاصل کرلی کہ انھیں ملک کے زیادہ تر حصوں میں تجارتی حقوق کے ساتھ بحرِ ہند کے زیادہ تر ساحلی علاقوں میں محاصلات اکٹھا کرنے کے اختیارات بھی مل گئے۔ انھوں نے بہت سی ریاستوں میں بطور مشیر بھی اپنی جگہ بنالی۔ 1757ء میں برطانیہ مختلف مقامی حریفوں کے درمیان سیاسی چپقلش کو استعمال کر کے بنگال میں اپنی مرضی کی حکومت بنوانے اور اس سے فائدہ

اٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط کر لی تھی۔ اب وہ ٹکڑوں میں بٹے ہندوستان کے باہم دست و گریباں حریفوں میں سے محض ایک نہیں رہی تھی۔ یہ خطے کی بڑی سیاسی قوت بن چکی تھی۔ اس کے اپنے آزاد، انتظامی، فوجی، اقتصادی اور سیاسی اہداف تھے۔ کئی عوامل کے باعث ہندوستان پر کمپنی کی حکومت کا زمانہ برصغیر اور بالخصوص یہاں کے مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ اول تو یہ کہ کسی بھی کمپنی کی حکومت قانون کے تقاضوں کے مطابق نہیں چلتی بلکہ اس کا مقصد اپنے حصہ داران کے لیے منافع کمانا ہوتا ہے۔ اس لیے کمپنی کی حکومت ان معیارات کے مطابق بھی خوفناک حد تک استحصالی ثابت ہوئی جو یورپی حکومتیں اٹھارھویں صدی میں پوری دنیا کے لیے روا رکھے ہوئے تھیں۔ برطانیہ کو ملنے والے بلا مقابلہ تجارتی حقوق نے مقامی تاجروں کو مقابلہ سے خارج کر دیا۔ اس طرح مقامی معیشت تباہ ہوگئی۔ کئی اشیاء اور صنعتوں پر اپنی اجارہ داری کے باعث برطانیہ نے مقامی آبادی کا محاصلات کے ذریعہ استحصال کیا۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر تباہ کن ثابت ہوا۔ برطانوی اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ مسلمان دوبارہ قابلِ ذکر سیاسی قوت نہ بن سکیں۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں پر ہندو آڑھتیوں اور تاجروں کو ترجیح دینا شروع کر دی۔ چنانچہ مسلمان مقابلے سے باہر کر دیے گئے اور ہندوؤں کو بے تحاشا فائدہ ہونے لگا۔ علاوہ ازیں جنوب کے ہندو اکثریتی علاقوں میں تو میسور نے اٹھارھویں صدی میں انگریزی پیش رفت کو روکے رکھا جبکہ شمالی علاقے، جو زیادہ تر مسلم حکومتوں میں شامل تھے، انگریزی عملداری میں شامل کیے جاتے رہے۔

عثمانی سلطنت کی طرح ہندوستان بھی انیسویں صدی میں ایک یورپی طاقت یعنی برطانیہ کے زیرِ تسلط آ گیا۔ قانوناً اور اصولاً تو ہندوستان کا زیادہ تر علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اقتدار نہیں تھا لیکن مقامی حکمرانوں کے مشیر اور محصولات کی وصولی پر قابض ہونے کی وجہ سے وہ انھیں استعمال کرتے اور پورے ہندوستان میں من مانی کرتے رہے۔ معاملات کی نہج 1857ء میں اس وقت بدل گئی جب کمپنی کی فوج میں شامل سپاہی کہلانے والے ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ کمپنی

کے سپاہیوں کو دیا گیا ایک نیا کارتوس بغاوت کے لیے چنگاری ثابت ہوا۔ اس کارتوس کو استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹ کر کھولنا پڑتا تھا۔ جب سپاہیوں کو پتہ چلا کہ کارتوس کو گائے اور سور کی چربی سے چکنا کیا گیا ہے تو ہندو اور مسلمان دونوں نے اسے استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی ہندوستان کو اپنی عالمی سلطنت کا ایک حصہ سمجھ کر متواتر لوٹ رہے تھے اور یہ بغاوت ان کے خلاف دبے ہوئے جذبات کا اظہار تھا۔ بہرحال ہندوستانیوں کی یہ بغاوت ناکام رہی لیکن برصغیر پر کمپنی کی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ برطانوی حکومت نے کمپنی کے رقبے ضبط کر لیے اور ہندوستان کو براہِ راست برطانوی تاج کے ماتحت کر دیا۔ اس طرح برطانوی راج کا عہد شروع ہوا۔ اگرچہ بغاوت میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے حصہ لیا تھا لیکن زیادہ تر الزام مسلمانوں کو دیا گیا اور نتیجتاً ہندوستان میں ان کا معاشرتی رتبہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ علاوہ ازیں مغل حکومت جو محض نام کی رہ گئی تھی اور پہلے سے برطانوی نگرانی میں تھی باقاعدہ ختم کر دی گئی۔ قرار دیا گیا کہ باغیوں کا ساتھ دینے پر بہادر شاہ ثانی کی حکومت بطور سزا ختم کی گئی ہے۔

افریقہ، وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا

مسلم اقتدار کے روایتی مراکز دہلی اور استنبول سے دور دراز کے علاقوں میں یورپی سامراجیت زیادہ کھل کر سامنے آئی۔ عثمانی اور مغل اپنی باقی ماندہ قوت کے بل بوتے پر کچھ عرصہ اپنی خودمختاری کی حفاظت کرتے رہے لیکن مسلم دنیا کے کناروں پر واقع خودمختار مسلم یورپی طاقتوں کی یورش کا کچھ نہ کر سکے۔ برطانیہ، روس، فرانس اور نیدرلینڈ نے مسلم آبادی کے علاقوں کو فتح کیا اور انھیں اپنی پھیلتی سامراجی سلطنتوں میں شامل کر لیا۔

شمالی افریقہ کے بحیرہ روم کے ساتھ لگتے علاقے سولھویں صدی سے فقط برائے نام عثمانی سلطنت کا حصہ چلے آ رہے تھے۔ عثمانیوں کا بلقان، اناطولیہ اور مشرقِ وسطیٰ میں جو اثر و رسوخ تھا مذکورہ بالا علاقوں میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ لیکن مقامی حکمران عثمانیوں کی رسمی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔

اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ سولھویں صدی میں عثمانی بحریہ نے سپین کی توسیع پسندی سے بچنے میں ان کی مدد کی تھی۔ آنے والی صدیوں میں شمالی افریقہ کے مسلمانوں اور یورپ کی طاقتور ہوتی بحری فوجوں کے درمیان حملوں اور جوابی حملوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ شمالی افریقہ کے چھاپہ ماروں کے ٹھکانے الجزائر، تیونس اور طرابلس جیسے ساحلی شہروں میں تھے اور اہلِ یورپ انھیں یورپی تجارتی جہاز لوٹنے والے قزاق قرار دیتے تھے۔ دوسری طرف مسلم ملاح خود کو اسلامی علاقوں کے محافظ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اہلِ یورپ غیر مہذب جنگجو تھے۔ اہلِ یورپ نے شمالی افریقہ کے مقامی بربر لوگوں کے نام کو بگاڑا اور وحشیانہ طرزِ عمل کے لیے barbarianism وضع کیا۔ بہرحال اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پانسہ یورپ والوں کے حق میں پلٹ گیا۔ یورپی بحری افواج نے سمندر پار آبادیات کی معاونت سے شمالی افریقہ کے لوگوں پر فتح پالی۔ انھوں نے علاقے کے بڑے شہروں الجزائر اور طرابلس پر شدید بمباری کے بعد قبضہ کرلیا۔ حتیٰ کہ نیا بننے والا امریکہ بھی پیچھے نہیں رہا۔ اس نے 1805ء میں طرابلس پر ہونے والے حملے میں حصہ لیا۔ جلد ہی پرانے دشمنوں نے پورا شمالی افریقہ قبھا لیا۔ 1830ء میں فرانس نے الجزائر اور ساتھ لگتے علاقوں کو ملا کر فرنچ الجیریا کے نام سے اپنی نوآبادی قائم کرلی۔ دیگر فرانسیسی نوآبادیوں کے مقابلے میں الجیریا بحیرہ روم کے پار عین سامنے واقع تھا اور، اسی لیے، فرانس اسے نوآبادی نہیں بلکہ فرانس کا حصہ ہی خیال کرتا تھا۔ لاکھوں فرانسیسی جا کر الجیریا میں بس گئے۔ انھوں نے وہاں کے معیشت اور تمدن پر غلبہ پایا اور اصل باشندوں کو دوسرے درجہ کے شہری بنا دیا۔ اسی طرح تیونس پر حملہ ہوا اور 1881ء میں اس پر قبضہ کرلیا گیا۔ 1911ء میں نئی متحد ہونے والی ریاست اٹلی نے عثمانیہ سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ اس نے Cyrenaica, Tripolitania اور Fezzan کے صوبے چھین کر اپنے لیے ایک نوآبادی لیبیا کے نام سے بنالی۔ شمالی افریقہ کے مغرب بعید میں واقع مراکش بس نام کو آزاد اور خودمختار رہ گیا۔ اسے فرانس اور سپین نے پہلے اپنے اپنے حلقہ اثر کے حصوں میں بانٹا اور پروٹیکٹوریٹ بنالیے۔ یوں المغرب میں مسلم خودمختاری جو ساتویں صدی میں عقبہ بن نافع کے علاقے پر قبضے کے بعد سے مسلسل چلی آرہی تھی، انیسویں صدی میں یورپیوں کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ یورپی طاقتوں نے بہت سے علاقوں کے حصے بخرے کرکے باہم بانٹ لیے۔

مصر اپنے مغربی ہمسایوں سے الگ ایک اپنی طرح کا معاملہ تھا۔ بہت زرخیز ہونے کے باعث شمالی افریقہ سے بھی بہت پہلے اس پر فرانس کی نظر تھی۔ 1798ء میں نپولین نے عثمانیوں کے زیرِ حکومت مصر پر حملہ کر دیا۔ وہ خطے میں فرانسیسی تجارت کو تحفظ دینا اور انگریزی تجارت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ مہم تو ناکام رہی لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے طاقت کے خلاء سے فائدہ اٹھا کر ایک عثمانی کمانڈر محمد علی نے مصر پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت بنالی۔ رسماً عثمانی سلطان کا وفادار ہوتے ہوئے بھی اس نے ایک خودمختار بادشاہ کی طرح حکومت کی۔ اس نے عثمانیوں کے تنظیمات اصلاح پروگرام شروع کرنے سے بھی پہلے مصر کی یورپی خطوط پر جدت کاری پر کام کیا۔ اس کے نتیجے میں اس قدیم سرزمین پر یورپی اثر ورسوخ پیدا ہوا۔ محمد علی کے جانشینوں نے بھی یورپ نواز رویہ برقرار رکھا۔ اس کے بدلے میں یورپ نے خطے میں بھاری سرمایہ کاری کی۔ اس سرمایہ کاری کے دورِ عروج میں فرانسیسی مالی معاونت سے 1869ء میں نہر سویز بننا شروع ہوئی۔ مصر میں بڑھتے یورپی اثر ورسوخ کے ردِعمل میں قومیت پرستی کی لہر چلی اور انیسویں صدی کی نویں دہائی میں حکمران کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ اپنے مالیاتی مفادات کے تحفظ کا بہانہ بنا کر برطانیہ اور فرانس نے 1882ء میں مصر پر حملہ کر دیا۔ قوم پرستوں کو شکست دے کر محمد علی حکومت کو سہارا دیا گیا۔ اس کے بعد 1914ء تک مصر محض کاغذی طور پر عثمانیہ سلطنت کا حصہ تھا۔ اصل میں اس پر برطانوی فوجی قبضہ تھا۔

---

27 اگست 1896ء کو برطانیہ نے تاریخ کی مختصر ترین جنگ میں زنجبار (Zanzibar) کو شکست دی۔
یہ جنگ صرف 40 منٹ جاری رہی۔ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ زنجبار کے تخت پر ایسا سلطان آ گیا جو سے
برطانوی حلقۂ اثر سے باہر لے جانا چاہتا تھا۔

برطانوی نوآباد کاری کا سلسلہ شمالی افریقہ تک محدود نہیں رہا۔ دور دراز واقع مغربی افریقی مسلم ریاستیں مشرقی افریقی ساحلوں کی تجارتی چوکیوں پر مبنی ریاستیں بھی برطانوی توسیع پسندی کا شکار ہو گئیں۔ سولھویں صدی میں امریکہ کی دریافت کے بعد نوآبادکاروں نے غلاموں کی تجارت شروع

کی۔ اس تجارت نے مغربی افریقہ کو ویران کر دیا۔ آبادی کی اس کمی کی وجہ سے بھی افریقہ یورپی دراندازی کی مزاحمت نہ کر سکا۔ ساحلی علاقے جہاں اسلام زیادہ اندر تک نہیں پھیلا تھا وہاں کے بڑے ساحلی شہر انیسویں صدی میں تجارت کے لیے یورپی تاجروں پر انحصار کرنے لگے تھے۔ فرانسیسیوں نے ان شہروں کو اپنے اڈے بنایا اور انیسویں صدی کے اواخر میں تیزی سے براعظم کے اندرون میں گھسنے لگے۔ دریائے نائجر کی وادی کی مسلمان ریاستیں مدتوں سے شمال کی طرف وسیع صحارا اور جنوب کی طرف کے گھنے جنگلات کی وجہ سے محفوظ چلی آرہی تھیں۔ اس لیے وہ فرانسیسی چیرہ دستیوں کے خلاف اقدامات کے لیے تیار نہ تھیں۔ 1895ء تک مغربی افریقہ کا بڑا حصہ فرانسیسیوں کے تسلط سے آزاد ہو چکا تھا۔ یورپیوں نے ان شہروں کو بڑی بے دردی سے لوٹا جو کبھی اسلامی علوم کا مرکز رہ چکے تھے۔ ان میں سے ایک شہر ٹمبکٹو بھی تھا۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے میں کھڑی یورپی طاقتوں نے مغربی افریقہ کو اپنی اپنی نو آبادیات میں شامل کیا تو مالی کی ازمنہ وسطیٰ کی شان و شوکت محض ایک یاد بن کر رہ گئی۔

مشرقی افریقہ میں سامراجی قیادت برطانیہ کے پاس تھی۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ افریقہ کو مصر سے جنوبی افریقہ تک کے شمالاً جنوباً محور سے کنٹرول کرے اس لیے سواحلی ساحل اس کے لیے بڑے اہم تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے اوائل سے عرب کے جنوب مشرقی ساحل کے ساتھ واقع ایک ملک عمان (Oman) مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کا مرکزی اڈہ زنجبار میں تھا جو آج کے تنزانیہ میں ہے۔ عمانی اسی اڈے سے ساحلی تجارت پر اثر انداز ہوتے تھے اور اندرونی خطوں پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے تھے۔ تب تک بحر ہند کے تجارتی راستے یورپ کے زیرِ تسلط او قیانوسی تجارتی راستوں کے سے اہم نہیں ہوئے تھے۔ انیسویں صدی میں برطانویوں نے عمانی حکومت پر قابو پالیا اور اسے من مرضی کے معاہدوں پر مجبور کر دیا۔ جب 1856ء میں جانشینی کا ایک جھگڑا اٹھا تو برطانیہ نے جبراً زنجبار اور عمان کو الگ الگ کر دیا اور اس طرح دونوں کمزور ہو گئے۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے اندرونی علاقوں میں غلام تجارت پر پابندی لگادی۔ اس ملک کی دولت کا بڑا ذریعہ یہی تجارت تھی۔ اس طرح مشرقی افریقہ پر مسلم گرفت ایک بار پھر کمزور ہو گئی۔ جب زنجبار حکومت اپنے علاقوں کا

انتظام موثر طور پر نہ چلا سکی تو برطانیہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پورے علاقے کو ایک پروٹیکٹوریٹ میں لے لیا۔ تقسیم کرو اور فتح کرو کی حکمتِ عملی یورپی طاقتوں کے سلسلے میں بڑی کامیاب رہی تھی۔ یہ افریقہ میں بھی کارگر رہی اور مشرقی افریقہ کا ایک ملک جو کبھی طاقتور اور امیر ہوا کرتا تھا وہ یورپ کے دیگر دست نگر ممالک کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

وسطی ایشیا میں مسلم خطوں کو فتح کرنے کی دوڑ میں روس بازی لے گیا۔ روس نے سولھویں صدی میں وولگا (Volga) کے تاتار مسلمانوں کو ان کے روایتی دار الحکومت قازان (Kazan) سمیت فتح کر لیا تھا۔ روسی زاروں نے صدیوں تک تاتاروں کے خلاف جابرانہ حکمتِ عملی اپنائے رکھی۔ اس کے باوجود انیسویں صدی میں تاتار ایک طاقتور اقتصادی قوت بن کر ابھرنے لگے۔ وہ عیسائی روس اور وسط ایشیا ترک علاقوں کے مابین ہونے والی تجارت میں واسطے کا کام کرتے تھے۔ انھیں یہ سہولت تھی کہ وہ روس کے شہری تھے اور دوسری طرف کے مسلم بھائیوں کے ساتھ برابری کی سطح پر معاملہ کر سکتے تھے۔ اس وقت تک ترک وسطی ایشیا کے صحراؤں میں پھیلی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکے تھے۔ حالانکہ وسط ایشیا میں سمرقند اور امام بخاری کے شہر بخارا جیسے اسلامی علوم کے عظیم مراکز قائم تھے لیکن یہ درمیان میں حائل ایران کی وجہ سے باقی سنی مسلم دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ یہ علاقہ ایک طرح سے جزیرہ بنا ہوا تھا جس کے جنوب میں ایرانی اور توسیع پسند برطانوی، مشرق میں چین اور شمال میں روس تھا۔ ان طاقتوں میں گھرے ہوئے وسط ایشیا کے ترک بڑھتا ہوا روسی اثر و رسوخ روکنے کے اہل نہیں تھے۔ روسیوں نے خطے میں اپنے اقتصادی روابط کو جواز بنایا اور اس کے سیاسی معاملات میں دخل دینے لگا۔ اس نے انیسویں صدی میں اس خطے کو اپنے حکومتی مرکز سے منسلک کیا اور پھر خطے کو آہستہ آہستہ اپنے اندر سمیٹنے لگا۔ اس روسی پیش قدمی نے ہندوستان پر حکومت کرتے برطانیہ کو ہوشیار کر دیا۔ انھوں نے روسیوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے افغانستان میں مہم جوئی کی۔ ان دو طاقتوں کے درمیان ہونے والی اس کشاکش کا مقصد وسط ایشیا کے مسلم علاقوں کی تقسیم میں اپنا اپنا حصہ لینا تھا۔ اس حکمتِ عملی کو گریٹ گیم کا نام دیا گیا۔ صدی کے آخر تک روس ایران میں شامل خراسان تک کے سارے ترک علاقے فتح کر چکا تھا۔ یوں افغانستان دو سامراجی طاقتوں کے درمیان بفر زون بن گیا۔

روس اور برطانیہ دونوں میں سے کسی نے ایران کو اصلاً تو فتح نہیں کیا لیکن دونوں نے اس پر قابلِ ذکر گرفت برقرار رکھی۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر سے صفویوں کے جانشین قاچاروں پر روسی اثرات بڑھتے گئے۔ ان کی شمالی سرحدوں پر دباؤ ڈال کر روسیوں نے ایران سے اسی طرح کی سیاسی اور اقتصادی خصوصی مراعات حاصل کرلیں جن پر یورپ میں عثمانیوں کو مجبور کیا گیا تھا۔ روسیوں کا حلقۂ اثر تہران تک کا تھا۔ لیکن برطانیہ نے خلیج فارس کے ساتھ لگتی شیخ ریاستوں پر اپنے پروٹیکٹوریٹ کو استعمال کیا اور اپنا اثر ورسوخ ایران کے جنوبی علاقوں میں قائم کیا۔ جب برطانیہ اور روس کے درمیان ایران اور اس کے وسائل سے استفادے میں مسابقت کی دوڑ لگی تو انیسویں صدی کا آخر آتے آتے اس کی سیاسی اور اقتصادی خودمختاری ختم ہوگئی۔

کمزور مسلم ریاستوں کے استحصال کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ یورپی نوآبادیات کا یہ عمل مجمع الجزائر مالے جیسے بعید مشرق کے مسلم ممالک میں بھی دہرایا گیا۔ یہاں ولندیزیوں نے اپنی تجارتی سلطنت کو اسی طرح وسعت دی جیسے انگریزوں نے ہندوستان میں دی تھی۔ ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پورے جنوب مشرقی ایشیا میں تجارتی اڈے بنائے اور مقامی مسلمان بادشاہتوں کے ساتھ مصالحہ جات کی تجارت کرنے لگی۔ ان تاجر نوآبادکاروں نے تجارتی مواقع حاصل کرنے کے لیے فوجی طاقت استعمال کرنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ پرتگالی 1511ء سے ملاکا کی اہم بندرگاہ پر قابض چلے آرہے تھے۔ 1641ء میں ولندیزیوں نے انھیں وہاں سے نکالا اور خود قابض ہوگئے۔ 1621ء میں ولندیزیوں نے جزیرہ بانڈا میں دس ہزار مقامیوں کا قتلِ عام کیا۔ اس کا مقصد خطے کی جائفل کی پیداوار پر ولندیزی گرفت مضبوط کرنا تھا۔ اس طرح کی وحشیانہ سرگرمیوں کے ذریعے ولندیزیوں نے انیسویں صدی میں مجمع الجزائر مالے کا زیادہ تر حصہ قبضا لیا۔ جاوا اور سماٹرا کی مقامی سلطنتوں نے ولندیزیوں کو چین سے حکومت نہیں کرنے دی۔ نوآبادکاروں کو مسلسل مقامیوں کی بغاوت کا سامنا رہا۔ ولندیزیوں کے وسیع وسائل، تکنیکی برتری اور دیگر مسلم ممالک سے ان علاقوں کو مدد نہ ملنے کے باعث جنوب مشرقی ایشیا کی ولندیزی سلطنت دوسری جنگِ عظیم کے بعد تک برقرار رہی۔

سولھویں صدی میں عثمانیوں نے ولندیزی استعمار کے خلاف مقامی مزاحمت کو تقویت دینے کے لیے ایک بحری مہم Aceh بھیجی۔

مختصر یہ کہ انیسویں صدی میں پوری مسلم دنیا میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، روس اور دیگر سب نے بھی یورپ کی بڑھتی طاقت کا فائدہ اٹھایا۔ بلاشبہ یورپیوں میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ ان کی روشن خیالی، اقتصادی طاقت اور منظم طاقتور فوج کے باعث دنیا پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ کی اس تحریر کا بہت شہرہ ہوا تھا کہ ''سفید فام کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کو فتح کرے اور مفتوحین کو بتائے کہ یورپی انداز میں زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔'' تمدنی اور تہذیبی برتری کے زعم میں مبتلا یورپی نوآبادکاروں کو مقامی روایات اور رسوم ورواج کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ اسلامی تاریخ سے بے خبر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں یورپ میں مشرق کا سحر اپنے عروج پر تھا۔ یورپ کے سارے بڑے شہروں میں رسولؐ اللہ، اسلامی تاریخ اور مسلم عقائد پر بہت کچھ چھاپا گیا۔

شاید اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی امکانات سے واقفیت کے باعث ہی اہلِ یورپ کا اصرار تھا کہ ان کی اپنی سرزمین سے مسلمانوں کا عمل دخل پوری طرح ختم کر دیا جائے۔ سولھویں صدی میں یورپی استعمار کا آتش فشاں پہلی بار دنیا میں پھٹا اور ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمتِ عملی کامیابی سے استعمال کی گئی۔ انیسویں صدی میں یہی حکمتِ عملی مسلم دنیا میں دراڑیں ڈالنے کے لیے استعمال کی گئی۔ یہی مسلمان اتحاد کے زمانے میں اموی، عباسی اور عثمانی ادوار میں بڑے طاقتور رہ چکے تھے۔ یورپیوں نے نئے جغرافیائی اور سرحدی خطوط کھینچتے ہوئے کسی علاقے کی روایات اور تاریخ کا خیال نہیں رکھا۔ اس طرح انھوں نے مسلم سیاسی سرمایہ تقسیم کر دیا اور مفتوحہ علاقوں کو مطیع اور زیرِ حکومت رکھنا آسان کر لیا۔ یورپیوں نے آہستہ آہستہ کر کے تقریباً ساری مسلم دنیا قبھالی۔ 1914ء میں پہلی جنگ چھڑنے تک تقریباً ساری مسلم آبادی اہلِ یورپ کے قبضے میں تھی۔

اس دوران مسلم دنیا میں دو بڑے سوال اٹھے کہ خدا نے یہ سب کچھ کس طرح ہونے دیا اور جدید دنیا میں اسلام کے مستقبل پر یہ صورتحال کس طرح اثرانداز ہوگی۔ ان سوالوں کا جواب دینے میں کوشاں لوگوں نے اسلامی احیاء کے لیے چلنے والی تحریکوں کی قیادت کی۔ ان تحریکوں کا مقصد یورپی طوفان کو پیچھے دھکیل کر مسلم دنیا پر اپنا حق جتانا تھا۔

بارھواں باب

نئے اور پرانے خیالات

اسلام کے مرکزی تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام آخری اور کامل دین ہے۔ اتنے بہت سے لوگ اپنے مشرکانہ عقائد چھوڑ کر آپؐ سے اسی لیے وابستہ ہوے کہ انھیں آپؐ کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان تھا اور اس بات پر بھی کہ آپؐ کی وساطت سے آنے والا سچا مذہب دنیا میں انقلاب برپا کر دے گا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان سمجھتے تھے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس کے سچا ہونے کا ثبوت ہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد چند سو سال کے اندر مستحکم اور طاقتور سلطنتوں سے مقابلہ کے باوجود مسلم سیاسی اقتدار جنوبی فرانس سے ہندوستان تک پھیل گیا۔ جب عسکری توسیع کا دور ختم ہوا تو مسلمانوں نے علوم کو پھیلایا اور انھیں نئی سرحدوں تک لے گئے۔ پوری معلوم دنیا میں علوم کی تاریخ پر مسلمانوں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ صلیبیوں اور منگولوں کے ہاتھوں ہونے والے نقصان بھی مسلم تاریخ کے پہلو میں لگنے والے خار سے زیادہ اہم نہ تھے اس لیے کہ بعد میں اور بھی طاقتور مسلم ریاستیں وجود میں آئیں۔ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک اسلام کا تاریخی ریکارڈ اور اسلامی تاریخ کی معجزانہ ماہیت ہی اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔

لیکن اس طرح مسلم تہذیب کا زوال اور بعد ازاں یورپیوں سے مغلوب ہو جانا الٰہیاتی مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ اگر مسلمان واقعتاً ایک سچے دین کے پیروکار ہیں اور ان کی تاریخ اس کا ثبوت ہے تو

پھر مسلم دنیا پر، بظاہر مستقل نظر آنے والے یورپی غلبے کی تعبیر کس طرح کی جائے گی؟ اٹھارھویں سے بیسویں صدی تک علماء اسلام احیاء کی کوششوں سے اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اسی شان وشوکت کا زمانہ واپس لانا چاہتے تھے جس نے نسلوں کا ایمان پختہ رکھا تھا۔ احیاء کے ان تمام علمبرداروں نے مسلم دنیا میں کہیں ایک خیال ضرور پیش کیا کہ اسلامی احیاء کے لیے اسلامی اعمال پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ اگر مسلمان ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کی طرح اسلام پر عمل کریں تو خدا انھیں کامیابی سے نوازے گا۔

تاہم ساتھ ہی ساتھ علماء کا ایک نیا طبقہ بھی پیدا ہوا جسے مذکورہ بالا احیاء پسندوں کے روایتی اندازِ فکر سے اختلاف تھا۔ قومیت پرستی اور لادینیت جیسے مغربی یورپی افکار سے متاثر ان دانشوروں کا خیال تھا کہ یورپ کی ہمسری کے لیے ان کی تقلید ضروری ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ اہلِ یورپ انھی افکار کی بدولت اپنے تاریک دور سے اٹھے اور فاتحِ عالم بن گئے۔ ان کا خیال تھا مسلم دنیا کے اس قدر پیچھے رہ جانے کی وجہ ہی یہ تھی کہ انھوں نے نئے افکار اور فلسفہ سے اپنی جدت کاری کرنے کی بجائے اپنی ساری توجہ مذہب پر اور اپنے اوائل اسلامی عہد کی شان وشوکت کے احیاء پر مرکوز کردی تھی۔ پوری بیسویں صدی میں مسلم تہذیب کے احیاء کے متعلق یہ دو متضاد اندازِ فکر ایک دوسرے کے خلاف علمی اور بعض اوقات حقیقی سطح پر لڑتے رہے۔ یہ دونوں طرزِ فکر آج بھی مسلم طرزِ فکر پر حاوی ہیں۔

مغربی طرزِ فکر

جب مغرب نے مسلم دنیا (اور بالعموم باقی دنیا پر بھی) پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے اقدامات جاری رکھے تو کچھ لوگ جو فکری اعتبار سے اس کے مطیع نہ تھے عملی رہنمائی کے لیے اسلام کے اولین زمانے کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ نے آزادی اور خودمختاری کا کوئی راستہ نکالنے کے لیے مغربی تصورات اور فلسفوں سے رجوع کیا۔ مسلم دنیا کے بہت سے لوگوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کے قومیت پرستی اور لادینیت جیسے فلسفیانہ رجحانات اختیار کیے۔ انھیں امید تھی کہ وہ اس معاملے میں یورپ کی نقالی سے دنیا میں بالادستی حاصل کرلیں گے۔ یورپی اثر ورسوخ کے تحت زندگی گزارتے

مسلمانوں کے نئے سیاسی تصورات سماجی زندگی میں آنے والے ایک تغیر کے ساتھ منطبق ہو گئے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں قاہرہ، دمشق اور بغداد جیسے مسلم سیاسی اور معاشرتی زندگی کے پرانے اور روایتی مراکز صدیوں پرانی مسلم معاشرت اور روشن خیالی کے بعد کی یورپی معاشرت کے اتصالی مقامات بن گئے۔ یورپی سیاح، حکومتی عہدیداران اور مبلغین مسلمان آبادی میں گھلے ملے۔ اس مسلم آبادی نے مغربی تمدن کے اثرات قبول کیے جو ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ طرزِ تعمیر سے موسیقی تک ہر چیز عرب معاشرت میں نفوذ کر گئی۔ اعلیٰ حکومتی عہدیداران جو ایک صدی پہلے محمود دوم کی اصلاحات کے زمانے سے ہی مغربی لباس پہننے لگے تھے اب فکر و عمل میں بھی مغرب کی نقالی کرنے لگے تھے۔ یورپی انداز کے آرکسٹرا یورپی دھنیں بجانے لگے۔ سینما مغربی فلمیں دکھانے لگے اور کلب میں ڈانس ہونے لگا۔ اگر کوئی چیز لندن اور پیرس میں ملتی تھی تو وہ قاہرہ اور بیروت میں بھی دستیاب تھی۔ گھروں کی حدود کے اندر بھی زندگی بدل گئی۔ اہلِ خانہ کے ساتھ انگریزی یا فرانسیسی میں گفتگو کرنا طبقۂ بالا میں سے ہونے کی نشانی بن گیا۔ شراب نوشی عام ہو گئی حالانکہ یہ قرآن میں منع کی گئی ہے اور صدیوں تک مسلم معاشرت کے امتناعات میں شامل رہی۔

مغربی جدیدیت کے زیرِ اثر قاہرہ کے کئی اشاعت گھروں نے چھاپہ خانے لگا لیے۔ نتیجتاً قاہرہ عرب تمدن کا رابطہ کاری کا مرکز بن گیا۔ یہ حیثیت بیسویں صدی میں بھی برقرار رہی۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مسلمانوں اور خصوصاً عربوں نے تو مغربی تمدن اختیار کیا لیکن ان کے درمیان دہائیوں تک زندگی گزارنے والے مغربیوں نے شاید ہی عرب تمدن کا کوئی پہلو اختیار کیا ہو۔ پوری اسلامی تاریخ میں شہر ہمیشہ تمدنوں، روایتوں اور خیالات کے اتصالی مقامات ہوا کرتے تھے۔ عباسیوں کے بغداد اور عثمانیوں کے استنبول کی بڑی وجہ ہی ان کی فصیلوں میں متنوع لوگوں کی معاشرت تھی۔ لیکن بیسویں صدی میں مشرق اور مغرب کا باہمی تعامل اور طرح کا تھا۔ یہ دونوں باہم مساوی سطح پر نہیں مل رہے تھے۔ ایک معاشرت اور تمدن فاتحین یعنی اہلِ مغرب کا تھا اور دوسرا تمدن

اور معاشرت مفتوحین یعنی مسلمانوں کا تھا۔ اول الذکر کے ساتھ طاقت اور اثر ورسوخ وابستہ تھا جبکہ آخرالذکر پس ماندگی اور ناکارگی کی علامت تھا۔ عصر حاضر کی حقیقت نے شہروں میں بسنے والوں کے ذہنوں میں ڈالا کہ مسلمانوں کی عظمت ماضی کا قصہ ہے۔ ان کے لیے مغربی تمدن اور اقدار و معیارات کو اختیار کر لینا عین فطری تھا۔ اصل میں یہ اپنے سے بالاتر کی قوت کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش تھی۔ نئے معاشرتی تصورات کے ساتھ ساتھ سیاست اور حکومت کے متعلق مغربی تصورات بھی اختیار کر لیے گئے۔

عرب مسلم دنیا میں یہ خیالات زیادہ تر عرب عیسائیوں کے ذریعے داخل ہوئے۔ عثمانیوں اور یورپی طاقتوں کے مابین ہونے والے مراعات کے معاہدات کی وجہ سے سلطنت میں بسنے والی عیسائی آبادیوں کے مغربی یورپ کی بڑی طاقتوں سے قریبی تعلقات تھے۔ جب یورپ اپنے مذہب پر مبنی ماضی سے جان چھڑا کر آزاد خیال حکومت، قومیت پرستی اور لادینی فلسفوں کو اختیار کر رہا تھا تو عثمانی سلطنت میں کام کرنے والے یورپی تاجر، مشنری اور سفارتکاران عیسائیوں کو بھی نئی فکری نہج پر لا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عربوں میں اپنی علمی اور ادبی تاریخ سے آگہی کی تحریک بھی چلی۔ اس تحریک کی اصل طاقت عربوں کی یہ خواہش تھی کہ اپنے امیہ اور عباسی اجداد کی سی عظمت حاصل کریں جنھوں نے فوجی مہم جوئی سے لے کر علمی تحقیق تک میں دنیا کو قیادت فراہم کی۔ انھوں نے اوائل اسلامی دور کی ان سلطنتوں کا مذہبی پہلو قدرے دبا کر عرب تشخص اور زبان کا پہلو زیادہ اجاگر کر دیا۔ اس عرب بیداری کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ اگر عرب اپنی گزشتہ عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بطور مسلمان نہیں بلکہ بطور عرب متحد ہونا ہوگا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس تحریک کے قائدین میں شامل عرب عیسائیوں کے لیے بھی مسلم تشخص کی بجائے عرب تشخص میں کشش تھی۔ اس طرح کی لادین قوم پرستی سے خود ان کا معاشرتی مرتبہ بھی بلند ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عیسائی مسلمان کی تمیز نہیں رہے گی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں سلطان عبدالحمید ثانی نے وحدت اسلامی پر جوز ور دیا تھا اس کی موجودگی میں عرب قوم پرستی کا خیال پھیلنا مشکل تھا۔ عثمانی خلیفہ وعدہ کر رہا تھا کہ وہ اسلامی سلطان کی

شان وشوکت بحال کرے گا۔ وہ یہ کام قومیت کی بجائے اسلام کے نام پر کرنے کی بات کرتا تھا۔ جب تک سلطان کا یہ وعدہ معتبر سمجھا جاتا عیسائی عرب مسلم عربوں کو اپنے خیالات کا قائل نہیں کر سکتے تھے۔ 1909ء میں عبدالحمید کی حکومت گرائی گئی تو حکومت ینگ ٹرکس نے سنبھال لی۔ یہ لوگ سیاست میں قوم پرستی اور لادینی اندازِ فکر کے حامل تھے۔ جب عبدالحمید کی وحدت اسلامی کا رنگ ترک قوم پرستی کے سامنے پھیکا پڑا تو عثمانی سلطنت میں شامل عربوں اور ترکوں کے مابین حائل خلیج زیادہ اور تکلیف دہ حد تک نمایاں ہوگئی۔ عثمانی سلطنت اپنے تمام تر خدوخال میں ایک ترک سلطنت تھی اور عربوں کو سیاسی اعتبار سے اس میں اپنا مقام بنانے میں مشکل کا سامنا چلا آرہا تھا۔ ینگ ٹرکس کا عروج آیا تو انھیں مزید سیاسی تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ عیسائی عربوں کا عرب قومیت کا تصور مسلم عربوں میں بھی جاگزیں ہونے لگا۔ عثمانی سلطنت کا علاقہ شام عرب قومیت کا مرکز بن گیا۔ عرب ریاست کے لیے کام کرنے والی خفیہ انجمنیں عثمانی اہلکاروں کی موجودگی کے باوجود طاقتور ہورہی تھیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ان کے رابطے مغربی طاقتوں سے ہو چکے تھے۔ بالآخر وہ صدیوں سے یورپ میں اپنے لیے روگ بنی اس سلطنت کے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہونے والے تھے۔

روایتی احیاء پسندی

محمد بن عبدالوہاب (1703ء تا 1792ء) پہلا شخص تھا جس نے روایتی اسلام (جو اس کے خیال میں اصل اسلام تھا) کے احیاء کا کام شروع کیا۔ اس کا تعلق جزیرہ نما عرب کے صحراؤں میں بسنے والے ایک عرب قبیلے سے تھا۔ اس کا طرزِ حیات کم وبیش وہی تھا جو گیارہ سو سال پہلے پیغمبرؐ کے زمانے میں عربوں کا تھا۔ اس کا عمل امام احمدؒ بن حنبل اور ابن تیمیہؒ کی فقہ پر تھا جس میں مصدقہ احادیث کو دیگر ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ حالانکہ وہ عثمانی عملداری کی حدود سے باہر رہتا تھا لیکن غالباً سلطنت کے زوال اور جمود اور اس میں مغرب کی دراندازی سے باخبر تھا۔ اس کے نزدیک اس صورتحال کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اسلام پر اس طرح عمل کرنا چھوڑ دیا ہے جس طرح آپؐ اور صحابہ کرام کرتے تھے۔ اس نے صوفیوں، شیعوں اور جدت پسندوں پر تلخ تنقید شروع کردی کہ یہ لوگ اصل اسلام میں غیراسلامی

عملوں یعنی بدعتوں کے ذمہ دار ہیں۔ ساتویں صدی کے خارجیوں کی طرح محمد بن عبدالوہاب اور اس کے ساتھیوں کا بھی استدلال تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت بدعقیدہ ہو چکی ہے۔ ان کی نجات کی یہی صورت ہے کہ اسلام کی اصل اور غیر متغیر شکل کو اپنائیں جس پر مسلمانوں کی اولین نسلیں یعنی سلف کاربند تھے۔ یہ تحریک بعدازاں پہلی تو سلفیت کہلائی۔ اس تحریک میں کارفرما اصل خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہر دم قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی پیروی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

محمد بن عبدالوہاب کا ایک پیروکار ابن سعود تھا۔ وہ صحرائے عرب کی ایک چھوٹی سی آبادی کا رہنما تھا۔ سعود نے اپنے زیرِ اثر علاقہ پھیلانے کے لیے محمد بن عبدالوہاب سے مدد مانگی۔ طے پایا کہ مدد کے عوض ابن سعود خالص اسلام کے متعلق اس کے خیالات اپنی حکومت میں رائج کرے گا۔ یہ معاہدہ ہر دو کی اموات کے بعد بھی کارگر رہا۔ محمد بن عبدالوہاب کے جانشین مذہبی جواز فراہم کرتے رہے جبکہ سعود کے جانشین سعودی ریاست کو سیاسی طاقت دیتے رہے۔ اگر سعودی ریاست تیز رفتاری سے نہ پھیلتی تو سلفی اثرات غالباً صحرائے عرب تک ہی محدود رہتے۔ انیسویں صدی کے اوائل تک سعودی جزیرہ نما عرب کے وسیع علاقے فتح کر چکے تھے۔ ان میں مکہ اور مدینہ بھی شامل تھا۔ مگر انھیں بیس سال بعد ہی مقدس شہروں سے نکال دیا گیا لیکن وہ دنیا بھر سے آنے والے حاجیوں میں اپنا پیغام پھیلاتے رہے۔ جب آج کا سعودی عرب بنا تو ابن عبدالوہاب کی تحریک کو حقیقی اور اصل طاقت ملی۔ بہت کم لوگوں نے سلفی تحریک کے سارے خیالات سے اتفاق کیا۔ لیکن مسلم مفکرین نے اس خیال سے اثر قبول کیا کہ اسلامی احیاء قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے طرزِ حیات پر مبنی ہونا چاہیے۔ بڑھتی ہوئی مغربیت کے تناظر میں اس خیال کو اور بھی تقویت ملی۔

آگے مشرق میں اورنگ زیب کے بعد کا ہندوستان بے اتفاقی اور عدم استحکام کا شکار تھا۔ وہاں ایک اور عالمِ دین کا نام شاہ ولی اللہ (1703ء تا 1762ء) تھا۔ انھیں خدشہ تھا کہ مسلمانوں کی بے اتفاقی اور ہندو اکثریت کی بغاوت سے روایتی معاشرہ ٹوٹ جائے گا۔ ان کی زیادہ تر دلچسپی شریعت کے معاشرتی پہلوؤں اور برصغیر میں اسلام کو مکمل انہدام سے بچانے میں تھی۔ تاریخ کے سنجیدہ طالب علم ہونے کے ناتے انھوں نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اگر مغل ہندوستان نااتفاقی اور خانہ جنگی کی راہ پر چلتا رہا

تو ان کی جگہ دوسرے اقتدار سنبھال لیں گے۔ انھوں نے اسلامی روایت کے احیاء کا پیغام دیا۔ لیکن اپنے ہم عصر ابن عبدالوہاب کے برعکس وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے حق میں نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ان کی باہمی نا اتفاقی کا نتیجہ وہی نکلتا جو 200 سال پہلے اندلس میں نکلا تھا۔ ابن عبدالوہاب کے برعکس انھوں نے مختلف روایات، خیالات اور نسلوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا پیغام دیا۔ اس طرح ہندوستان میں اسلام کی سیاسی قوت کے زوال کی رفتار بہرحال کم کی جاسکتی تھی۔ اگلی صدی میں مغل تو ختم ہو گئے لیکن اسلام پر مبنی شاہ ولی اللہ کے فلسفے نے برصغیر میں ایک اہم علمی کردار ادا کیا۔ جب بھی مسلم طبقہ بالا میں پھیلتے مغربی اثرات اور بڑھتی ہوئی ہندو سیاسی طاقت کی بات ہوئی شاہ ولی اللہ کا حوالہ ضرور آیا۔

سارے مفکرین مغربی افکار کے خلاف نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ نے مغرب کے کچھ افکار کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھا اور انھیں روایتی اسلام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کام کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک، برطانوی قبضے کے دوران، مصر اسلامی روایت اور مغربی سامراجیت کے درمیان سرحد کا کام کرتا رہا۔ بارھویں صدی میں صلاح الدین کی بدولت سنی ادارہ بن جانے والی قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی اسلامی افکار کی درس و تدریس کا اہم مرکز چلی آرہی تھی۔ لیکن اب یہ مصری علمی مزاج پر غالب نہیں رہی تھی۔ سیاسی اور معاشرتی ہر دو اعتبار سے یورپی اثرات پورے مصری معاشرے میں سرایت کر رہے تھے۔ اس مظہر کی بڑی وجہ محمد علی اور اس کے جانشینوں کی اصلاحات تھیں۔ ایک مصری سکول ٹیچر حسن البنا (1906ء تا 1949ء) نے مغربی جدیدیت اور روایتی اسلامی اقدار کو باہم متحد کرنے کے لیے کام کیا۔ حسن البنا کی تنظیم اخوان المسلمین نے عرب قومیت پرستی میں اسلامی اقدار اور معاشرتی فعالیت شامل کرنے کے لیے کام کیا۔ مصری معاشرے کے سب طبقات تک رسائی پانے اور انھیں اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزارنے کا حوصلہ دینے کے لیے اخوان المسلمین نے سکول، ہسپتال اور معاشرتی فلاحی ادارے قائم کیے۔ اخوان المسلمین نے مغربی علوم اور تنظیمی تصورات تو قبول کر لیے لیکن لادینیت کو مسترد کر دیا۔ اسلامی روایت اور مغربی جدیدیت کے بین بین یہ فکری نظام مصر میں بہت مقبول ہوا لیکن عرب دنیا اور بالخصوص مصر میں سخت

گیر لادین قومیت پرستی کے ہاتھوں اخوان کو عشروں تک زیرِ عتاب رہنا پڑا۔

تقسیم

بالآخر مشرقِ وسطیٰ میں ایک نیا سیاسی آرڈر وجود میں آیا لیکن اس کے ذمہ دار نہ تو مقامی عرب تھے اور نہ ہی ترک قومیت پرستی۔ 1914ء میں آسٹریا ہنگری کا آرک فرانز ٹرڈینڈ (Archduke Franz Ferdinand) سراجیوو میں قتل کر دیا گیا اور سارا یورپ پہلی عالمی جنگ میں گھر گیا۔ اس وقت ترکی معاملات پر ینگ ٹرکس کے تین افراد اسمٰعیل انور، محمد طلعت اور احمد جمال کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس گروہ کو تین پاشا کا نام دیا گیا تھا۔ انھوں نے برطانیہ، فرانس اور روس کے خلاف جرمنی کا حلیف بننے کا فیصلہ کیا۔ کئی دہائیوں سے جرمن سلطنت عثمانیہ کے فوجی مشیر چلے آرہے تھے۔ عثمانیوں کو امید تھی کہ جرمنی کا ساتھ دے کر وہ اپنے مصر جیسے بعض علاقے دوبارہ حاصل کر لیں گے اور بھاری غیر ملکی قرضے معاف کروالیں گے۔

عثمانی اس جنگ سے کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت میں نہیں تھے۔ ان کی فوج ناقابلِ علاج حد تک فرسودہ اور قیادت غیر موثر تھی۔ سلطنت میں ترک آرمینیائی تنازعے سمیت بہت سے نسلی تناؤ موجود تھے۔ ان حالات میں عثمانی فوج کو عوامی پشت پناہی میسر نہ تھی۔ مزید یہ کہ جب تک عثمانی فوج جنگ میں (اکتوبر 1914ء) شریک ہوتی، واضح ہو چکا تھا کہ ان کے اتحادی کی فرانس فتح کرنے کی کوئی امید نہیں۔ بالآخر خفیہ ملاقاتوں کے دوران عثمانی سلطنت کے اندر بغاوتوں کے حوالے سے تین معاہدے ہوے اور ایسے مشرقِ وسطیٰ پر اتفاق رائے ہو گیا جس میں عثمانی سلطنت موجود نہیں تھی۔ اس ساری کارروائی کے ذمہ دار برطانوی تھے۔ انھوں نے ایسا سیاسی انتشار پیدا کیا جسے وہ خود بھی سنبھالنے کے اہل نہیں تھے۔ اس طرح جنگِ عظیم اول کے دوران عثمانی سلطنت ختم ہو گئی۔ اس وقوعے کے مابعد اثرات آج بھی مسلم دنیا میں محسوس کیے جاتے ہیں۔

اہلِ یورپ جانتے تھے کہ عثمانی سلطنت کے اندر کہاں کہاں نسلی تناؤ اور قوم پرستی کی قوتیں موجود ہیں۔ انھیں امید تھی کہ وہ ان عوامل کو عثمانیوں کے خلاف کامیابی سے استعمال کریں گے۔

برطانوی خاص طور پر عثمانیوں کے خلاف عربوں کی عام بغاوت کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کا مکہ کے عثمانی گورنر شریف حسین سے رابطہ 1915ء میں ہی ہو گیا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر شریف حسین عثمانیوں کے خلاف بغاوت کر دے اور انھیں فوجی مدد دے تو پورے جزیرہ نما عرب اور زرخیز ہلال پر مشتمل سلطنت اسے دے دی جائے گی۔ عربوں کو بادشاہ بننے کا خواب دکھا کر شریف حسین کو بغاوت پر آمادہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ عام عربوں کو بھی عثمانی حکومت کے اندر موجود ترک قومیت کے نعروں سے خدشات محسوس ہو رہے تھے۔ اس لیے انھیں بھی بغاوت پر مائل کرنا آسان تھا۔ برطانوی سونے اور اسلحے کے سہارے شریف حسین کی قیادت میں بغاوت برپا ہو گئی۔ باغیوں نے جزیرہ نما عرب کے مغربی اطراف میں مدینہ، عمان (Amman) اور دمشق جیسے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ یوں برطانوی مصر کا دفاع کرنے اور بڑھ کر یروشلم پر قابض ہونے میں کامیاب رہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد پہلی بار یروشلم پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو گیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عرب قوم پرستی بالآخر زوال پذیر عثمانی سلطنت پر غالب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ جلد ہی عرب خودمختار اور حاکم ہوں گے اور حسین ان کا بادشاہ ہو گا۔

لیکن دنیا میں برطانوی سامراجی حکمتِ عملی سے واقف کوئی بھی شخص بتا سکتا تھا کہ برطانوی کسی صورت مقامی مسلمانوں کی حکمرانی قائم نہیں ہونے دیں گے۔ شریف مکہ سے معاہدہ ہوتے ہی برطانویوں نے اپنے فرانسیسی اتحادی سے خفیہ بات چیت شروع کر دی کہ عثمانیوں کے بعد مشرقِ وسطیٰ کو کیا شکل دی جائے۔ وہ علاقے جن کا لالچ شریف حسین کو دیا گیا تھا، برطانیہ اور فرانس نے آپس میں بانٹ لیے۔ فرانس سے وعدہ کیا گیا کہ اسے شام کا مشرقی حصہ اور عیسائی آبادی والا لبنان دیا جائے گا۔ میسوپوٹیمیا اور فلسطین کے علاقے برطانیہ نے خود رکھنا تھے۔ اس معاہدے کو سائیکس پیکو (Sykes Picot) معاہدے کا نام دیا گیا جس نے متحدہ عرب ریاست کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ عرب طاقتور یورپی اقوام سے اپنے مطالبات کرنے اور منوانے کے اہل نہیں تھے اور خاص طور پر ان اقوام سے جن کے لیے وعدہ شکنی معمول کی بات تھی۔ لیکن متنازعہ معاہدات کا معاملہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔

عرب باغیوں کے لیے جھنڈا برطانویوں نے ڈیزائن کیا۔ اس میں تین افقی خط اور بائیں طرف ایک ستارہ تھا۔ یہ جھنڈا بیسویں صدی میں مصر، اردن، شام اور فلسطین جیسی کئی عرب ریاستوں کے جھنڈوں کی بنیاد بنا۔

1917ء میں برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ آرتھر بالفور (Arthur Balfour) نے ایک بڑے اور موثر یہودی بینکار بیرن روتھ شیلڈ (Baron Rothschild) کو ایک خط لکھ کر فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی ریاست کے قیام میں مدد کا وعدہ کیا۔ عمومی حیثیت میں یہ خط صیہونی تحریک کے نام تھا۔ انیسویں صدی کے آخر سے یورپی یہودی براعظم میں موجود یہود خلاف جذبات سے بچنے کے لیے اپنا کوئی وطن بنانا چاہ رہے تھے۔ ان کی من پسند جگہ فلسطین تھی جہاں وہ، رومنوں کے ہاتھوں 70 قبل از مسیح میں نکلنے سے پہلے، رہتے چلے آ رہے تھے۔ بالفور نے اس اعلان میں یہودیوں کی اس خواہش کی حمایت کی تھی۔ بالفور کا یہ اعلان پہلے سے موجود معاہدات سے متصادم تھا جن کی رو سے یہ علاقہ عربوں کو ملنا تھا اور کچھ برطانیہ نے خود رکھنا تھا۔ بعد کی دہائیوں میں یہودیوں نے اس بالفور اعلامیے کو خطے میں اپنی آبادکاری کا جواز بنائے رکھا اور بالآخر اسرائیل وجود میں آیا۔ عربوں نے شروع سے ہی اس اعلامیے کو مسترد کر دیا اور شریف مکہ کے ساتھ برطانوی وعدوں پر اصرار کرتے رہے۔ برطانیہ نے یہ ایسی دلدل پیدا کی کہ پوری بیسویں صدی مشرقِ وسطیٰ اسی میں دھنسا رہا۔

قومی ریاستوں کا قیام

پہلی جنگِ عظیم نے مسلم سیاسی طاقت کو مکمل ختم کر دیا۔ عثمانیوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ ان کے مفتوحہ علاقے فاتح قوتوں یعنی برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی نے باہم بانٹ لیے۔ خود اپنی بادشاہت کی امید لگائے بیٹھے عربوں کے پاس بس ٹوٹے ہوئے وعدے رہ گئے۔ ان کی ''آزادی'' یورپیوں کے زیر اثر تھی۔ اس بار کی فتح و شکست اور انہدام صلیبی اور منگول جنگوں کے نتائج سے زیادہ مکمل اور فیصلہ کن تھے۔ فوجی فتح سے کہیں زیادہ اہم جنگ کے بعد کا علمی ماحول تھا۔ ترک اور عرب قومیت پرستی کے ظہور

اور فاتح یورپیوں کے ہاتھوں کھینچی جانے والی سرحدوں نے مل کر پوری مسلم دنیا میں قومی ریاستوں کو جنم دیا۔ اس کے نتیجے میں مقامی آبادیوں پر یورپی قوم پرستی مسلط کی گئی جو ان کے لیے ایک اجنبی اور انجانا مظہر تھا۔ حضرت محمدؐ نے مدینے میں تمام مسلمانوں کے ایک ہونے کی تبلیغ کی تھی اور اس میں نسل اور زبان کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اس وحدت کو تقویت دینے کے لیے مکہ اور مدینہ کے مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا گیا تھا۔ صدیوں تک آپؐ کے ماننے والوں نے خود کو کچھ بھی اور ماننے سے پہلے مسلمان تسلیم کیا تھا۔ اب مسلم دنیا اور بالخصوص مشرقِ وسطیٰ نے اپنی شناخت قومیتوں میں ڈھونڈلی تھی۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں سیاست چھوڑ کر قرآنی حقائق کے جواہر سیاست میں استعمال کرنے اور یوں انھیں شیشے کے ٹکڑوں میں بدلنے کے جرم سے بچ گیا۔

بیسویں صدی کے ترک عالم سعید نورسی

قومی ریاستوں کے عہد میں داخل ہونے کے لیے انتہائی انقلاب پسندی ترک اکثریت کے ان عثمانی علاقوں نے دکھائی جو عثمانی سلطنت کا مرکزی علاقہ سمجھے جاتے تھے۔ جنگ کے بعد برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونان نے اناطولیہ پر قبضہ کر لیا۔ اب عثمانی سلطنت استنبول تک محدود تھی اور اس پر اتحادی قوتوں کا تسلط تھا۔ ایک عثمانی فوجی افسر نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران لڑنے والے اپنے ہم خیال ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور 1919ء سے 1922ء تک جاری رہنے والی مزاحمتی جنگ کے ذریعے قابض افواج کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیاب جنگِ آزادی کے بعد مصطفیٰ کمال نے عثمانی سلطنت ختم کرنے اور ترکی کے نام سے ایک نئی ریاست بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ عثمانیہ سلطنت ختم ہو گئی جس کی بنیاد عثمان نے 623 سال پہلے بازنطینی سلطنت کی سرحد کے ساتھ لگتے ایک علاقے میں رکھی تھی۔ کمال کو امید تھی کہ وہ کمزوری، شکست اور بدعنوانی سے داغدار عثمانی ماضی سے پاک ایک لادین ریاست کی بنیاد رکھے گا جس کی فکری نہج مغربی ہو گی۔

جنگِ آزادی کا رہنما اور ترکی کا بانی ہونے کے ناتے ترکوں نے اسے اتاترک یعنی بابائے ترک

کا نام دیا۔ اسے کسی بھی دوسرے تشخص سے زیادہ ترک ہونے کا تشخص عزیز تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مسلمان ہونے سے پہلے بھی ترک ایک طاقتور قوم تھے۔ دسویں صدی میں اسلام لانے اور ایرانیوں اور عربوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے ان میں بس کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جدید ترکی کو اسلام کے اس الجھاوے سے نجات پانا ہوگی۔ اس کے اولین اقدامات میں سے ایک خلافت کا خاتمہ تھا جو عثمانیوں کے پاس 1517ء سے چلی آرہی تھی۔ 1924ء میں آخری خلیفہ عبدالحمید ثانی کو جبراً جلاوطن کر کے یورپ بھیج دیا گیا۔ بعدازاں کمال نے حجاب اور ترکی ٹوپی کا استعمال ممنوع قرار دیا، صوفی حلقے بند کر دیے، شریعت اور اذان کو غیر قانونی قرار دیا۔ یوں اتاترک نے واضح کر دیا کہ آئندہ ترکی کا اسلامی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس نے زبان میں اصلاحات کرتے ہوئے اس کا عربی رسم الخط میں لکھنا ممنوع قرار دیا جس میں یہ صدیوں سے لکھی جارہی تھی۔ اس نے ترکی لکھنے کے لیے لاطینی رسم الخط لازمی قرار دیا۔ اس کے خیال میں لاطینی رسم الخط آسان بھی تھا اور یورپ سے واسطے کا ایک ذریعہ بھی۔ اس نے زبان سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور ان کی جگہ وسط ایشیا سے پرانی ترک زبان کے متروک لفظ لے آیا۔ انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہونے والی لسانی اصلاحات نے جدید ترکوں کو اسلامی تاریخ سے مکمل کاٹ دیا۔ اب ترک پرانی شاہی مساجد میں خطاطی نہیں پڑھ سکتے تھے اور عثمانی عہد میں چھپی ہوئی کتابیں ان کے لیے بے کار تھیں۔ ترکوں کے لیے عرب ممالک اور ایران کا سفر اور ان کے ساتھ کاروبار مشکل بنا دیے گئے۔ اتاترک نے ترکی کا رخ مغرب کی طرف کر دیا تھا۔ اسلام کی بنیاد پر تعلقات کی ہر گنجائش ختم کر دی گئی جبکہ عثمانی تعلقات میں اسلام کو بنیادی حیثیت دیتے تھے۔ دیگر نسلی گروہوں کے ساتھ بھی گرمجوشی ختم کر دی گئی۔ نئی ترک حکومت نے ترکی کی حدود میں بسنے والے یونانیوں، عربوں، کردوں اور آرمینیاؤں کو جبر کا نشانہ بنائے رکھا۔ یہ حکومت اپنی طاقت کی بنیاد صرف ترک تشخص پر رکھنا چاہتی تھی۔ غیر ترک شہریوں کو اپنے ترک ہمسایوں جیسے حقوق اور آزادی حاصل نہیں تھی۔ کئی دہائیوں تک ترکی پر ان لادین قوم پرست قوتوں کا قبضہ رہا۔ پوری بیسویں صدی میں اسلام کو عوامی زندگی میں واپس لائے جانے کی مخالفت ہوئی۔ اس طرح کی کوشش کرنے والی حکومتوں کے خلاف فوجی انقلاب بھی آیا۔

جنوب میں واقع عرب اکثریت کے حامل زرخیز ہلال کے علاقوں میں پہلی جنگِ عظیم کے فاتحین نے کئی نئی ریاستیں تشکیل دیں۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ان علاقوں کے حوالے سے موجود تین معاہدے تھے۔ ان معاہدوں میں زیادہ ہم آہنگی نہیں تھی۔ ان معاہدوں کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش میں خطے کو عملداریوں (mandates) میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ تقسیم زیادہ تر سائیکس پیکو معاہدے کے مطابق تھی۔ عثمانی سلطنت کے شام اور میسوپوٹیمیا میں سے آج کے شام، عراق، لبنان، اردن اور فلسطین نکالے گئے۔ سرحدی خطوط کھینچنے میں کسی استدلال کو دخل نہ تھا۔ فقط فاتحین کی مان مانی کافی سمجھی گئی۔ بالفور اعلامیے کے مطابق یہودیوں کو فلسطین کی عملداری میں بسایا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہاں پہلے سے موجود لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ شریف حسین اور اس کی اولاد کو نئی تخلیق شدہ ریاستوں شام، اردن اور عراق کا اختیار برطانیہ کی زیرِ نگرانی دیا گیا۔ بالآخر ان کے زیرِ اختیار صرف اردن رہ گیا۔ یورپی طاقتوں کے ہاتھوں عرب علاقوں کی من مانی تقسیم نے جن تنازعات کو جنم دیا وہ آج بھی موجود ہیں۔ عراقی سرحدیں اس طرح کھینچی گئیں کہ آبادی کا ایک ایک تہائی حصہ سنی عرب، سنی کرد اور شیعہ عربوں پر مشتمل تھا۔ کسی ایک گروپ کی غالب اکثریت نہ ہونے کے باعث پوری بیسویں صدی نسلی اور مذہبی تنازعات اور باہمی لڑائی سے عبارت رہی۔ یہی صورتحال لبنان کے ساتھ ہوئی جس کی تجارتی سرحدیں ہی موجود نہیں تھیں۔ اصل تصور فرانس کا تھا کہ عیسائی اکثریت کا ایک ملک بنایا جائے لیکن یہ تصور حقیقت نہ بن سکا۔ خطہ بحیرہ روم کی اس چھوٹی سی ریاست میں مذہبی تنازعے نے استحکام اور امن قائم نہ ہونے دیا حالانکہ بالعموم یہ عرب دنیا کا علمی اور ثقافتی مرکز بنا رہا ہے۔

فلسطین کا تجربہ سب سے تباہ کن ثابت ہوا۔ برطانیہ نے اپنی عملداری کے دور میں صیہونی یہودیوں کو یہاں بلا روک ٹوک آباد ہونے کی اجازت دیے رکھی۔ 1918ء میں فلسطین کی نئی کھینچی گئی سرحدوں کے اندر ساٹھ ہزار یہودی آباد ہو چکے تھے۔ یہ تعداد 1939ء تک چار لاکھ ساٹھ ہزار ہو چکی تھی اور زیادہ تر یورپ سے آئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ تعداد دن دوگنی رات چوگنی ہونے لگی۔ ان میں سے زیادہ تر نازی زیادتیوں کے باعث یورپ سے فرار ہونے والوں کی تھی جنھوں نے مستقبل کی اس صیہونی ریاست میں پناہ لینے کا سوچا تھا۔ ظاہر ہے کہ آبادی کی تقسیم کی یہ

تبدیلی مقامی عربوں کے لیے خوش کن نہیں تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں یہاں بہت سے فسادات ہوئے۔ عربوں کو نظر آنے لگا تھا کہ برطانوی اور یہودی دونوں علاقے کی عرب شناخت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یہودیوں کو اپنا طرز جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ لگ رہا تھا۔ وہ اس تنازعے کو اپنے اوپر ہونے والے یورپی جبر کے تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ جب برطانیہ نے اس ملک پر سے اپنی عملداری ختم کی تو یہودیوں کی آبادی اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ ایک نئی ریاست اسرائیل کے نام سے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عرب اقوام کا اتحاد بھی اسرائیل کو شکست نہ دے سکا بلکہ وہ کچھ اور رقبہ بھی اسرائیل کو دے بیٹھے۔ اسرائیل نے جنگ کا بہانہ بنا کر اپنی سرحدوں کے اندر موجود زیادہ تر عرب آبادی کو نکال دیا۔ 1948ء اور 1949ء میں یہودیوں نے سات لاکھ سے زیادہ مسلم اور عیسائی عربوں کو اپنے علاقوں سے دھکیل کر نکال دیا اور انھیں ہمسایہ اردن، مصر، شام اور لبنان میں پناہ لینا پڑی۔ اس طرح کی حکمت عملی سے اسرائیل اپنی آبادی میں یہودی تناسب غالب کرنا چاہتا تھا تاکہ اسرائیلی ریاست کا جواز پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے عرب اکثریت کو علاقے سے بے دخل کرنا ضروری تھا۔ عربوں کی یہ بے دخلی ایک بڑا حادثہ تھا اور اسے فلسطینی نکبہ (Nakba) کا نام دیتے ہیں۔ عربوں نے اس کے بعد خود اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔ انھیں نہ صرف یورپی نوآبادکاری کے دور سے گزرنا پڑا تھا بلکہ عین اپنے درمیان ایک غیر ملکی ریاست بھی برداشت کرنا پڑی۔ اسرائیلیوں اور عربوں کے تنازعے سے دنیا جان گئی کہ مسلمان بیسویں صدی میں سیاسی اعتبار سے پوری طرح ناکام رہے ہیں۔

برصغیر سے برطانوی راج نکلنے لگا تو یہاں بھی قومی ریاستیں بن گئیں۔ 1857ء کی بغاوت کے بعد ہندوستان پر برطانوی گرفت اور بھی سخت ہو گئی۔ اس کے بعد سے ہندوستان کی سامراج مخالف مزاحمت زیادہ تر سیاسی اور عدم تشدد پر مبنی رہی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں سے سیاسی اختیارات کا تقاضا کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس بنائی گئی۔ کانگریس پر ہندو غلبہ تھا جو مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ برصغیر میں سینکڑوں سال سے چلی آنے والی مسلم حکومت مسلمانوں کو موافق تھی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اپنے ہم مذہب سلاطین اور مغل

حکمرانوں سے تحفظ کی توقع کر سکتے تھے۔ لیکن ہندوستان پر مسلم اقتدار انیسویں صدی میں ختم ہو گیا اور یہاں آبادی کی تقسیم اور تناسب بھی ان کے حق میں نہیں تھا۔ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں کو برطانیہ کے بعد کے ہندوستان کو ایک متبادل انداز میں دیکھنا تھا۔

جو طرزِ فکر انھیں پسند آیا وہ برصغیر کی الگ الگ ہندو اور مسلم اکثریتی ریاستوں میں تقسیم کا تھا۔ ہندوستان کے ممتاز دانشوروں نے ایک تحریک چلائی جو تحریک پاکستان بن گئی۔ ان لوگوں میں سیاستدان محمد علی جناح، فلسفی شاعر محمد اقبال بھی شامل تھے۔ ان کا مقصد ایک خودمختار ریاست قائم کرنا تھا جس میں ہندوستان میں مستقبل کی ہندو حکومت کا خوف و ہراس نہ ہو۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے قراردادوں، اعلامیوں اور تقریروں کے ذریعے ایک الگ ملک کا خیال لوگوں کے سامنے رکھا اور بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں یہ مقبول سے مقبول تر ہوتا چلا گیا۔ ہندوستان کا علاقہ وادیٔ سندھ نئی مملکت بنا جہاں پہلے پہلے مسلم سیاسی کنٹرول آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما اور بالخصوص گاندھی آزاد مسلم ریاست کے حق میں نہیں تھے۔ گاندھی کا خیال تھا کہ اس طرح انڈیا کی مجموعی طاقت کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن ہندو غلبے کا مسلم خوف اتنا زیادہ تھا کہ 1947ء میں جب برطانیہ نے ہندوستان چھوڑا تو برصغیر کو تقسیم کر دیا گیا۔ پاکستان شمال مغربی علاقوں (پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان) اور مشرقی بنگال دو حصوں پر مشتمل تھا اور اسے ہندوستان کی عظیم مسلم بادشاہتوں کی جانشین ریاست کہا گیا تھا۔ باقی علاقے یعنی جمہوریہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان اور بھی چھوٹی اقلیت بن گئے۔ پاکستان دوسری جنگِ عظیم کے بعد آزادی حاصل کرنے والی واحد اسلامی ریاست نہیں تھی۔ ان چند ریاستوں میں سے ایک ہونے کے باعث منفرد تھی جنھوں نے اپنی بنیاد نسلی وراثت یا کسی شاہی خاندان سے وفاداری کی بجائے اسلامی شناخت پر رکھی تھی۔

اٹھارھویں صدی میں مسلم تہذیب کے زوال اور انیسویں صدی میں یورپ کی فتوحات کے بعد بیسویں صدی نے پوری دنیا میں مسلم قومی ریاستوں کی نام کی آزادی دیکھی۔ 1952ء مصری انقلاب نے برطانوی قبضہ ختم کر دیا جو 1882ء سے چلا آ رہا تھا اور ملکی انتظام فوج کے پاس چلا گیا۔ الجیریا انیسویں

صدی کے اوائل سے فرانسیسی قبضے میں چلا آرہا تھا۔ اس نے ایک تباہ کن اور ظالمانہ جنگ کے بعد آزادی حاصل کر لی۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں صحارا کے نیچے واقع ممالک نائیجریا، مالی، موریطانیہ، کینیا اور تنزانیہ نے آزادی حاصل کر لی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی اور ولندیزی سامراجیت کے خلاف آزادی کی تحریکیں چلائی گئیں۔ 1949ء میں ولندیزی سلطنت کے خلاف ایک طویل اور مشکل جنگ کے بعد انڈونیشیا بھی آزاد ہو گیا۔ یہاں سے شمال مغرب میں جزیرہ نما مالے اور جزیرہ بورنیو (Borneo) پر برطانیہ حکومت کر رہا تھا۔ دونوں کو ملا کر 1963ء میں ملائیشیا بنایا گیا۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کی زبان، تمدن اور مذہب ایک سے ہیں لیکن یہ برطانیہ اور ولندیزیوں کی قائم کردہ سرحدوں کی وجہ سے دو الگ ملک بن گئے۔ بیسویں صدی میں مسلم ممالک آزاد ہو گئے لیکن انھوں نے نوآبادکاروں کی کھینچی سرحدوں کو قائم رکھا۔

نام پاکستان ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں پنجاب، افغانیہ صوبہ، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کے حروف کو ملا کر بنایا گیا۔

اسلام اور سیکولرازم

یہاں یوں لگے گا جیسے مسلم دنیا ایک بار پھر خطرناک سیاسی طاقت پر غالب آگئی تھی۔ اسلامی تاریخ کی دَوری ماہیت کے تحت ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ بیرونی جارحیت اور کمزوری کے ایک دور کے بعد ایک نئی طاقتور سلطنت ابھرتی اور پرانی اسلامی ریاستوں کی سی شان وشوکت ایک بار پھر حاصل کر لیتی۔ جب اندلس میں عیسائی ریاستیں ابھری تھیں تو گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں مرابطیوں اور موحدین نے آئبیریا اور شمالی افریقہ کو اکٹھا کر دیا تھا۔ بارھویں صدی میں صلیبی حملوں کے بعد صلاح الدین ایوبی اور اس کے جانشین مملوکوں نے مصر، شام اور حجاز کو ملا کر ایک طاقتور حکومت بنائی تھی۔ تیرھویں صدی کے منگول حملوں کے بعد عثمانیوں اور ان کی تین براعظمی سلطنت کا دور شروع ہوا جس نے وسطی یورپ کے دروازوں پر بھی دستک دی تھی۔ اب بیسویں صدی میں لگتا تھا کہ یورپی سامراجیت

کا عروج بالآخر ختم ہو جائے گا اور دنیا پر حاوی ایک نئی مسلم سلطنت کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

ایک بنگالی مسلمان فضلر خاں نے شکا گو کا سیرز ٹاور ڈیزائن کیا تھا۔ 1973ء میں اس کا افتتاح ہوا تو یہ دنیا کی بلند ترین بلڈنگ تھی۔

اب کی بار وہ مذکورہ بالا روایتی مسلم سلطنت سامنے نہ آپائی۔ درجنوں مسلم ریاستیں دنیا کے نقشے پر بکھری ہوئی تھیں اور انھیں یورپی نوآبادکاروں کی کھینچی ہوئی غیر منطقی سرحدوں نے ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا۔ مسلم دنیا کے لیے یہی عدم اتفاق مہلک ثابت ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ میں مصر، اردن، شام اور لبنان مل کر اسرائیل کے خلاف کوئی موثر اقدام نہ اٹھا سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں جبر واستبداد سے بھاگ کر یہاں آباد ہونے والوں نے فوجی اعتبار سے ان سب کو شکست دی اور 1967ء اور 1973ء کی جنگوں میں خود کو مزید مضبوط کر لیا۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان ٹوٹا اور الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اس طرح وہ قوم خود بٹ گئی جس میں ہندوستان کی طاقت کی کاٹ کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ مغربی افریقہ میں بھی بہت سی کٹی پھٹی ریاستیں اقتصادی اعتبار سے کمزور تھیں اور آزادی کے عرصہ بعد تک فرانس پر انحصار کرتی رہیں۔ آزادی کے بعد، اسی عدمِ اتفاق کی وجہ سے، مسلم دنیا کی سیاسی قوت میں بالعموم کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باہم مقابل ریاستیں اندلس کے طائفہ دور کی یاد دلاتی تھیں اور عباسی سلطنت کا مرکز ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایک طاقتور مسلم دنیا میں نہیں پنپ پائی تھیں۔

اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ مسلم سیاست میں آنے والی ایک فیصلہ کن تبدیلی تھی۔ پوری اسلامی تاریخ میں نئی بننے والی ریاستوں نے اپنے حکومت کرنے کے حق کی بنیاد اسلام پر رکھی تھی۔ کچھ سلطنتوں کے اعمال وافعال کو بے شک خلاف اسلام کہا جا سکتا ہے لیکن وہ بھی ایک متحد کرنے اور رکھنے والی اہم قوت کے طور پر اسلام کو پیشِ نظر رکھتی تھیں۔ لیکن بیسویں صدی کی نوآزاد مسلم ریاستوں نے بالعموم شاندار اسلامی ماضی کو مڑ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے احیاء پر کام کیا۔ اس کی بجائے ان کا

اندازِ فکر تقریباً ہمیشہ قومیت پرستی اور لادینیت پر مبنی رہا۔ مسلم تاریخ کے پہلے 1200 سال کے دوران یہ دونوں تصورات مسلم دنیا کے لیے اجنبی رہے۔ لیکن یورپی سامراجیت نے یہ تصورات مسلم معاشرے کے طبقہ بالا کے ذہنوں میں اتار دیے۔ اسی طبقہ بالا نے آزادی کے بعد بننے والی حکومتوں کو چلایا۔ اسی لیے روشن خیالی اور اس سے پیدا ہونے والی مذہب سے دوری کا یورپی فارمولہ تقریباً ہر مسلم ملک میں کسی نہ کسی سطح پر اختیار کیا گیا۔ اس کی ایک انتہا پسندانہ مثال ترکی ہے جس نے سرکاری سطح پر شریعت کو منسوخ کیا، خلافت ختم کر دی اور خود کو کلیتاً لادینی ریاست قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ عرب دنیا نے مصر کی زیرِ قیادت طاقتور قومی ریاستوں کی تشکیل کے لیے سوشلزم اور قومیت پرستی جیسے ذرائع اختیار کیے۔ ایران صدیوں سے ایک شیعہ ریاست چلی آ رہی تھی۔ اس نے بھی 1979 تک لادینی نظام حکومت اور مغرب کے حلیف ہونے کا کردار اپنائے رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس کلیے سے استثنیٰ بھی موجود تھا۔ اس کی ایک انتہائی مثال سعودی عرب ہے۔ اس نے صدیوں پہلے کی قبائلی ریاستوں کی طرح مطلق بادشاہت کا طرزِ حکومت اختیار کیا اور اپنی حکومت کا جواز محمد بن عبدالوہاب کی سلفی اسلامی تعبیر سے لیا۔ تاہم مسلم دنیا نے بحیثیت مجموعی سیاسی اسلام کا تصور چھوڑ کر لادینی نظریے اختیار کیے جنھیں مغرب نے رواج دیا تھا۔

ابھی تک مسلم دنیا میں مرکزی ماضی اور لادینیت پر مبنی حال کو باہم منطبق کرنا باقی ہے۔ مختلف آراء کے دوسرے سرے پر وہ لوگ ہیں جن کی رائے میں وہ دن گزر چکے جب اسلام سیاسی زندگی میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ وہ حکومت، معاشرے اور سیاست میں روایت ترک کرنے اور نئے خیالات اپنانے کی حمایت کرتے ہیں، وہی نئے خیالات جن کی ابتداء یورپ میں ہوئی۔

امریکہ کو ضرورت ہے کہ اسلام کو سمجھے۔ اس لیے کہ یہی ایک مذہب معاشرے میں سے نسلیت کا مسئلہ ختم کر سکتا ہے۔

میلکم ایکس

آج معاشرے میں اسلام کے کردار پر مسلم دنیا میں بڑی تقسیم موجود ہے۔ ابھی حالیہ برسوں میں عرب بہار (Arab Spring) اور پھر مصر، تیونس اور شام کی بدامنی نے واضح کر دیا ہے کہ یہ دو مخالف نظریے باہم کس قدر غیر ہم آہنگ ہیں۔ ترکی ایک بار پھر لادینیت اور سیاسی اسلام کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اسلام مرکز حکومت کی کوشش ہے عشروں پر محیط ریاستی لادینیت کا رخ الٹ دے۔ یہ دورخا پن یورپی اسلامی دنیا میں موجود ہے۔ آنے والے عشروں اور صدیوں کی سمت کا تعین اس امر سے ہوگا کہ اس دورخے پن سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ ابھی تک تعین ہونا باقی ہے کہ آیا اسلام ایک بار پھر کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے یا قومیت پرستی اور لادینیت ہی نئے موثر نظریات رہیں گے یا پھر ان کے درمیان سب کے لیے قابلِ قبول متوازن فکری نہج دریافت کر لی جائے گی۔ یہ سوالات بڑے برمحل ہیں اور ان کا جواب دینے والا اسلامی دنیا میں ایک نئے عہد کا آغاز کرے گا۔ ایک ایسے عہد کا آغاز جو پہلے چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ سے منقطع اور غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔

اشاریہ

الف

ی

سیرت پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

”سیرت کو پیش کرنے میں لوگوں کے سامنے الگ الگ مقاصد رہے ہیں۔ بعض کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کے محض ذاتی کوائف جمع کیے گئے ہیں، بعض میں آپ ﷺ کو ہر پہلو سے ایک انسان کامل کی حیثیت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کچھ کتابوں میں ایک مصلح کے طور پر حضور اکرم ﷺ کی خدمات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ بعض کتابیں جنگوں میں اختیار کی گئی حضور اکرم ﷺ کی تدابیر کی روشنی میں آپ ﷺ کو ایک بہترین جنگی کمانڈر ثابت کرتی ہیں، بعض میں حضور اکرم ﷺ ایک داعی دکھائی دیتے ہیں، بعض میں آپ ﷺ کی جدوجہد کو ایک دینی تحریک کے طور پر دیکھا گیا ہے اور بعض مصنفین نے اپنی کتابوں کو عقیدت میں ڈوب کر اس طرح لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک فوق البشر ہستی نظر آتے ہیں۔ ان تصانیف میں اگر کسی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا ہے تو وہ آپ ﷺ کی اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی حیثیت ہے۔“

(علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ، تمہید، حیات رسول امی ﷺ)

علامہ خالد مسعود رحمۃ اللہ علیہ

تلمیذ: مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
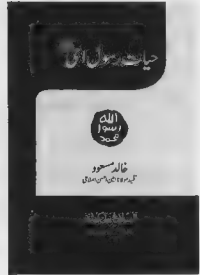
- اس کتاب میں روایات کے اخذ کرنے میں صحت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔
- ان روایات سے احتراز کیا گیا ہے جو قرآن مجید سے مطابقت نہیں رکھتیں۔
- اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت ہے کہ

یہ حضرت عائشہؓ کے قول ”کان خلقه القرآن“ کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

البلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

9971477664

صفحات : 600
قیمت : ₹500/-

BIBLIOGRAPHY

Ajram, K. (1992), *The Miracle of Islamic Science*, Cedar Rapids, IA: Knowledge House.

Al-Azami, Muhammad Mustafa (2003), *The History of the Quranic Text: From Revelation to Compilation*, Leicester: UK Islamic Academy.

Al-Hassani, Salim T. S. (2012), *1001 Inventions: The Enduring Legacy of Muslim Civilization*, Washington, D.C.: National Geographic Museum.

Armstrong, Karen (1996), *Jerusalem: One City, Three Faiths*, New York: Alfred A. Knopf.

——— (2000), *Islam: A Short History*, New York: Modern Library.

Carr, Matthew (2009), *Blood and Faith: The Purging of Muslim Spain*, New York, NY: New Press.

Diouf, Sylviane A. (1998), *Servants of Allah: African Muslims Enslaved in the Americas*, New York: New York University Press.

Dirks, Jerald (2006), *Muslims in American History: A Forgotten Legacy*, Beltsville, MD: Amana Publications.

Eaton, Richard (2000), 'Temple Desecration and Indo-Muslim States,' *Journal of Islamic Studies* 11(3), pp. 283–319.

El-Ashker, Ahmed Abdel-Fattah, and Rodney Wilson (2006), *Islamic Economics: A Short History*, Leiden: Brill.

Esposito, John L. (1999), *The Oxford History of Islam*, New York, NY: Oxford University Press.

Finkel, Caroline (2006), *Osman's Dream: The Story of the Ottoman Empire, 1300–1923*, New York, NY: Basic Books.

Freely, John (1998), *Istanbul: The Imperial City*, London: Penguin.

— — (2009), *The Grand Turk: Sultan Mehmet II Conqueror of Constantinople, Master of an Empire*, London: I B Tauris & Co Ltd.

Gross, Jo-Ann (1992), *Muslims in Central Asia: Expressions of Identity and Change*, Durham, NC: Duke University Press.

Hamdun, Said, and Noel King (1994), *Ibn Battuta in Black Africa*, Princeton, NJ: Marcus Wiener.

Hawting, G. R (2000), *The First Dynasty of Islam: The Umayyad Caliphate AD 661 750*. London: Routledge.

Hodgson, Marshall G. S. (1974), *The Venture of Islam: Conscience and History in a World Civilization*, Chicago, IL: University of Chicago Press.

Holt, P. M., Ann K. S. Lambton, and Bernard Lewis (1970), *The Cambridge History of Islam*, Cambridge: Cambridge University Press.

Hourani, Albert (1991), *A History of the Arab Peoples*, Cambridge, MA: Belknap of Harvard University Press.

Inalcik, Halil (1973), *The Ottoman Empire: The Classical Age 1300-1600*, London Phoenix Press.

Itzkowitz, Norman (1980), *Ottoman Empire and Islamic Tradition*. Chicago, IL: University of Chicago, Press.

Kennedy, Hugh (1986), *The Prophet and the Age of the Caliphates: The Islamic Near East from the Sixth to the Eleventh Century*, London: Longman.

——— (1996), *Muslim Spain and Portugal: A Political History of Al-Andalus*, Harlow. Pearson Education Limited.

——— (2005), *When Baghdad Ruled the Muslim World: The Rise and Fall of Islam's Greatest Dynasty*, Cambridge, MA: Da Capo Press.

——— (2008), *The Great Arab Conquests: How the Spread of Islam Changed the World We Live In*, Cambridge, MA: Da Capo Press.

Khaldûn, Ibn (1969), *The Muqaddimah, an Introduction to History*, Translated from the Arabic by Franz Rosenthal, and N. J. Dawood (ed.), Princeton, NJ: Princeton University Press.

Levtzion, Nehemia, and Randall L. Pouwels (2000), *The History of Islam in Africa* Athens, OH: Ohio University Press.

Lewis, Bernard (1984), *The Jews of Islam*, Princeton, NJ: Princeton University Press.

Lewis, David L. (2008), *God's Crucible: Islam and the Making of Europe, 570 to 1215* New York, NY: W.W. Norton.

Lindsay, James E. (2005), *Daily Life in the Medieval Islamic World*, Westport, CN: Greenwood.

Lings, Martin (1983), *Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources*, New York, NY: Inner Traditions International.

Maalouf, Amin (1985), *The Crusades through Arab Eyes*, New York, NY: Schocken.

Masood, Ehsan. *Science and Islam: A History*. London: Icon, 2009.

Māwardī, Abu'l-Hasan (1996), *Al-Ahkam As-Sultaniyyah: The Laws of Islamic Governance*, Translated from the Arabic by Asadullah Yate, London: Ta-Ha.

McNeill, William Hardy, and Marilyn Robinson Waldman (1983), *The Islamic World*, Chicago, IL: University of Chicago Press.

Montefiore, Simon Sebag (2011), *Jerusalem: The Biography*, New York, NY: Random House Inc.

Morgan, Michael Hamilton (2007), *Lost History: The Enduring Legacy of Muslim Scientists, Thinkers, and Artists*, Washington, D.C.: National Geographic.

Ochsenwald, William, and Sydney Fisher (2003), *The Middle East: A History*, 6th edition, New York, NY: McGraw-Hill.

Peters, F. E. (1994), *A Reader on Classical Islam*, Princeton, NJ: Princeton University Press.

Ramadan, Tariq (2007), *In the Footsteps of the Prophet: Lessons from the Life of Muhammad*, New York, NY: Oxford University Press.

Saunders, John Joseph (1965), *A History of Medieval Islam*, London: Routledge.

Schroeder, Eric (2002), *Muhammad's People: An Anthology of Muslim Civilization*, Mineola, NY: Dover Publications.

Siddiqi, Muhammad Zubair (1993), *Hadīth Literature: Its Origin, Development and Special Features*, Cambridge: Islamic Texts Society.

مسلم اسپین اسلامی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جس پر مسلمانوں کا فخر بجا ہے۔ اسپین میں مسلمانوں نے علم وحکمت کے فروغ کے لئے جس طرح کام کیا اور ثقافت وتمدن کو عروج تک پہنچانے کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ آج بھی واضح اور نمایاں ہیں۔

اسپین میں مسلمانوں کی یہ علمی اور عملی کاوشیں ایسی ثمر مند ہوئیں کہ نہ صرف اسپین بلکہ تمام یوروپ کے در و بام روشن ہو گئے۔ اس لیے بہت سے مفکرین اور مورخین نے یوروپی نشاۃ ثانیہ کا اصل مرکز اسپین کو قرار دیا۔

ڈاکٹر محمد فاروق کی اس کتاب کی خاصیت کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اس میں بنیادی ماخذ کے ساتھ ثانوی اور جدید مورخین کی تحریروں سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ عربی زبان کے فاضل ہیں، فارسی جانتے ہیں اور انگریزی و اسپینی ماخذ تک رسائی رکھتے ہیں۔

مسلم اسپین

تہذیبی وثقافتی تاریخ

ڈاکٹر محمد عمر فاروق

البلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
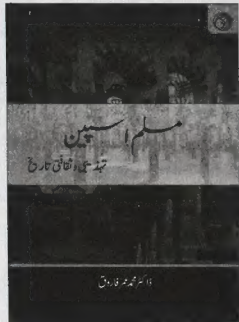
9971477664

صفحات : 360
قیمت : ₹350/-

طاقتور ترین مذہبی، معاشرتی اور سیاسی قوتوں کی تاریخ پر ایک تابناک اور توانا تحریر

پچھلے چودہ سو سال میں جنوبی فرانس سے مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا تک پھیلے علاقے میں مسلم ریاستوں اور سلطنتوں کا ایک تسلسل موجود رہا۔ اس کے باوجود مسلم سیاستدان اور عسکری ماہرین تو ایک طرف ان کے مفکروں، سائنسدانوں اور الہٰیات کے ماہروں کا کام بھی نظرانداز کیا گیا ہے۔ یہ بیسٹ سیلنگ کتاب "گمشدہ اسلامی تاریخ" کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے جس میں گمنامی میں پڑے فراموش شدہ ماضی کو کھنگال کر حضرت محمدؐ سے جدید قومی ریاست تک کے زمانے کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ فراس الخطیب نے عباسیوں اور عثمانیوں سے مغلوں اور مغربی افریقہ تک کی عہدساز شخصیات، ایجادات اور تاریخی ادوار کی نقشہ کشی کی ہے تاکہ عالمی معاشرے اور تمدن پر اسلام کے اثرات کو اجاگر کیا جا سکے۔

• • •

فراس الخطیب نے شکاگو یونیورسٹی سے مڈل ایسٹ سٹڈیز میں ماسٹر ڈگری لی۔ اسلامی علمی تاریخ ان کا خصوصی موضوع تھا۔ وہ برج ویو، الی نائے، کے یونیورسٹی سکول میں پڑھاتے رہے۔ آج کل وہ شکاگو کے دارالقاسم میں پڑھاتے اور پڑھتے ہیں۔ انھوں نے lostislamichistory.com قائم کی اور اس میں لکھتے ہیں۔

Al-Balāgh Publications
N-1, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar
New Delhi-110025, Mob.: +91 9971477664
E-mail: abpublications@gmail.com

₹ 250.00